اِنتخابِ اُردو ادب

(وادیٔ کشمیر)

۱۹۴۷ء ——— ۱۹۷۱ء

ترتیب و تہذیب

نورشاہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر

طابع و ناشر:-
ڈپٹی سکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز
شہید گنج - سری نگر

مطبع:-
ڈی لائیٹ پرنٹنگ پریس دہلی

خوش نویس:-
غلام نبی مہاجن - سرینگر

بارِ اول:-
پانچ سو (۵۰۰)

قیمت:-

عرضِ ناشر

کشمیر میں اُردو کے چلن پر یہی سو سوا سو برس کا عرصہ گزرا ہو گا۔ اس مدت میں بھی اُردو کشمیریوں کی روزمرہ زبان کبھی نہیں بنی، اور اسی لئے اُن کے ذہن وضمیر کے اندرونی سرچشموں تک اس زبان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہمیں یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ ابھی کشمیر سے اُردو ادب کی کوئی قدرِ اول کی تخلیق پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ کشمیریوں کے نطق ولب میں اعلیٰ ادب پیدا کرنے کی کس قدر صلاحیتیں ہیں اُس کا اندازہ سنسکرت زبان میں کشمیریوں کے تخلیقی اور تنقیدی اثاثے پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے یہی بات کشمیر میں فارسی ادب کے سلسلے میں بھی لیکن کسی قدر کم وثوق کے ساتھ دہرائی جا سکتی ہے۔ اگر کشمیر کے اُردو لکھنے والے اپنے اجداد کے ادبی قد وقامت کو نہیں پہونچ سکے ہیں تو اس میں اُن کی تخلیقی صلاحیتوں سے زیادہ کشمیر میں اُردو اور اُردو تدریس کے مخصوص مسائل کو ذمہ دار ٹھہرایا جانا چاہئے۔ زیرِ نظر انتخاب ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۱ء تک کشمیر میں تخلیق کئے گئے اُردو ادب کا ایک جائزہ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ مشمولات کا انتخاب ترتیب نگار کی ذاتی پسند کا آئینہ دار ہے اور ترتیب نگار کے معیارِ انتخاب سے اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے۔ لیکن اس انتخاب میں بھی ان پچیس سال کے اُردو ادب کے موٹے موٹے خدوخال بہر حال دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم یہ انتخاب اس اُمید کے ساتھ شائع کر رہے ہیں کہ یہ کشمیر میں اُردو ادب کے آئندہ امکانات کو اُبھارنے اور اس مرتبے کی تخلیقات پیدا کرنے کا محرک بنے گا جو ہر معیار سے اُردو کے ادبِ عالیہ کا حصہ تسلیم کی جا سکیں گی۔

شہید گنج۔ سری نگر
۲۶۔ فروری ۔ ۱۹۷۳ء

محمد یوسف ٹینگ
ڈپٹی سکریٹری

پیشِ گفتار

سال ۱۹۴۷ء ہماری سیاسی، معاشی، سماجی اور تمدنی زندگی کے لئے ایک عہد ساز سال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس سال ملک آزاد ہوا تو زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دینے اور آزادی کے تقاضوں کے ساتھ ہم کنار کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر تحریک چل پڑی۔ تمدنی سطح پر بھی سارے مُلک میں ایک طرح کے احیائے نَو کی سی فضا قائم ہونے لگی۔ بڑی بڑی علاقائی زبانوں کو غفلت، بے توجہی اور بے اعتباری کے ماحول سے نکال دیا گیا۔ آئینِ ہند کے زبانوں کے گوشوارے میں اِن زبانوں کو نہ صرف علاقائی زبان کا آئینی اور قانونی درجہ دیا گیا بلکہ اِن کے لئے علاقے بھی متعین کئے گئے۔ علاقائی زبانوں کو مُلک کے آئین نے تسلیم کیا اور اِس طرح اِن کی نشو نما اور ترقی و ترویج کی راہیں ہموار کیں۔ اردو کو اگرچہ علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا لیکن اس کے لئے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر کوئی علاقہ متعین نہیں کیا جا سکا۔ اُردو مُلک کے جن علاقوں میں اُبھری اور پروان چڑھی۔ وہاں اس زبان کی ترقی و ترویج کی راہیں بہت حد تک مسدود ہو گئیں۔ ہماری ریاست کو بہر حال یہ امتیاز اور فخر حاصل ہے۔ کہ اِس کے اپنے آئین کی رُو سے اُردو یہاں کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے اور اِس طرح ایک دُور اُفتادہ علاقے میں اُسے پناہ مل گئی۔ یہاں اِس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ہماری ریاست میں اُردو کو یہ امتیاز کسی طرف داری یا احسان کے ناطے نہیں بلکہ بعض تاریخی وجوہات کی بنا پر حاصل ہوا۔ ریاست میں پٹھانوں کے عہدِ حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی فارسی زبان کی اہمیت ایک طرح سے ختم ہو گئی۔ سکھوں کے اقتدار میں آنے کے ساتھ ہی اُردو کا رواج چل پڑا۔ ریاست کی عدالتوں، محکمۂ مال اور اسی طرح کے دوسرے شعبوں میں اُردو نے کاروباری

زبان کا روپ دھار لیا۔ ڈوگرہ شاہی کے دور میں اردو ریاست کی واحد تدریسی زبان بن گئی۔ اس زبان کو ڈوگرہ شاہی میں اسکولوں کی سطح تک ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل رہی۔

سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ اردو کو عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل رہی۔ یہ وہ واحد ادبی زبان تھی جس میں عام اپڑھے لکھے لوگ نہ صرف اپنا مافی الضمیر پیش کرتے تھے بلکہ یہی زبان اور اسی زبان کا ادب بھی اُن کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ مباحثے، ڈرامے اور دوسری ادبی سرگرمیاں اسی زبان میں عام تھیں۔ آزادی سے پہلے جتنی بھی ادبی اور ثقافتی انجمنیں اور ادارے وادی میں سرگرم عمل تھے اُن کی سرگرمیوں کا مرکز بھی اُردو ہی تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق، انجمن ترقی پسند مصنّفین اور دوسری ادبی انجمنوں میں صرف اردو کا ہی دور دورہ تھا۔ وادی کے دیہات میں رہنے والے کشمیری شاعروں کو چھوڑ کر پڑھے لکھے طبقے میں اردو میں ہی شعروادب کی تخلیق ہوتی تھی۔ آزادی سے پہلے کے زمانے میں وادی میں جن شاعروں اور ادیبوں کے نام برِّ صغیر کے اُردو داں طبقوں میں پہچانے جاتے تھے وہ بھی اردو میں ہی لکھا کرتے تھے۔ رامانند ساگر، پروفیسر نند لال طالب، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کنول نین پرواز، شہ زور کاشمیری، غ۔ م طاؤس، غلام رسول نازکی۔ عبدالحق برق، قیصر قلندر اور دوسرے کئی شاعر و ادیب آزادی سے پہلے بھی کم از کم پنجاب اور دلی کے اردو داں طبقوں میں مقبول ہو چکے تھے۔ یہ سبھی ادیب اور شاعر حلقۂ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مُصنّفین کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔

وادی میں انجمن ترقی پسند مُصنّفین کی بنیاد ۱۹۴۶ء میں رکھی گئی۔ اس میں اُردو میں لکھنے والے کم و بیش سبھی ادیب اور شاعر شامل ہوئے۔ اس انجمن کی کارکردگیوں میں ایک اہم سرگرمی اس کی ہفتہ وار مجلسوں کا انعقاد تھا۔ جو ہر جمعہ کو ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں چھوٹے بڑے سبھی ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے جن پر جوش وخروش اور دیانت داری سے بحث ہوا کرتی تھی۔ ایسی سنجیدہ اور پُرخلوص محفلیں علی محمد لون، حبیب کامران، سوم ناتھ زتشی، شوریدہ کاشمیری، صلاح الدین احمد، حامدی کاشمیری، دیپک کول، اختر محی الدین، مہندر رینہ، امیش کول، نور محمد روشن، امین کامل، پران کشور اور دوسرے فن کاروں کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئیں

انجمن ترقی پسند مصنفین سری نگر کی اکثر محفلوں میں پروفیسر محمود ہاشمی، بلراج ساہنی، رامانند ساگر پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در شریک ہوا کرتے تھے۔ نو آموز اور نوجوان لکھنے والوں کے تئیں ان کا رویہ بہت ہی ہمدردانہ اور رہبرانہ ہوا کرتا تھا۔ وادی میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو ترقی و ترویج کی منزلوں سے ہم کنار کرانے میں ان لوگوں کو پیش رووں کی حیثیت حاصل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وادی میں ایک متحرک اور جاندار ادبی تحریک کو جنم دینے میں ان ادیبوں، شاعروں، ناقدوں نے ایک تاریخی رول ادا کیا ہے تو ہرگز ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ یہ اُن ہی لوگوں اور اُن کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی اَن تھک محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ آزادی سے پہلے اور اُس کے بعد وادی میں اردو کو ایک مسلّمہ ادبی اور فنی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔

آزادی کے بعد بھی اُردو کو یہ افتخار اور احترام حاصل رہا لیکن علاقائی زبانوں کو فوقیت ملنے کی وجہ سے اس کے لکھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی گئی۔ کشمیری زبان ریاست کی علاقائی زبان قرار دی گئی اور اس طرح اکثر لکھنے والوں نے اس کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ یہ ایک قدرتی امر تھا لیکن اس سے ایک فائدہ ہوا کہ جن شاعروں اور ادیبوں نے بڑی سنجیدگی، خلوص اور ایمانداری کے ساتھ شروع میں ہی اس زبان کو اپنایا تھا وہ برابر اسی میں لکھتے رہے، اور آج بھی اُن کی تخلیقات اسی زبان میں شائع ہوتی ہیں۔ ان ہی ادیبوں اور شاعروں کی نیک نیتی، خلوص سنجیدگی اور کوششوں کی وجہ سے اُردو اس وقت بھی وادی میں اُسی اعتبار اور احترام کی حامل ہے جو اُسے آزادی سے پہلے حاصل تھا۔

کچھ لوگ آج بھی ترقی پسند اُدب کو (VULGARITY) سے تعبیر کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس اُدب کو ہنگامی، فروعی اور مصنوعی کہہ کر لتاڑا جاتا ہے لیکن وادیٔ کشمیر میں ترقی پسند ادیبوں کے اُس رول کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو انہوں نے یہاں ایک ادبی تحریک کو جنم دینے اور اُردو کو ترقی دینے کے سلسلے میں ادا کیا ہے۔ یہ ان ہی ادیبوں اور شاعروں کا صدقہ ہے کہ آج ملک کے دوسرے حصّوں کے مقابلے میں ہماری ریاست میں اُردو اپنے آپ کو محفوظ پا رہی ہے۔ ہمارے آج کے ادیب اور شاعر جو اس وقت ملک بھر میں شہرت کے

مالک میں اسی ادبی تحریک سے جنم پا چکے ہیں۔ آج جب کہ ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹ چکا ہے لیکن کشمیر میں اس کے نام لیوا اب بھی موجود ہیں اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اردو ادب اور زبان کی اشاعت و تشہیر کا کام کر رہے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس ادبی کاروان میں بہت سے نئے لکھنے والے شامل ہوئے ہیں۔ اور اس وقت بھی اردو کے تئیں ان کی وفاداری اور خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے اواخر اور سنہ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں کشمیر وادی میں ایک تمدنی محاذ یعنی کلچرل فرنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس محاذ میں سب سے پہلے جن لوگوں نے شمولیت کی وہ یہی ترقی پسند ادیب اور شاعر تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب نیم بر صغیر تقسیم ہو چکا تھا۔ دو نئی مملکتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ مہاجرین کا مسئلہ نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا اور ادھر اپنے کشمیر پر حملہ ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک عجیب طرح کی افراتفری، طوائف الملوکی اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔ اس پس منظر میں تمدنی محاذ یعنی کلچرل فرنٹ کا وجود میں آنا اور ترقی پسند مصنفین کا اس میں رضاکارانہ طور پر شامل ہونا ریاست کی ادبی تحریک میں ایک سنہری باب کا درجہ رکھتا ہے اس محاذ کے جھنڈے تلے ان ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نگاروں، مصوروں اور دوسرے فن کاروں نے جو شاندار کام کیا اُس کو کشمیر کی تاریخ کبھی نہیں بھول سکتی۔ وادی میں پہلی بار فنون لطیفہ سے متعلق سبھی کارکن ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان سب فن کاروں، ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور دوسرے ثقافتی کارکنوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا سہرا اُن ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ مرحوم غلام محمد صادق کے سر بھی ہے جو ایک سیاست دان ہونے کے علاوہ ادب شناس اور ادب نواز بھی تھے۔ اُس زمانے میں جو اردو ڈرامے بہت مقبول ہوئے اُن میں پروفیسر محمود ہاشمی کا "کشمیر یہ ہے" اور مرحوم پریم ناتھ پردیسی کا "سوالی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محاذ کی ان ہی سرگرمیوں کے دوران کشمیری زبان کے ادیب اور شاعر بھی سامنے آ گئے جنہوں نے بعد میں شہرت حاصل کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اکثر ادیب، فن کار، ڈرامہ نگار اور شاعر اسی تحریک کی پیداوار ہیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ دینا ناتھ نادم، امین کامل، نور محمد روشن، علی محمد لون، پران کشور، اختر محی الدین، پُشکر بھان، رحمان راہی، غلام نبی فراق، سوم ناتھ زتشی اور غلام رسول سنتوش

وغیرہ کے نام سرِ فہرست لکھے جا سکتے ہیں۔ کشمیری زبان و ادب اور اس کے تمدنی افق کے یہ تابدار ستارے اگرچہ اس وقت کشمیری زبان میں ہی لکھتے ہیں لیکن بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ سبھی اُردو کی زرخیز اور مردم خیز کوکھ سے ہی پیدا ہوئے ہیں اور یہ ادیب و شاعر اور فن کار بڑی جرأت اور صفائی کے ساتھ اُردو کے اس احسان کا بغیر کسی رکاوٹ اور مصلحت کے اظہار بھی کرتے ہیں۔

کلچرل فرنٹ کا شیرازہ کچھ ہی برسوں میں بکھر گیا اور اُس کے بعد کلچرل کانفرنس وجود میں آئی لیکن اب اس کی کم و بیش سبھی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کی علاقائی زبان کشمیری ہی بن گئی۔ اُدھر ریڈیو کشمیر کے قیام سے اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک زیادہ مؤثر اور مقبولِ عام پلیٹ فارم مل گیا۔ ریڈیو کی بیشتر نشریات اُردو میں ہی ہوتی رہیں۔ اُردو میں خاص نشریات کے علاوہ اُردو ڈرامے کا رواج چل پڑا۔ پریم ناتھ پردیسی، ارجن دیو مجبور، دیو رشک اور علی محمد لون کے ریڈیو ڈرامے بہت ہی مقبول ہوئے۔ ریڈیو کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی ہوتی اور بہت سے نئے لکھنے والے وجود میں آ گئے۔

کشمیری زبان و ادب کو فروغ ملنے کے ساتھ ہی اُردو کے لکھنے والوں نے نئی تنظیمیں اور نئی انجمنیں بنا تو لیں لیکن اُنہوں نے مجموعی طور پر کوئی قابلِ قدر کام نہیں کیا۔ انجمن ترقی پسند اردو کی سری نگر کی شاخ محض اس کے انتخابی عمل تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بزمِ اُردو کی سرگرمیاں بھی صرف ایک آدھ بار ملنے تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ اور اس قسم کی دوسری چھوٹی چھوٹی انجمنیں بھی کوئی خاص کارکردگی نہ کر سکیں۔ ایسے میں ریاست میں تمدن، زبان اور فنون سے متعلق اکادمی کا وجود میں آنا نہایت اہم قدم تھا۔ اکادمی نے بڑی فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ دوسری زبانوں کے علاوہ اُردو کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ اُردو کی بہترین کتابوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ اُردو میں "شیرازہ" نام کا رسالہ جاری کیا۔ اس کے علاوہ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو اُن کی تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں امداد دی گئی، اُردو کتابوں کی اشاعت اور طباعت کا کام اگر اس وقت بڑی آسانی سے ہوتا ہے تو اس کا سہرا اکادمی کے سر ہی جاتا ہے۔

پچھلی ایک چوتھائی صدی میں وادیٔ کشمیر میں اردو زبان و ادب کا یہ جائزہ بہت حد تک مکمل نہیں ہوگا جب تک ۱۹۵۳ء اور اس کے فوراً بعد ابھرنے والے اردو ادیبوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس دور میں شمیم احمد شمیم، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، اکبر لداخی، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، مخمور بدخشی، حکیم منظور، سلطان الحق شہیدی، ڈاکٹر اکبر حیدری اور دوسرے فن کاروں نے اردو کی آبرو بنائے رکھی اور اپنی لگن، محنت اور خلوص سے چند ہی برسوں میں یہاں کی اردو ادب کی تاریخ میں اپنے نئے اندازِ بیاں، نئی فکروں، نئے موضوعات اور نئے ولولوں کے ساتھ سامنے آگئے۔ اور اس طرح انہوں نے یہاں کے اردو ادب کو ملک کے دوسرے حصّوں کے ہم عصر اردو ادب کے قریب لا کھڑا کر دیا۔

یہ ادبی فضا سال ۱۹۶۰ء تک ایسے ہی قائم رہی۔ اس کے بعد ملک گیر پیمانے پر ادب میں نئے موضوعات اور نئی تحریکوں نے ابھرنا شروع کیا۔ ملک بھر کے ادیب، ادب میں نئی سمتوں اور نئے راستوں کی تلاش ذہی میں لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کا اردو ادیب اور شاعر ان نئی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وادی میں بھی جدیدیت اور نئی سمتوں کے بارے میں سرگوشیں شروع ہوگئیں۔ اکثر پرانے ادیبوں نے بھی اپنی وضع قطع بدلنا شروع کی۔ کھوکھلے نعروں، نری جذباتیت اور حقیقت پسندانہ سطحیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ زندگی کے نئے افق نظر کے سامنے آ چکے تھے۔ نئی راہوں کا تصور ذہنوں میں پنپنے لگا تھا۔ بہت ہی پرانی ادبی اور ثقافتی قدروں کی صحت پر شک کیا جانے لگا تھا۔ اردو کے لکھنے والے ان سبھی چیزوں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے اپنی منتشر صفوں کو نئے سرے سے سمیٹنا سنوارنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وادی کے اردو لکھنے والوں پر ان نئے تقاضوں کا براہِ راست اثر ہوا اور ان کی تخلیقات بھی ان نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگیں۔ اس دوران کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام سامنے آنے لگے ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر فاروق نازکی، فرحت گیلانی، صادق علی امیر، ہردے کول بھارتی اور راقم الحروف ہیں۔ ان لوگوں نے بہت ہی مختصر عرصے میں یہاں کی ادبی اور تمدنی زندگی پر اپنے تاثرات مرتب کئے۔ ان کی کہانیوں، شاعری اور ڈراموں

میں نئے موضوعات اور نئی تکنیکیں اُبھرنے لگیں۔ فاروق اور فرحت نے اُردو کی جدید شاعری کا دامن تھام لیا اور اس میں اپنے منفرد اور پیارے انداز میں گلکاریاں کیں۔ ہردے کول بھارتی نے نئے افسانے لکھ کر یہاں کے اُردو افسانے کو ہندی کی جدید کہانی سے قریب تر کر دیا ہے۔ نُور شاہ نے اپنے منفرد طرزِ تحریر، نئی تراکیب، نئے اشاروں سے اپنی کہانیوں کو سنوارا۔ حکیم منظور اگرچہ پہلے بھی کاروانِ ادب میں شامل ہو گئے تھے لیکن اِس دور میں اُن کی شاعری بلوغیت حاصل کر سکی۔

جدید تر شعراء اور ادبا میں قاضی غلام محمدؒ، ریاض پنجابی، بشیر شاہ، کلدیپ رعنا، حکیم منظور، شجاع سُلطان، شبنم قیوم اور محمد یاسین کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ریاض پنجابی ہندی کی نئی کہانی سے بہت متاثر ہیں اور یہ اثر اُن کی اُردو کہانیوں پر بھی غالب ہے۔ کلدیپ رعنا کی اکثر کہانیوں میں پریم چند کا پرتو جا بجا موجود ہے۔ البتہ اب اُنہوں نے اپنی روش بدل دی ہے بشیر شاہ کی کہانیوں میں قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ شجاع سُلطان ایک مصوّر ہیں لیکن جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتے ہیں تو اس میں وہ سبھی محرکات پیش ہوتے ہیں جو تجریدی فنِ مصوری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ محمد یاسین بھی خوب لکھتے ہیں اور رومانوی طرزِ بیان اُن کا خاصہ ہے۔ شبنم قیوم بڑے زود نویس ہیں۔ کئی ناول، افسانے اور ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ اُردو زبان پر پُورا عبور نہ ہونے کے باوجود اس نوجوان کہانی کار کے افسانے نہ صرف مُلک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں بلکہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی اُن کے ڈرامے ایک اچھی خاصی تعداد میں نشر ہوتے ہیں۔

اِدھر کچھ برسوں سے کئی نئے اور نوجوان لکھنے والے اُردو افسانے، ناول نگاری اور شاعری کی طرف آ گئے ہیں۔ اِن میں حسن ساہو، وحشی سید ساحل، عُمر مجید، شمس الدین شمیم، نسالد حسین، نگہت نسرین، بشارت احمد، ہر بھجن سنگھ ساگر، تسلیم کاشمیری، اشرف ساحل اور کئی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ غرض اُردو ادب کا کارواں کئی راہ گیروں کو اپنی طرف کھینچے چلے جا رہا ہے۔ افسانے، ناول نگاری اور شاعری کے شعبوں میں قابلِ قدر کام ہو رہا ہے لیکن تنقید کا شعبہ ابھی بھی کسی جیالے کی تلاش میں دربدر پھر رہا ہے۔ وادیٔ کشمیر کے

باہر اُردو کے ناقدین نے یہاں کی سرگرمیوں کو ہمیشہ ہی نظر انداز کیا ہے اور آج بھی اُن کا رویہ نہایت ہی ہمت شکن اور مایوس کُن ہے۔ اسے اُردو زبان کی بدنصیبی ہی سمجھئے کہ جو زبان یہاں سرکاری سرپرستی میں پنپ رہی ہے اُس کے اپنے ناقدین اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اُن کی نظریں صرف دہلی، اُتر پردیش اور بہار میں ہی مرکوز ہیں جہاں یہ زبان دھیرے دھیرے دم توڑ رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیری کبھی اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے لیکن انہیں اپنی زبان دانی پر پُورا بھروسہ ہے اور وہ اُردو کے لئے بڑی محبّت اور خلوص رکھتے ہیں۔ اُردو کے ناقدین کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے اور یہاں کے اُردو لکھنے والوں کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہئے۔ ہمارے یہاں ناقدین کا فقدان ہے لیکن مُحمّد یُوسُف ٹینگ شاید اکیلے ناقد ہیں جن میں ایک محقق بننے کی پُوری صلاحیت موجود ہے۔ اُن کی ادارت میں "شیرازہ" بڑی خوبصورتی اور ستھرے پن کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور یہ اُن ہی کی ناقدانہ صلاحیتوں اور محققانہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ "شیرازہ" اُردو رسائل اور جرائد میں ایک منفرد اور مسلّمہ مقام بنا چکا ہے۔ حامدی کاشمیری افسانہ نگار اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ناقد بھی ہیں۔ غالبؔ پر اُن کی حالیہ کتاب "غالبؔ کے تخلیقی سرچشمے" ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

کشمیر وادی میں اُردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں اخبارات نے جو رول انجام دیا ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ یہ بات بھی اُردو کی بقا اور وقار کے لئے ایک فال نیک کی حیثیت رکھتی ہے کہ وادیٔ کشمیر میں شائع ہونے والے سبھی اخبار صرف اُردو زبان میں ہی چھپتے ہیں۔ وادی میں اُردو صحافت کے میدان میں سب سے زیادہ اور اہم رول اخبار "آئینہ" کا ہے جس نے اپنے مختصر دور میں اپنا ایک مُنفرد اور ممتاز مقام بنا لیا ہے۔ "آئینہ" صحافت، ادب اور طنز و مزاح کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ "آئینہ" کے مدیر شمیم احمد شمیم نے اپنے زورِ قلم سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ایک اچّھا صحافی ایک اچّھا ادیب بھی ہو سکتا ہے۔ "آئینہ" کے خاص نمبر تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہفتہ وار "اقبال" کے مدیر غلام نبی خیالؔ کشمیری زبان کے ایک نامور شاعر ہیں۔ اُن کا اخبار بھی ادب اور صحافت کا ایک شاندار مرقّع ہے۔ اخبار "خدمت" کے ایڈیٹر نند لال واتل بڑے پُرانے صحافی ہیں۔ اخبار چونکہ پارٹی پیپر ہے اس لئے انہیں اپنی علاقائی

کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اِن کے علاوہ دوسرے روزنامے بھی اُردو کی خدمت کر رہے ہیں، ان میں اکثر نو آموز ادیبوں اور شاعروں کے افسانے، نظمیں، غزلیں اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اِن میں خاص طور پر روزنامہ "آفتاب"، "سری نگر ٹائمز" اور "چنار" کے نام قابل ذِکر ہیں۔

وادی میں اِس وقت دو اُردو میگزین "نگینہ" اور "شیرازہ" شائع ہوتے ہیں۔ "نگینہ" نے اپنی روش بدل دی ہے، اور وہ ادب سے فلم پر آگیا ہے، اِس میں جو کچھ بھی چھپتا ہے اور جس انداز سے چھپتا ہے وہ پچھلے کئی سالوں میں بھی قارئین کی توجہ کھینچنے میں ناکام ہوا ہے۔ جیسا کہ اُوپر ذکر آچکا ہے ریاستی کلچرل اکادمی سے شائع ہونے والا دوماہی "شیرازہ" ادبی دُنیا میں ایک بلند معیار قائم کر چکا ہے۔ "شیرازہ" کے کئی خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کا ثقافت نمبر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ "شیرازہ" ریاست اور بیرونِ ریاست میں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ اور دِل چسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ وادی میں اگرچہ باضابطہ طور پر کوئی اُردو تھیٹر نہیں ہے لیکن اکثر ڈرامے اِسی زبان میں کھیلے جاتے ہیں۔ اُردو ڈرامہ نگاروں میں علی محمد لون کا نام سرفہرست ہے۔ اُن کے ڈرامے "دیوانے کا خواب"، "چٹان" اور "خانو جان کا خواب" یہاں کے سٹیج ڈراموں میں یادگار تخلیقات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کو "چٹان" کے بغیر عوام کے سامنے پیش کرنے کا سہرا پیدان کتور کے سر ہے۔

اُردو کتابیں شائع کرنے کے لئے ریاستی کلچرل اکادمی ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد دیتی ہے، اِس امداد کا ایک خوبصورت پہلو یہ ہے کہ کتابیں اچھی خاصی تعداد میں شائع ہوتی ہیں لیکن اِس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مواد کے لحاظ سے کچھ کتابیں معیاری نہیں ہوتی ہیں

آزادی سے اب تک بہت سے افسانوی مجموعے، شعری مجموعے، ناولیں وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ افسانوی مجموعوں میں پریم ناتھ پردیسی کا "بہتے چراغ"، پریم ناتھ در کا "نیلی آنکھیں"، پشکر ناتھ کا "اندھیرے اجالے" "تیج بہادر بھان کا "عورت" نور شاہ کا "ایک رات کی ملکہ" اور مین کا آہنگی "اُداس اُداس" قابلِ ذکر ہیں۔ ناولوں میں غلام رسول سنتوش کا "سمندر پیاسا ہے"۔ علی محمد لون کا "شاید ہے تیری آرزو"۔ حامدی کاشمیری کا "بلندیوں کے

خواب"۔ نورشاہ کا "آؤ سو جائیں" اور تیج بہادر بھان کا "سیلاب اور قطرے" اہمیت رکھتے ہیں۔ قیصر قلندر۔ مہندر رینہ۔ حامدی کاشمیری، کمال احمد صدیقی۔ قاضی غلام محمد اور کئی دوسرے شاعروں کے شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور پسند کئے گئے جن دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے کتابیں شایع کی ہیں اُن میں کلدیپ رعنا۔ شبنم قیوم۔ عمر مجید، اکبر جے پوری۔ ڈاکٹر اکبر حیدری۔ وحشی سید ساحل۔ حکیم منظور۔ ڈاکٹر تکیل الرحمان وغیرہ شامل ہیں۔ رشید تاثیر کی کتاب "تحریک حُریت کشمیر" ایک اہم تاریخی کتاب ہے۔ تحریک حُریت کشمیر کے بارے میں پیر محمد افضل مخدومی جو تاثرات قسط وار شایع کرا رہے ہیں، وہ کشمیر کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کا جو ناول "فطرت" شایع ہو چکا ہے وہ ناول کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اُنہوں نے ناول میں بیک وقت کئی موضوع ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ہے، اِس لئے وہ ناول کے مرکزی خیال سے انصاف نہیں کر پائے ہیں۔ اُن کا یہ ناول پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ ناول کی تکنیک سے بے بہرہ ہیں۔ ویسے بھی ناول اُن کا میدان نہیں ہے۔

ریاست بھر میں علاقائی زبانوں کشمیری، ڈوگری اور لداخی کی جانب اچھی خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ بہت سے ادیب اور شاعر اِس وقت اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں لکھ رہے ہیں۔ اور اُن کی تمام تر کوششیں اِس طرف لگی ہوئی ہیں یہ بات اِن علاقائی زبانوں کے فروغ اور شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہے اور بہت حد تک مستحسن اور مُبارک کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی اُردو کی ضرورت اور اہمیت سے آنکھیں موند لینا کسی بھی حالت میں قابلِ فہم بات نہیں ہو سکتی۔ اُردو ہی وہ واحد زبان ہے جسے ریاست بھر کے لئے تبادلۂ خیالات کے لئے مُشترک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اِس زبان کی مدد سے ہم ریاست کی تینوں کلچرل اِکائیوں کے ثقافتی رشتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ اِن اِکائیوں کے لوک ادب اور قدیم و جدید ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام بھی اُردو کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم ریاست بھر کے جدید و قدیم ادب کو ریاست سے باہر روشناس کرانے کے

سلسلے میں اُردو کا ہی دامن تھام سکتے ہیں۔ اِن حقایق کے پیشِ نظر اُردو کی اہمیت اور ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ——— علاقائی زبانوں میں لکھنے والوں کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے اور انہیں بلا کسی تعصّب کے اِس پر سوچنا چاہئے۔

'اِنتخاب اُردو ادب' ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء آپ کے سامنے ہے۔ اُمید ہے کہ پُرانے اور نئے لکھنے والوں کا یہ سنگم آپ کو پسند آئے گا اور ادب میں جو نئی علامتیں، نئے موضوعات اور نئے طرزِ بیان وقت پر اپنائے گئے۔ یہ اِنتخاب اُن پر روشنی ڈالنے میں کامیاب ہو گا۔

نُورشاہ

سری نگر
اگست ۱۹۷۲ء

بڑے شوق سے سُن رہا ہے زمانہ

افسانے

۱ کتبے — پریم ناتھ پردیسی
۲ کھڑکی — پریم ناتھ در
۳ کشمیر کی بیٹی — رامانند ساگر
۴ امن کی طرف — کنول نین پرواز
۵ طمانچہ — سوم ناتھ زتشی
۶ اور رات مر گئی — اختر محی الدین
۷ گلے سڑے پھل — تیج بہادر بھان
۸ عورت اور مرد — اُمیش کول
۹ سپنوں کے گھاؤ — حامدی کاشمیری
۱۰ کل رات کی بات — دیپک کول
۱۱ اُبال — پُشکر ناتھ
۱۲ رات اِک سمٹی ہوئی — نُور شاہ
۱۳ نُور اور سائے — مخمور حسین بدخشی
۱۴ سُراب — ہردے کول بھارتی
۱۵ یہ قربتیں یہ دوریاں — غلام رسول سنتوش
۱۶ جوئیں — کلدیپ رعنا

۱۷	لمحوں کی صلیب	ریاض پنجابی
۱۸	محبوبہ	بشیر شاہ
۱۹	آنکھیں	شبنم قیوم
۲۰	الپسٹرن کلب	حسن ساہو
۲۱	گونگے گلاب	عُمر مجید
۲۲	دوسری صلیب	شمس الدین شمیم
۲۳	دو پیاسی آنکھیں	ہربھجن سنگھ ساگر

پریم ناتھ پردیسی

کتے

دریا کے کنارے سفید شاہی مہمان خانے کے باہر رحیم علی غیر ارادی طور پر ایسے گھوم رہا تھا جیسے نیا نیا جانور جنگل سے پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ آج اس کی چار گھنٹوں والی ڈیوٹی کا ابھی تیسرا ہی دن تھا اور جیسے اُس کے تمام داخلی اور خارجی حس یک لخت بیدار ہو کر جھنجھوڑ رہے تھے۔ شاہی کوٹھیوں کے دروازوں کی پہرہ داری کس قدر کٹھن اور حوصلہ شکن ہوتی ہے یہ اُسے معلوم نہ تھا وہ آج تک ہمیشہ مفصلات کے تھانوں میں رہنے کا عادی تھا جہاں اُس جیسا ادنیٰ سپاہی بھی اپنی انفرادی شخصیت کی اہمیت کو شدّت سے محسوس کرتا ہے۔ صرف خود ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ اوروں کو بھی احساس دلاتا رہتا ہے مگر سرینگر جیسے پُر رونق شہر میں جہاں سینکڑوں چھوٹے موٹے افسر گلی گلی کی خاک چھانتے پھرتے ہیں ـــــ وہ کون تھا؟ اور یہی سوال بار بار نہ جانے کہاں سے رینگ رینگ کر اُس کے سامنے آتا تھا اور اُس کے قدم تیز تیز اُٹھتے تھے، رُکتے تھے، پھر اُٹھتے تھے۔ اُسے اپنی شخصیت لمحہ بہ لمحہ مٹتی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ اُس تنکے کی طرح بہتی ہوئی جسے پہاڑی ندی چٹانوں سے ٹکرانے کے بعد کہیں گُم کر دیتی ہے۔ کہاں مُفصلات کی نوکری اور پانچوں گھی میں اور کہاں مہمان خانے کے باہر ذلیل کتّے کی طرح پہرہ دینا۔ وہاں وہ جسے چاہتا ذلیل کرتا جسے چاہتا گاؤں گاؤں پر سوار کرتا لیکن یہاں کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ زیادہ سے زیادہ مہمان خانے کے اندر کسی کو داخل ہونے سے روک سکے گا یا بڈ ہر کسی کو شور مچانے نہ دے گا تاکہ اندر وزیر صاحب کا قیلولہ خراب نہ ہو جائے۔

دن کے بارہ بج چکے تھے۔ مہمان خانے میں مکمل سکوت تھا۔ وہ سکوت نہیں جو طوفان سے پہلے سمندر میں ہوتا ہے بلکہ وہ جو پہاڑیوں سے گھری ہوئی جھیل کے پانی میں ہوتا ہے۔ بالائی منزل کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور کمروں کی منقش چھتیں اور چھتوں کے وسط پر لٹکی ہوئی جھالر صاف نظر آرہی تھی۔ بنڈ اور مہمان خانے کے درمیان ایک سفید اونچی دیوار حائل تھی جس کی وسط میں ایک چھوٹا سا چور دروازہ تھا۔ اسی چور دروازے کی بغل میں سنتری بکس تھا۔ جہاں قریب کے تھانے سے ہر چار گھنٹے کے بعد نیا سپاہی پہرہ دینے کے لئے آیا کرتا تھا۔

سڑک کے کنارے دریا کی طرف لکڑی کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ نیچے دریا کا گھاٹ بانجھ عورت کی گود کی طرح خالی اور بے رونق تھا۔ لکڑیوں کی سیڑھی جو مہمان خانے کے چور دروازے سے دریا تک جاتی تھی، چاندی اس کی چمپاکلی کی طرح صاف اور ستھری تھی جو کسی بوڑھی طوائف نے نمائش کے لئے پہن رکھی ہو۔

رحیم علی کندھے پر بندوق رکھے اپنے جذبات کی تال پر دیوار کی لمبائی ناپ رہا تھا اور پھر سنتری بکس تک واپس آجاتا تھا۔ اسے دل ہی دل میں ایسی نوکری پر غصہ آرہا تھا ذلیل نوکری، کسی نے اس کے تجربے کی قدر نہ کی تھی ورنہ اُس جیسا سپاہی مہمان خانے کے باہر پہرہ دینے کے لائق تھا؟ اُسے تو ایسی جگہ لگایا جانا چاہئے تھا جہاں وہ اپنا کمال دکھا سکتا اور دُنیا کو دنگ کرا سکتا۔ اسے یہ فلسفہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ شاہی کوٹھیوں کے دروازوں پر پہرہ بٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا مہمان خانوں کے اندر رہنے والے اس قدر کمزور اور ڈرپوک ہوتے ہیں کہ سپاہیوں کا پہرہ ضروری ہے۔ وہ یہی سوچتا سوچتا قدم اُٹھا رہا تھا۔ کبھی اُس کی نگاہیں بالائی منزل کی کھلی کھڑکیوں سے گھس کر منقش چھت اور جھالروں سے ٹکراتی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ اتنے بڑے مکان میں کون لوگ رہتے ہیں۔ کتنے ہیں وہ؟ کیسے ہیں وہ؟ پچھلے دو دن سے اُس نے وہاں کسی کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ یہ کھڑکیاں کب کھولی گئی تھیں۔ کب بند کی جائیں گی۔ اُس نے اُنہیں کھلا ہی دیکھا تھا، اور وہ اب بھی کھلی تھیں۔ ایک عجیب خاموشی، عجیب دبدبہ سارے مہمان خانے پر چھایا ہوا تھا اور سفیدی کی ہوئی دیواروں نے جیسے وہاں کسی کو بولتے، ہنستے یا قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔

پہلے اور دوسرے دن کا پہرہ اُس کے سر پر بھاری بوجھ کی طرح نہیں کٹ گیا۔ چار چار گھنٹے ہی تو تھے اور پھر نیا پہرہ، نئی جگہ، نیا ماحول، سب کچھ حسین ہی نظر آیا حتیٰ کہ سڑک کے نیچے خالی اور بے رونق گھاٹ بھی۔ پھر نوجوان میموں اور انگریزوں کا آنا جانا، اُن کے قہقہے، سرگوشیاں، ننگی ٹانگیں، بلورین بانہیں، کٹے ہوئے بال، متناسب اعضا اور گول گول کولھے، لیکن آج پہرے کا تیسرا دن تھا اور ابھی سے اُسے اپنے سر پر بوجھ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ رات کی دیکھی ہوئی چیزوں کا نیا پن جیسے ختم ہو گیا تھا اور دریا کا بانجھ گھاٹ، بند کی سُرمئی سڑک، مہمان خانے کا بیرونی منظر اور اس کی کھلی کھڑکیاں جیسے اُس نے بہت پہلے دیکھی تھیں۔ مانا ان سب میں حُسن ہے مگر خالی حُسن سے پیٹ تو نہیں بھرتا اور رحیم علی کو زیادہ افسوس یہی تھا کہ پیٹ کیسے بھر جائے۔ شام کے اخراجات جو دو اڑھائی روپے سے اُوپر ہی اُٹھتے تھے کیونکر پورے ہوں۔ مہمان خانے کے باہر پہرہ دیتے ہوئے کمائی کی کوئی صورت نہ تھی۔ "گدھے تھے وہ — جو چار گھنٹے اصیل گائے کی طرح یہاں سنتری بکس کے پاس بندھے رہے" — وہ سوچنے لگا۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک گیا۔ سامنے سنتری بکس تھا جس کا کھلا دروازہ جیسے کہہ رہا تھا — "تھک گئے ہو تو یہاں آؤ۔ سبھی یہاں بیٹھا کرتے ہیں"۔ وہ کچھ اور سوچے بغیر سنتری بکس میں داخل ہوا اور لکڑی کے تختے پر جو آمنے سامنے کی چوبی دیواروں میں کیلوں سے بند تھا بیٹھ گیا۔ کندھے سے بندوق اُتار کر رکھ دی اور بند کی طرف دیکھتا رہا۔ لنچ کا وقت ہو رہا تھا۔ سری نگر کلب سے ریڈیو کی آواز گونج رہی تھی، شہد اور شراب سے بنی ہوئی میمیں اور انگریز کلب کی طرف بھاگ رہے تھے اور رحیم علی اپنے دل میں خلش سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُڑنا چاہتا تھا کہیں وہاں جہاں اُسے تسکین ملے۔ بندوق کندھے پر اُٹھا کر وہ دوبارہ باہر نکلا۔ دو راہگیر سنتری بکس سے پرے جنگلے کے سہارے کھڑے باتیں کرتے کرتے جا رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا — "دُنیا میں لینا دینا کیا ہے۔ چار دن کا جینا ہے اور پھر قبر کا حساب کتاب، ہاں نام رہ جائے تو سب کچھ رہ جاتا ہے"۔ دوسرا راہگیر سر جھکائے خاموشی سے سُن رہا تھا جیسے اُس نے بہت بڑا گناہ کیا ہو اور اب اُس کی تلافی کے وسائل تلاش کر رہا ہو۔

رحیم علی اُن کی باتیں سُن چکا تھا اور دِل ہی دِل میں ہنس رہا تھا۔ نام .... نام ..... کیا ہے نام میں .... پیسہ ہونا چاہئے۔ پیسے کے بغیر انسان ایسا ہے جیسے لُٹّا باؤلی کے بغیر۔ اُس نے چاہا کہ نام کا فلسفہ چھانٹنے والے ہانجی کے مُنہ پر تھپیڑ مار کر کہے —— "کیوں اِس بے چارے کی زندگی تباہ کر رہے ہو —— ؟ یہ کون سا شوق ہے کہ اِسے اپنا نام زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ دُنیا میں کروڑوں ملّاح اور ہانجی پیدا ہوئے اور مر گئے۔ صرف وہی زندہ ہیں، جنہوں نے اپنے بچّوں کے لئے تاج محل، سان سوئی، مِس امریکہ اور نیو غزل جیسے ہاؤس بوٹ چھوڑے۔" لیکن دونوں نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور اُس کے ہونٹوں پر شرمائی سی ہوئی مُسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔ وہ جنگلے کا سہارا لے کر بہتے دریا کو دیکھنے لگا۔ پار جھونپڑیوں اور بنگلہ نُما مکانوں سے بنی ہوئی آرام واری کی بستی تھی۔ دریا کے کنارے ڈونگے بوٹ، کچن بوٹ اور شکارے تھے اور اُن سے پرے ماہی گیروں کے جال دھوپ میں پھیلے ہوئے تھے —— "ہاؤس بوٹوں میں یہ لوگ کیوں کر رہ سکتے ہیں —— ؟" وہ سوچنے لگا .... "نہ صحن، نہ باغ، نہ گھومنے کی جگہ —— یہ بھی کیا زندگی ہے کہ بیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی کشتی میں قیدیوں کی طرح رہو ——" اسے اپنا گھر یاد آیا۔ اُوڑی سے نیچے سلام آباد میں پہاڑیوں کے دامن میں وہ کتنا حسین دکھائی دیتا تھا۔ آگے باغ اور پیچھے جھاڑیوں سے بھرا جنگل۔ تین برس متواتر اُوڑی کے تھانے میں رہ کر اُس نے موروثی جائداد کو کتنی وُسعت دی تھی۔ نیا مکان، نئی زمین، نیا باغ کچھ اپنے رسوخ سے حاصل کی ہوئی، کچھ رعب وداب سے اور کچھ منت سماجت سے اور پھر اتنا بڑا مکان جیسے محل ہو۔ اِسی لئے اُس نے دوسری شادی بھی کی تھی کہ مکان میں ہر وقت گہما گہمی رہے۔ دونوں بیویاں بہنوں کی طرح رہتی تھیں اور اس کے اِس سلوک میں بھی رحیم علی کے تجربے کا بڑا ہاتھ تھا۔ ورنہ سوکنیں کہیں یوں بھی رہتی ہیں۔ کتنا ہی بڑا محل کیوں نہ ہو، دونوں میں اُسے مرگھٹ بنا دیتی ہیں لیکن نہیں، رحیم علی کی دونوں بیویاں اور اُن کے بچے آپس میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ کوئی فرق ہی نظر نہ آتا تھا۔ بچّوں کے شور و غل سے مکان کے تمام کمرے سارا دن گونجا کرتے تھے۔ کھڑکیاں کھلی بھی رہتی تھیں پھر بھی قہقہے ہوا میں تیرتے تیرتے سارے

سلام آباد میں بکھر جاتے تھے۔

رحیم علی کافی دیر سوچتا رہا۔ گھر کے تصوّر کی میٹھی یاد نے اُس کے اُکھڑے اُکھڑے جذبات میں ایک رنگینی سی بھر دی۔ کاش اس کے بازوؤں کے بدلے دو پر لگ جائیں اور وہ اُڑتا اُڑتا سلام آباد پہنچے، اپنے مکان کی کھُلی کھڑکیوں کے نیچے اخروٹ کے درخت کی اوٹ میں رات گئے تک کھڑا رہے اور بچّوں کے قہقہے سُن سکے۔

اُسی وقت شاہی مہمان خانے کی ایک کھڑکی زور سے بند ہو گئی۔ رحیم علی کا سنہرا خواب ٹوٹ گیا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی بند ہونے کے بعد دوبارہ کھُل رہی تھی۔ ہوا کے ایک جھونکے نے اُسے دھکیل کر پھر کھولا تھا۔ وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرنے لگا۔ بلور کی طرح صاف سیڑھی کے نزدیک پہنچ کر یکایک اُسے خیال آیا —— "کتنی ہوں گی ؟ بیس سے کم کیا ہوں گی —— ؟" اُس کی ذہانت نے جواب دیا —— "نہیں زیادہ نہیں تیس سے اُوپر —— پانچ کم یا پانچ زیادہ ——" اُس نے کھڑے کھڑے ہی سیڑھیوں کو گِننا شروع کیا۔ لیکن دس سیڑھیوں کے بعد تمام سیڑھیاں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی سی نظر آتی تھیں جیسے وہ سیڑھیاں نہ ہوں تراشے ہوئے پتھر کی ایک بڑی سِل ہو جو جنم جنم کی پیاس جہلم کے پانی سے بجھا رہی ہو اور پیاس بڑھتی ہی جا رہی ہو۔

اُسے اپنے آپ پر غصّہ آیا بلکہ کوئی چیز کانٹے کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تھانے میں وہ نوٹوں اور ریزگاری کے ڈھیر محض ایک نظر سے گِن ڈالتا تھا اور یہاں وہ چند بے جان سیڑھیاں تک نہیں گِن جا سکتیں۔ کانٹا چبھتا گیا اور رُوح تک پہنچا۔ اُسے ڈرگمی کے زینے گننے چاہئیں۔ ضرور گننے چاہئیں کیا ہوا دس کے بعد وہ سِل بنتے ہیں آخر زینے ہی تو ہیں۔ نوٹ نہیں۔ اُس نے مہمان خانے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اطمینان کر رہا ہو کہ اندر سفیدی کئے ہوئے خاموش کمروں میں تو کوئی نہیں۔ کھڑکیاں کھُلی تھیں اور چھت سے لٹکی ہوئی مایوس سی جھالریں جیسے کہہ رہی تھیں —— "یہاں کوئی نہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں گنتا ہوا نیچے اُترا۔ کُل ۳۷ تھیں یعنی تیس اور سات۔ اُسے فخر تھا کہ تجربے نے ذہانت کو شکست دی۔ بیس اور تیس میں کتنا فرق ہے۔ اس کا اندازہ اس

کی ذہانت نے نہیں لگایا تھا مگر تجربہ فوراً تاڑ گیا تھا۔ تیس سے اُوپر ہوں گی پانچ کم یا پانچ زیادہ۔
جب وہ واپس سیڑھیاں چڑھنے لگا تو وہ بے حد خوش تھا۔ رُوح تک پہنچا ہوا کانٹا گرمی لگتے ہی گھی کی طرح پگھل کر گوشت اور پوست میں تحلیل ہو گیا تھا۔

چڑھتے چڑھتے پسینے کی چند بوندیں اُس کے چہرے پر نمودار ہو گئیں۔ آسمان پر سُورج چمک رہا تھا اور منڈیر پر جنگلے کے ساتھ دو اخبار فروش بچے اُسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"نیا سنتری ہے —" ایک کہہ رہا تھا۔

"پرسوں ایک پنڈت تھا جو سارا دن کوٹھڑی میں چلم پیتا رہتا تھا —"

"ہی۔ ہی۔ ہی — شو وہ ہوگا۔"

"روز بدلتے ہیں یہ —"

"مگر یہاں کیا کرتے ہیں —"

"پہرہ —"

"— پہرہ —؟"

"ہاں اس کوٹھی میں جو رہتا ہے اُس کا ......"

"اس کا —؟ اس نے کیا کیا ہے جو پُلِسّ (پولیس) کا پہرہ لگا؟"

"حرامی! منسٹر جو ہے۔ نہیں لگتا پہرہ — بڑا دروازہ نہیں دیکھا۔ وہاں دو ہوتے ہیں۔"

"رو ......! باخُدا مجھے معلوم نہ تھا مگر پہرہ کیوں لگتا ہے —؟"

"یونہی ...... حاکم جو ہے۔"

دونوں بچے کھلکھلا کر ہنس دئے جیسے اُنہیں اعتبار نہ آیا کہ ایسی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمیشہ حاکم ہی ہوتے ہیں جن کے دروازوں پر سنتری پہرہ دیتے ہیں۔

رحیم علی اب چار سیڑھیاں نیچے تھا۔ اُس نے اُن کی آخری باتیں سُنی تھیں اور وہ بھی مُسکرانے لگا تھا — "سچ ہے حاکم جو ہوئے —" وہ دِل ہی دِل

میں کہہ رہا تھا۔

اُوپر پہنچ کر اُس نے بیک وقت دونوں سے سوال کیا — "کیا ہے"

بچّوں نے جھٹ اپنی گود میں اخباروں کو پھیلا کر کہا — "آج کا تازہ خبار 'سٹیٹسمین'۔ 'سول ملٹری' ...... 'ڈان' ...... پڑھو گے — ؟"

رحیم علی انگریزی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اپنی کمزوری کو چھپاتے ہوئے بولا — "پڑھنے کی فرصت کہاں — لاؤ ذرا تصویریں دیکھیں —"

"سول ملٹری" کے سرورق پر عبوری حکومت کے سرکردہ رُکن پنڈت جواہر لعل نہرو کی تازہ تصویر دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ ہونٹ مُسکراہٹ میں پھیلتے پھیلتے کانوں تک پہنچنے لگے — "وہی تو ہے —" اُس نے اطمینان کرنے کے بعد اپنے آپ سے کہا — لیکن ایسے بھی تسکین نہ پا کر یکایک بچّوں کو تصویر دکھاتے ہوئے بولا — "جانتے ہو کون ہے — ؟" اور پھر اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بولا — "جواہر لعل ہے جسے میں نے اُوڑی میں روکا تھا اور اس پر دو دن پہرہ دیا تھا۔"

بچّے حیرت سے اُسے دیکھتے رہے۔ اُنہوں نے آج سے پانچ ماہ پیشتر یہ کہانی سُنی تھی اور آج اُن کے سامنے جواہر لعل پر پہرہ دینے والا سپاہی کھڑا تھا۔ اُن کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ جواہر لعل پر — جو شیر کی طرح دھاڑتا ہوا کشمیر آنا چاہتا تھا لیکن نہیں آسکا۔ صرف اِس لئے کہ رحیم علی نے اُس پر پہرہ دیا تھا اور اُسے روکا تھا۔

اُسی وقت ہوا کے ایک جھونکے سے مہمان خانے کی کھلی کھڑکی پھر زور سے ٹکرائی — دونوں اخبار فروش بچّوں اور رحیم علی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ہوا کا دوسرا جھونکا پھر کھڑکی کھول رہا تھا۔ اور اندر لٹکی ہوئی جھالر جھُوم رہی تھی جیسے کہہ رہی تھی — "جھوٹ ...... سراسر جھوٹ ......"

اُسی وقت دو انگریز کلب سے واپس آرہے تھے۔ بچّوں نے اُنہیں دیکھتے ہی جھٹ رحیم علی کے ہاتھ سے اخبار کا پرچہ چھینا اور "صاحب اخبار، صاحب اخبار" پکارنے لگے۔ دونوں انگریز اخبار دیکھ کر رُک گئے۔ اور اخباروں کی سُرخیاں دیکھنے لگے۔ ایک نے

جیب سے دو نی نکال کر ایک بچّے کے ہاتھ میں رکھی اور "سول ملٹری" لے کر دونوں چل دیے۔ رحیم علی اُنہیں دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ آنکھوں کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں شاید وہ اُنہیں کہنا چاہتا تھا ـــــ "صاحب ہم نے اِس جواہر لعل پر اُوڑی میں پہرہ دیا ہے ہم سلام آباد کا راجہ ہے۔ ہمارے گھر میں دو بیویاں ہیں۔" لیکن انگریز جا چکے تھے اور رحیم علی کے ہونٹوں کا اِرتعاش آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا ـــــ اُسے اخبار کے بک جانے کا بے حد افسوس ہوا۔ ایک ہی پرچہ تھا اور وہ بھی اُٹھ گیا قبل اس کے کہ رحیم علی تھانے کے افسر، محرر اور سپاہیوں کو تصویر دکھا دکھا کر کہتا کہ میں نے اُسے روکا تھا اور اُس پر دو دِن پہرہ دیا تھا۔

معاً اُس کی نظریں اُس چنار پر پڑیں جو سنتری بکس کے پیچھے چند گز کے فاصلے پر سڑک کے ایک طرف کھڑا تھا تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ پچھلے دو دِن اس نے یہ چنار دیکھا ہی نہ تھا ایک تو اِس لئے کہ چنار سنتری بکس کے عقب میں بہت پیچھے تھا اور دوسرے اِس لئے کہ دونوں دِنوں کا پہرہ تماشہ دیکھتے دیکھتے ہی گزر گیا تھا مگر اِس کے موٹے تنے پر یہ کون لوگ تھے ـــــ محمد اکبر، فیروز خان، چین سنگھ۔ عبدالحمید شاہ، راگو بٹ......

شاید یہ نام اِسی طرح کئی برسوں سے کھدے ہوئے تھے اور یقیناً اُن پہرے داروں کے ہوں گے جو مہمان خانے کے باہر نوکری کر چکے تھے بعض ناموں کے ساتھ نمبر بھی کھدے ہوئے تھے اور بعض کے ساتھ گھر کا پتہ بھی تھا۔ بعض تیز چاقو سے چھیل چھیل کر کھودے گئے تھے اور بعض کُند ہتھیاروں سے، بعض سے فن کارانہ صلاحیت چھلکتی تھی اور بعض سے الھڑ پن۔

حیرت سے رحیم علی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اُسے یہ جدّت بے حد پسند آگئی۔ شاید بے کیف پہرے کے وقت کو ٹالنے کے لئے سپاہیوں نے اسے ایجاد کیا ہو۔ وہ سوچنے لگا جدّت بھی کیا ہے، اچھی خاصی یادگار ہے جو سینکڑوں برس تک قائم رہ سکتی ہے۔ اُس نے مدرسے میں اشوک کے کتبوں کے متعلق پڑھا تھا جس نے شہر شہر اپنے احکام پتھروں پر کُھدوائے تھے۔ آج اشوک اسی طرح زندہ ہے کہ اُس کے کتبے زندہ ہیں ورنہ ہزاروں اشوک

آئے اور گئے صرف وہی اشوک زندہ ہے جس کے کتبے بکھرے ہوئے ہیں ۔ یقیناً اگر آج اشوک ہوتا تو پتھروں کی بجائے وہ بھی چناروں کو ہی پسند کرتا۔ ہری بھری ٹہنیوں کی چھاؤں تلے موٹے اور کھردرے تنے پر کھُدے ہوئے نام ——— لافانی کتبے !!

اسے چناروں کی عظمت کا شدید احساس ہونے لگا جس نے اپنی ننگی چھاتی معمولی سپاہیوں کے تیز اور کُند ہتھیاروں سے چھلنی کر دی تھی اور اب اُن سب کے نام اپنے سینے پر لئے دُنیا کو دکھا رہا تھا۔ اُسے دِل ہی دِل میں نام کھودنے والوں سے نفرت ہونے لگی۔ اسلام کسی کو ایذا دے کر اپنا نام زندہ رکھنے کا حامی نہیں مگر یہاں نام کھودنے والوں میں سکھ بھی تھے اور پنڈت بھی ——— اور نام اِس ترتیب سے کھودے گئے تھے کہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سب سے پہلے کس کے دماغ نے اس جدّت کو جنم دیا۔ رحیم علی نے اس سے قبل کئی جگہوں پر ایسی بے ہودگیاں دیکھی تھیں لیکن اتنی اہم نہیں جتنے اہم یہ کتبے تھے۔ جہاں پر سپاہی صرف چار گھنٹے کا پہرہ دیتا ہے اور جہاں اندر، خاموش مگر پُر رعب کوٹھی میں وہ جادوگر رہتا ہے جس کی صورت سپاہیوں کو دکھائی تو نہیں دیتی۔ لیکن جس کے سانس کی ہر دھڑکن چالیس لاکھ انسان محسوس کر سکتے ہیں۔

وہ حیران تھا کہ اِن سپاہیوں میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ اُنھوں نے چنار کے تنے پر اپنے کتبے لکھے، لیکن نہیں ——— وہ سپاہی تھے جو ڈرتے ہیں، جو بے تاج بادشاہوں پر بھی پہرہ دیتے ہیں۔ بشاشت کی اِسی لذت نے اس میں نئی قوت پیدا کر دی۔ وہ اکتاہٹ، وہ بیزاری اور حبس کا احساس جیسے یک لخت مٹ گیا۔ اُس نے جنگلے کے ساتھ کھڑے اخبار فروشوں کی طرف دیکھا اور پوچھا ——— "چاقو ہے"؟

بچے اُس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ سہمی سہمی سی نظروں سے اُسے دیکھتے رہے۔ اُس نے پھر پوچھا۔

"چاقو ہے ——— ؟

"کیا کرو گے ——— ؟" ایک بچّے نے ہمّت کر کے پُوچھا۔

رحیم علی کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ بکھر گئی ——— بولا ——— "نام لکھوں گا"

"نام"

"ہاں اپنا نام"

"لیکن اس پر نام لکھنا اب منع ہے"

"منع ــــ ؟ رحیم علی کی آنکھوں میں حیرانیاں بھرنے لگیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا سب کچھ یہی ایک لفظ کہہ کر چھینا گیا' بہادری' بشاشت' لازوال بننے کی آرزو ــــــ!

"کس نے منع کیا ہے ــ ؟" اُس نے نزدیک جاکر پوچھا۔

بچوں نے مسکرا کر کہا ــــــ "حاکم نے اور کس نے۔"

تھوڑی دیر کے لئے رحیم علی کھدے ہوئے ناموں کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا شاید فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے مرگ انبوہ میں شامل ہونا چاہئے یا نہیں۔ قانون کا احترام کرنا سپاہی کا فرض ہے۔ اُسے نام نہیں لکھنا چاہئے۔ حاکم نے منع کیا ہے۔ اسلام بھی ایذا رسانی کا حامی نہیں۔ مگر اشوک ــــــ جو اب تک زندہ ہے' بچوں کی کتابوں میں' لوگوں کے دلوں میں' اُجڑے شہر کے کھنڈروں میں' ہندوستان کی تاریخ میں ــــــ جو امانت کی طرح صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے اور خدا جانے کتنے کہاں تک اُسے لے جائیں۔ سلام آباد کا محل کسی دن گر جائے گا ــــ بہنوں کی طرح رہنے والی بیویاں مر جائیں گی۔ وسعت زمی ہوئی موروثی جائداد دھوپ چھاؤں کی طرح کبھی ایک کے پاس رہے گی کبھی دوسرے کے پاس' مگر چنار کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کوٹھیاں بدلیں گی۔ گھاٹ آباد ہوں گے وزیر بدلیں گے اور تنے پر لکھا ہوا کتبہ امر ہو جائے گا۔ اُسے کوئی نہیں مار سکتا' کوئی نہیں مٹا سکتا۔ کوئی نہیں بدل سکتا۔ وہ تاریخ بن جائے گا۔ اشوک کا کتبہ ہو کر رہے گا ــــــ لافانی اور لازوال!

اسی جذبے سے متاثر ہو کر فوراً بندوق کو ایک طرف رکھ کر اُس نے سنگین اُتاری اور اُس کی نوک سے چنار کی ننگی چھاتی چھیلنے لگا۔ یہ ایذا ضرور ہے مگر جب ایذا کے پیچھے ابدیت اُبھرنے والی ہو تو ایذا' ایذا نہیں رہتی۔ وہ اپنا نام کھودتا رہا ــــ

کھودتا رہا ایسی جگہ جہاں اُس کی انفرادی شخصیت اوڑی کے تھانے کی طرح جُداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ کھودتے کھودتے اُسے یقین ہوتا جاتا تھا جیسے وہ اشوک بنتا جا رہا ہے۔ سلام آباد کا اشوک ــــ پولیس کا اشوک ــــ جیسے وہ اب کبھی نہیں مر سکتا۔ اُسے کوئی نہیں مار سکتا اور جب وہ نام کھود چکا تو سنگین کی نوک چنار کے سفید خون سے بھیگ چکی تھی مگر اسی لہو کے نیچے سے ایک نئی ہستی، نیا اشوک ــــ اُبھر آیا تھا ــــ رحیم علی!

اور جب پہرہ ختم ہو کر وہ تھانے کی طرف جانے لگا اُس نے ایک بار پھر اپنے کتبے پر نظر ڈالی۔ فرطِ مسرت سے اُس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اُس کی رُوح، اُس کا دماغ، اُس کا ذہن بادلوں کو چیر پھاڑ کر آسمان کی وسعتوں میں اُڑا جا رہا تھا، جیسے وہ آسمان کی نیلاہٹ کو چھُونے کا قصد کر چکا تو اُسے محسوس ہوا جیسے چنار پر لکھے ہوئے نام مُسکرا رہے ہوں، اور چنار کا چھلا ہوا تنا کہہ رہا ہو ــــ "جاؤ...... یہ کتبے میرے پاس امانت ہیں، اُس وقت تک جب تک کہ معاوضے کے لئے انصاف کی عدالت فیصلہ کرنے بیٹھے گی اور حاکم و محکوم کی سچّی تعریف کرے گی ــــ"

پریم ناتھ در

کھڑکی

اس کھڑکی میں ایک نہیں دس باتیں تھیں جو کانتا جی کو کھینچ لیتی تھیں۔ پہلی بات تو خیر یہی تھی کہ یہاں دو منٹ ٹک جانے کو جگہ تھی۔ ذرا دم لینے کو اماں جی آواز دیتیں نہ کھڑا ہونا بُرا لگتا نہ دیر لگتی۔ فرش پر کہیں گھٹنے جوڑ کر بیٹھنے سے یہی اچھا تھا کہ اپنی ٹانگیں لٹکی رہیں اور کمر بھی ٹکی رہے، پھر چاہے اُوپر آسمان کی طرف دیکھو چاہے نیچے زمین کی طرف یا یوں ہی پرے مکانوں کو گھورتے رہو۔ اپنے مَن میں جس بات کا خیال آجائے اس کو بلا جھجک آنے دو ——— اس جگہ کوئی ایسا تھا ہی نہیں۔ اُوپر آسمان میں نہ نیچے زمین پر جو سامنے بیٹھا بیٹھا بھَوؤں یا ہونٹوں کی چھوٹی سی حرکت کو دیکھنے اور مَن کی چوری کو پکڑ لے۔ یہاں تو اپنے مُنہ سے کوئی لفظ بھی نکلے۔ تار بیٹھی چڑیا ہو گی چی چی کرکے بھاگ اُڑے گی۔ نہ اپنا مطلب اس کی سمجھ میں۔ نہ اس کی بولی اپنے پلے میں۔ اندر اندر سینے میں جو اٹک گیا ہے اس کھڑکی پر آکر نکال دو۔ اتنی سی چڑیا ہی بھرے بوجھ کو لے جاتی ہے۔

کانتا جی کی کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ مری مری بیمار سی سڑک کو چھوتی بھی نہیں اور ایک آن میں سڑک کے ساتھ لگی ہوئی کھلی زمین پر آجاتی اور پھر زمین کے اسی ٹکڑے کی لمبائی چوڑائی کو ناپنے لگتی۔ ویسے تو وہاں بہت کچھ تھا جسے گھنٹوں دیکھا جاسکتا تھا لیکن کانتا جی کے پاس گھنٹے کہاں لمحے ہی ہوتے تھے۔

کسی لمحے اس کے دماغ میں یہ خیال آتا کہ کھونٹے سے بندھی ہوئی بھینسیں سوکھتی نہیں ہیں۔ صبح و شام دونوں وقت دودھ سے بھری بالٹیاں دیتی ہیں۔ کسی لمحے پھر اسے یہ

خیال آتا کہ بھینسوں کو یوں ہی بغیر کام کاج کے کھانا ملتا ہے۔ بغیر کسی محنت کے خدمت ملتی ہے۔ دودھ یوں ہی نہیں دیتیں۔ زمین کا وہ ٹکڑا ایک بڑا آنگن سا تھا۔ جہاں کئی بھینسیں تھیں۔ بھینسوں کے کالے کالے بچّے تھے۔ لکڑی کی لمبی لمبی ناندیں تھیں، کھونٹے تھے اور ایک طرف کچھ چھپر تھے جن کے نیچے کئی گھسیوں کی اٹواٹی کھٹواٹی بکھری رہتی۔

کسی لمحے جب وہ رسوئی چھوڑ کر کوئلے کی دھک اور پھیلتے دھوئیں سے بھاگ آتی اور کھڑکی پر سانسیں لیتی۔ تو ہوا میں وہ ایک ایسی ملاوٹ پاتی جو سینکڑوں میل کیا ان کے ناپوں میں اسے کروڑوں میل دور لے جاتی۔ نہ معلوم چیر کے نیچے سے جلتے تمباکو کی بو اس کی کھڑکی تک کیسے پہنچی ہوئی ہوتی جو اس کے آتے ہی اس کی ناک میں گھس جاتی۔ اور ایک بار پھر بھورانی کا ناجی کو نیچے گوبر پر بٹھاتی اور چھپی دبی کانتا کو چمکا دیتی۔ ندی کا شاکو جو دہلی بھر کی تمام اینٹوں کو پیچھے چھوڑتی سوکھے میدانوں کے سینکڑوں میل طے کرتی اپنے پیارے پہاڑوں کو چوم کر گہرے نیلے آسمان سے اترتی اپنے من کے پرانے ٹھکانے پر بہتی وتستا کے کنارے اپنی ماں سے روٹھنے۔ اپنے بھائی سے جھگڑتے اور اپنے ابّا کے حقّہ میں پانی بھرنے۔

پھر اندر سے وہی ساس کی آواز سنائی دیتی اور نہ جانے کھڑکی کی سلاخوں پر اس سیدھی سی آواز کو کیا ہو جاتا کہ ایک آواز میں لاکھوں سیخیں گھس جاتیں اور نیلا آسمان مٹیالا نظر آتا اور زمین کانپ اٹھتی اور کانتا کھو جاتی وتستا دکھائی دیتی نہ بیچ کے پہاڑ۔ ایک ہی لمحے میں بچاری کانتا موٹے موٹے گوبر کے موندوں میں لت پت ہو جاتی اور کیچڑ کے گہرے گڑھوں میں جا گرتی اور کانتا جی سر پر پلہ سنبھالتی ہوئی کھڑکی سے اٹھ کر اندر چلی جاتی۔

اندر کے وہی پتھر کے کوئلے کا دھواں ہوتا جس نے کشمیر سے آئی ہوئی دلہن کانتا جی کا دلی میں پہلا استقبال کیا تھا۔ نئی زندگی کے اس نئے دھوئیں کو وہ تب کیا سمجھتی؟ دھوئیں سے پہلے وہ ایک ایک لکڑی خوش بو سے پہچان لیتی۔ بدلو۔ بید۔ کایرو۔ دیودار ایک ایک لکڑی جنگل کی مٹی سے اپنی اپنی لہریں لے کے آتی تھی۔ پھر وہ دھواں سنہری لپٹوں کے اندر پیچ دار لکیریں بناتا نہ جانے کن پریوں کی سیڑھی بناتا اوپر ہی اوپر جاتا اور یہ جلے بجھے پتھر کا دھواں اپنی کڑواہٹ اور دھسک کو لے کر سینے سے نیچے ہی چلا جاتا اور اندر اندر ہی پھیل

جاتا۔ دہلی میں پتھر کا بھی ایسا کالا کوئلہ ہو جاتا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اور اس دھویں سے بھاگ کر جب کانتا جی اس کھڑکی کی پھر چار سال پیچھے کا سفر کرتی تو ایک بار اس کے سینے کی کھوکھلاہٹ بھر جاتی۔ "دہلی سے دُولہا آیا رے" چڑیل سہیلیاں شور مچاتیں اور وہ بھی پھولی نہ سماتی۔ بڑی بات تھی کہ لڑکا بھی دہلی میں کام کرتا ہوا اور لڑکے کا باپ بھی۔ لڑکا کمائے تو اپنے لئے اور باپ کمائے تو لڑکے کے لئے۔ تیسرا کوئی تھا نہیں۔ کانتا جی تو راج کرنے آئی تھی راج۔

پھر جب راجدھانی سے کانتا جی لوٹی تھی اس کے اپنے ماں باپ بھی اس کا رونا نہیں سمجھے تھے۔ وہی جو اس کے خوابوں کے معمار تھے۔ اس کے خُون کو نہ سمجھ سکے۔ اُنہوں نے اس کے لئے نئے زیور بنائے۔ اس کے دولھے کے لئے کپڑے بنائے اور اس کی ساس کے لئے قیمتی تحفے سجائے اور اس کو واپس وہیں بھیج دیا۔

کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے کانتا کے سر میں لاتعداد پہیئے سے گھومنے لگے۔ اور میکے سے سسرال تک ایک بھیانک سفر شروع ہو جاتا۔ اسی وقت نیچے بھینس پر ہزاروں مکھیاں چمٹ جاتیں اور کانتا کو لگتا کہ یہی مکھیاں رُوپ بدل گئیں۔ انسان بن گئیں اور پہیوں کو ڈھکیلنے لگیں۔ انہی خوفناک مکھیوں کے بیچ کانتا اپنے ماں باپ کو بھی پھنسا ہوا دیکھتی اور ڈھکیلتے ہوئے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ بھی سمجھتی۔ گھوسی بھینس پر لاٹھی مارتا مکھیاں بھنبھنا کر اُڑنے لگتیں اور اندر ساس کی آواز گونجتی اور کانتا کا سفر پورا ہو جاتا۔

ساس! کانتا کے گھر والے کی ماں۔ کانتا کے ماں باپ کی سمدھن۔ اس کی اپنی سانس سانس کی مالکن۔ ساس جس کے قبضے میں گھر کے دونوں مرد تھے ایک جو کانتا کا سسر تھا اور ایک جو اس کا اپنا گھر والا تھا۔ ساس ——— سماج کی عدالت میں جس کا ایک رتبہ تھا جس کا مُنہ کھُل جائے تو کانتا کو اسی کھڑکی سے نیچے پھینکا جائے اور اس قابل بھی نہ رکھا جائے کہ اس کے ماں باپ آکر اُسے اُٹھا کرے جائیں۔ اس ساس کا جھوٹ کیا ہے۔ اس ساس کا سچ کیا ہے۔ کانتا کے لئے سوچنا بھی منع تھا۔ لیکن وہی ایک چوکھٹ تھی اس کھڑکی کی جہاں سب قانون ٹوٹ جاتے جہاں کانتا کے خیال جیسے چاہتے ویسے بنتے بگڑتے۔

کھڑکی کے باہر بھینس بھی اچھی تھی۔ لیکن کھڑکی کے اندر جو ساس تھی خیر اڑوس پڑوس سے برادری کے لوگوں سے پوچھو تو یہی کہیں گے کہ ایسی اچھی کھڑکی والا مکان بنا ہی نہ ہوتا اگر یہی اندر بیٹھی اماں جی نہ ہوتیں۔

دہلی کی گھٹن میں سینہ تو دکھنے لگا تھا لیکن اماں جی کے دماغ میں مکان کا خیال نہ آیا تو کانتا کو اپنے لئے یہ کھلا مکان کہاں ملتا؟ وہی تھیں کہ انہوں نے علاج طے کر لیا اور شہر کے تنگ مکان سے دور کرایہ کے ڈیڑھ کمرے سے صرف کانتا جی کے لئے بھاگنے کی ٹھانی اور ایک اپنے مکان کا انتظام کیا۔ مکان ویسے بھی کس لئے بنا تھا؟ کانتا نہیں تو اور کس کے لئے؟ اس کا نہ کوئی جیٹھ تھا نہ دیور اور جب ساس کو اسی ایک کی فکر تھی۔ کانتا کا باپ اپنی بچی کے پیار اور اپنے بڑے نام کو کیسے بنائے رکھتا اگر وہ کم سے کم مکان کے خرچ کی آدھی رقم بھی نہ دیتا۔

خیر بیٹی کو کون نہیں دیتا۔ یہ کہو کہ لڑکا مزاج سے خاموش تھا۔ رنگیلا نہیں تھا۔ شوقین نہیں تھا۔ ہوتا تو بدیس جانے کی سوچتا اور سسر کو بڑی ٹریننگ کا خرچہ اُٹھانا پڑتا۔ اپنی برادری کا دستور یہی تھا کہ داماد کو ٹریننگ کا خرچہ دیا جائے مکان کی رقم ایسے خرچ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی اور کھڑکی پر سوچتی ہوئی کانتا کو اپنے باپ کی بچت پر نامعلوم خوشی کیوں نہ ہوتی۔ اُلٹا افسوس ہوتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں بدیس کی ٹریننگ کا شوق ہی نہیں۔

لیکن اس مکان کی دیواروں میں اینٹوں کی ترتیب کیسی تھی کہ کانتا جی کو سب کی سب اینٹیں اپنی ہڈیوں پر ہی گرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک وہی کھڑکی سیدھی تھی اور اندر دیواروں پر سجی ہوئی تصویروں سے اچھی وہی باہر کی کیچڑ۔ کانتا چڑیا کو کہتی کہ مکان کے اندر دس خانے ہیں جن میں ان کے پنکھ بھی نہیں چل سکتے۔ جن میں دس طرح کے دباؤ ہیں۔ وہ کہتی کہ اندر اندر بہو کے دس نام ہیں۔ جو دبی دبی آوازیں غصے اور نفرت کو دہراتے ہیں۔ کہ باہر باہر بیٹھی آوازیں کانتا جی کا پورا نام ڈھلا ڈھلایا سفید چہرہ۔ ٹیڑھی مانگ اور اُلٹا پلہ ایک سیدھی اور میٹھی زندگی کا اشتہار ہے۔ وہ کہتی کہ مکان کی دیواریں گونگی ہیں۔ جن میں دو مرتبے ہوئے سے

لگتے ہیں۔ لیکن دیواروں کی یہی اینٹیں سانپوں کی زبانیں نکالتی ہیں۔ جس وقت وہ ایک عورت بولنے لگتی ہے اس عورت کے لئے مکان کے اندر ایک کام بھی نہیں ہے لیکن کانتا کے سینکڑوں کاموں پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس کے سامنے کانتا ایک بھی سانس نہیں لے سکتی۔ جس کو وہ نہ سنے اور سُن کر اسے بربادی کا سبب نہ بنائے۔

مکان ——— یہ کانتا کے لئے اس مکان میں دن کے اُجالے رات کے اندھیرے سے زیادہ خوفناک تھے۔ جب کانتا کا جسم پسینوں میں پگھلتا رہتا اور اندر اندر دل کا ایک لوندا بن جاتا ——— رات کی لپیٹ میں اسے مکان کا ہوش رہتا نہ مکان والوں کا۔ آدھ موئی زندگی میں اسے نہ سپنے یاد رہتے نہ ٹوٹی ہوئی نیند کے ٹکڑے، کبھی اسے بیھرے ہوئے بھینسے کا احساس ہوتا تو ساتھ اُسے گھوسی کی لاٹھی بھی سُنائی دیتی اور وہ اُٹھ کر یوں ہی کھڑکی پر چلی آتی نیچے کچھ نہ دیکھ کر پرے مکانوں کی طرف نظر اُٹھاتی۔ تاروں کی چھاؤں میں اسے کمرے کی بتی سرکاتی دکھائی دیتی۔ ایک سایہ دوسرے کے ساتھ کھیلتا ہوا سا دکھائی دیتا۔ پھر آنکھ جھپکتے ہی وہ بتی بجھ جاتی اور پھر وہ اپنے بستر پر گر جاتی۔

کھڑکی پر کھڑے کھڑے کانتا دُنیا بھر کی باتیں دیکھتی۔ چاروں طرف ایک نئی زندگی کو محسوس کرتی صبح کو دیکھتی کہ ایک نئی بہو آئی ہے۔ شام کو دیکھتی کہ وہی اپنا گھر بسانے نکلی ہے اپنی تمنّائیں پُوری کرنے کو۔ چھپائی ہوئی تصویروں میں رنگ بھرنے کو اور من بھائے جھولے میں پینگیں لینے کو ——— اور یہاں، یہاں تو بڑے شہر کے بیچ میں وہ بھی تھی جو سینکڑوں میل دُور کے رسم و رواج، پُرانے وقتوں کے بندھن، سسرال والوں کے حقوق۔ میکے والوں کے فرائض، ساس کے الہنے تہواروں کے تحفے۔ مالک کی ملکیت اور اپنی غلامی میں گھل رہی تھی۔ کاش ماں باپ نے اسے کبھی لاڈ نہ کیا ہوتا۔ کاش ماں باپ نے اسے احساس کی مُصیبت سے بچائے رکھا ہوتا۔ اس نے پڑھا لکھا نہ ہوتا ——— پڑھائی ——— اُس کی پڑھائی بھی ادھوری نہیں تھی۔ نہیں تو وہ رسیاں نہ توڑتی۔ میکے سسرال کے چکر سے پھاند نہ نکلتی سماج کی ان گنت کیھوں کو ایک جھٹکے سے ہٹا نہ دیتی۔

لیکن یہ سب چکر کھڑکی کی ہوا کا تھا۔ نہیں تو جان پہچان کے لوگ یہی جانتے تھے کہ

کانتا کی ساس نے کانتا کی ہر ضرورت کو سمجھنا اپنا فرض مان لیا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ کانتا کی ساس اور اس کے ماں باپ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ جس ضرورت کی سمجھ ساس کے دماغ میں آجاتی، اس بات کو کانتا کے ماں باپ فوراً بھانپ لیتے اور کانتا کی وہ ضرورت پوری کرتے انہیں بھلا کوئی کیسے روکتا۔ کانتا ان کی اپنی جائی نہیں تھی کیا۔

اماں جی نے بہو کا دِل بہلانے کے لئے ایک گراموفون کی ضرورت سمجھی۔ ریکارڈوں سمیت پیش کیا گیا۔ لیکن کانتا کے اپنے توے پر اسی وقت روٹیاں جلنے لگتیں۔ دھلتے کپڑے کی جگہ سوٹے کی چوٹ اس کے اپنے ہاتھ پر پڑتی۔ برتن کی راکھ اپنے ناخن میں چبھتی یا یوں ہی چیز اُٹھاتے نس کھچ جاتی جب اماں جی اس کے کام کاج کو دِل چسپ بنانے کے لئے، اس کا دِل بہلانے کے لئے اسی کے گراموفون پر ریکارڈ چلاتیں۔

کھائی ہوئی چوٹ کو سہلانے بھی وہ وہیں آتی۔ اسی اپنی کھڑکی پر اور اماں جی کو بتاتی بھی نہیں جب تک کہ اس کی ایک آدھ ہچکی اُوبکی نہ نکلتی اور اس کی چوری پکڑی نہ جاتی۔

باپ کے بھیجے ہوئے جیب خرچ سے ہی سہی۔ اماں جی کیا اپنی بہو کو پکچر دکھانے نہیں لے جاتی تھیں۔ لیکن اندھیرا ہوتے ہی جب پردہ سکرین پر ایک کہانی گھومنے لگتی، نہ جانے کانتا جی کو کیا ہو جاتا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگاتی جب ہیرو ہیروئن کا بیاہ بھی ہو جاتا کانتا پھر بھی آنسوؤں کو نہ روکتی۔

سب جانتے تھے کہ اگر اماں جی کا دِل بڑا نہ ہوتا۔ اُنہیں بہو سے پیار نہ ہوتا وہ ان سب باتوں کو کیسے برداشت کرتیں۔ اور کوئی ہوتی تو وہ نہ چاہتی تھی کہ ہو بھی سکتی کانتا جلدی جلدی مر جائے کہ راستہ صاف ہو جائے کہ ایک بار پھر بندن نذر لگ جائیں۔ مہندی والی ایک نئی رات چمک جائے۔ ضیافت سے برادری میں نیا نام ہو جائے اور نئی دُلہن کے جہیز سے گھر بھر جائے۔

یہاں تو ساس کو اُلٹی فکر لگی ہوئی تھی کہ بہو کے ہاتھ پاؤں گرم رہنے لگے ہیں کہ روز شام کو اسے حرارت بخار نہ بن جائے۔ وہ کانتا کو لیٹنے نہیں دیتی تھیں

اُنہیں یقین تھا کہ موئے بُخار کو حرارت کے نرم نام سے پکارنا ہی اچھا ہے۔ نہیں تو یہ موگ لپٹنے والے کو تپ تپا کر پُورا لٹا دیگا اور پھر لٹا کر ہی لے جائے گا۔ کانتا کی بات وہ مانیتں تو کانتا ایک شام کو لیٹ کر کبھی نہ اُٹھتی۔

خیر ان اڑوس پڑوس کے لوگوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آج تمہاری بات کل تیسرے کی۔ پھر لوگ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا ہی دیتے ہیں۔ کسی نے اماں جی کا پیار نہیں دیکھا دلار نہیں دیکھا اور دس باتیں یوں ہی اُڑا دیں اور کانتا جی کے ابّا کو دہلی آنا پڑا۔ ان کے آنے سے پہلے ان کا خط آیا تھا۔ کانتا کو خط کی بات تو معلوم نہیں تھی۔ لیکن دونوں سے امی کا دِل پہلے زیادہ دھڑکنے لگا تھا۔ دونوں سے اماں جی کئی کام خود کرنے لگی تھیں۔ دونوں سے وہ کانتا کے کپڑوں کی طرف زیادہ دھیان دینے لگی تھیں۔ دونوں سے وہ کہیں کاجل سے کہیں سرے سے نوک پلک خود سنوارنے لگی تھیں۔

پھر اُس صبح کو جب گھر کے سامنے ایک ٹیکسی رُکی اور کانتا کو اپنی کھڑکی سے اس مری سڑک پر ہی اپنی آنکھوں کو جمانا پڑا۔ اس کے اُکھڑے ہوئے روڑوں پر اسے اپنے پتا جی کھڑے دکھائی دئے۔ دیکھتے ہی اس کے اپنے سینہ کی ہڈیوں میں ایک نئی جان سی لپکی اور وہ سیڑھیوں پر سے دوڑتی جکراتی نیچے آگئی۔

جب بادام کی بوری سیب کی پیٹیاں اور سب پوٹلیاں اور ڈبے اُوپر پہنچائے گئے تو کانتا کے ابا نے کانتا کی سجی سجائی مورتی کو دیکھا اور لمحہ بھر کے لئے اس کی سانس رُک گئی۔ کانتا کے چمک دار پلّے کے نیچے اس کی مانگ چوڑی ہو چکی تھی۔ اور اس کے گالوں کی نئی لکیروں میں اس کی ناک لمبی ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مُنہ کی پیلاہٹ گہرے پوڈر کے نیچے سے بھی جھانک رہی ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا۔ ہتھیلی میں گوشت تھا نہ گرمی۔ انگلیاں ٹھنڈی تھیں اور تھرائی ہوئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ان آنکھوں میں ایک گیلا گیلا جما ہوا تھا۔

کانتا کی ساس کانتا جی کی طبیعت کا حال سُنا رہی تھی۔ ایک میٹھی کہانی سی جس میں

پیار تھا، پریشانی تھی، دیکھ بھال تھی، دعائیں تھیں ـــــ اور جب یہ بتانے لگیں کہ کانتا جی کیلیے اب بادام گھسیں گے۔ سیب کہیں گے۔ کانتا کو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اپنے ابا کو وہیں چھوڑ کر اس اپنی کھڑکی پر آکھڑی ہوتی۔

کھڑکی کی ہوا کا اثر تھا کہ اس کے جمے ہوئے آنسو پگھل گئے، اور اس کی رکی ہوئی سسکی پھوٹ نکلی۔ اس کا باپ وہیں اس کے پاس آگیا اور اس سے پہلے کہ ساس پیچھے سے آواز دیتی اور کانتا عادت سے مجبور ہو کر اندر کھچ جاتی۔ کانتا نے ہچکیاں لے کر اپنے چمکتے ہوئے اور قیمتی پلّے کو منہ میں ٹھونس کر اپنی ایک انگلی اُٹھائی اور ایک ایسے منظر کی طرف اشارہ کیا جو اس کے باپ کے لئے نیا تھا۔ نیچے ایک گھوسی بھینس کے تھنوں کو ہاتھ سے بالٹی بھر رہا تھا۔ دوسرا اسی بھینس کے سامنے اس کے بچّے کی بھوس بھری کھال کو ایسے کھڑا کر رہا تھا کہ جیسے بھینس سے کہہ رہا ہو کہ لے یہ تیرا بچہ جو مرا نہیں ہے۔ بے چاری بھینس بچّے کی کھڑی کھال ہی کو چاٹ رہی تھی، اور گھوسی اپنی بالٹی بھرتا جا رہا تھا۔

راما نند ساگر

کشمیر کی بیٹی

اوڑی کے پاس ایک چھوٹا سا نالہ پونچھ کی پہاڑیوں سے نکل کر جہلم ندی میں آکر ملتا ہے۔ اس نالے کے اس طرف آج کل ہندوستانی سینا کا ڈیرا ہے اور دوسری طرف پاکستانی فوجوں کا پڑاؤ ہے۔ جنہوں نے سنہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر پر حملہ کر کے اس کے ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ کشمیر کے جس ٹکڑے پر پاکستان کا قبضہ ہے اُسے وہ لوگ آزاد کشمیر کہتے ہیں اور اوڑی کے پاس یہی چھوٹا سا نالہ کشمیر کے اُن دونوں ٹکڑوں کی سرحد بن گیا ہے۔

ایک اندھیری رات میں اُس نالے کے کنارے پہرہ دینے والا پاکستانی سپاہی جانے کس کی یاد میں ایک لوک گیت گن گنا رہا تھا:ـ

"چناوے تیری چاننی میرے یار نوں ڈراوے"

اپنے گاؤں سے سینکڑوں میل دور انجانے پہاڑوں کی سردی میں ٹھٹھرتا ہوا وہ کچھ اس طرح گا رہا تھا جیسے اُن لوگوں کی شکایت کر رہا ہو جن کی سیاسی چالوں نے اسے اپنے وطن پنجاب سے دور کر دیا تھا۔ نالے کے دوسری طرف ہندوستانی فوج کا سکھ سپاہی اپنی چوکی پر پہرہ دیتا ہوا اُس پنجابی دُھن کو سُن رہا تھا اور اس کے دل میں بہتوں پرانی یادیں بیدار ہو رہی تھیں جب اس کا اپنا گاؤں ملک کے بٹوارے کی نذر ہو کر پاکستان کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس نے ایک ہی وطن کے دو ساتھیوں کے درمیان ایک اندھیری کھڈ پیدا کر دی تھی۔ اور ان کے ہونٹوں سے ان کے مشترکہ رومانی گیت چھین کر

کس نے ان کے ہاتھوں میں انگریزوں کے کارخانے کی بنی ہوئی بندوقیں دے دی تھیں۔

پاکستانی سپاہی گاتا رہا۔ اور کہرے سے بھری ہوئی کھڈ کے دوسرے کنارے ہندوستانی سپاہی اپنے وطن کے سپنے دیکھتا رہا اور ان دونوں کو پتہ نہ چل سکا کہ ٹھیک اس وقت اس کہرے کی آڑ لے کر کالی لوئی میں لپٹا ہوا ایک پاکستانی جاسوس اس چھوٹے سے نالے کو پار کر کے ہندوستانی علاقے میں آ گیا تھا۔ اس کا نام حسن علی تھا۔ حسن علی بارہ مولہ کا رہنے والا تھا اور جب پاکستانی حملہ آوروں نے بارہ مولہ کو لوٹا تھا تو وہ اس وقت وہیں تھا۔ لیکن جب ہندوستانی فوجوں کے سامنے وہ لوگ پسپا ہو کر پیچھے ہٹ گئے تو حسن علی بھی بارہ مولہ سے گم ہو گیا بارہ مولہ کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس قتل عام میں کہیں مارا گیا تھا یا جب ان لٹیروں نے شہر کے بڑے حصے کو جلا کر راکھ کر دیا تو شاید اس میں وہ بھی جل گیا ہوگا۔ کیونکہ جس علاقے میں آگ کا بہت زور تھا۔ اس علاقے میں اس کی منگیتر نوراں رہتی تھی۔ اور بہت سوں کا یہی خیال تھا کہ وہ نوراں کو بچانے کے لئے ضرور وہاں گیا ہوگا۔ حتیٰ کہ نوراں کو بھی اس بات کا ناقابل برداشت دکھ تھا۔ کہ اسے بچانے کے لئے حسن علی خود جل کر خاک ہو گیا۔ اور وہ تڑپنے کے لئے زندہ رہ گئی۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ شہر کے بیچوں بیچ بہتی ہوئی جہلم ندی میں چھلانگ لگا کر دوسری دنیا میں حسن علی کے پاس پہنچنا چاہتی تھی مگر اس وقت پنڈت نیل کنٹھ نے اسے ایسا کرنے سے روک لیا تھا۔ پنڈت نیل کنٹھ نے ہی اسے جلتے ہوئے مکان سے بچا لیا تھا۔ پنڈت نیل کنٹھ کا مکان انہی کے محلے میں تھا اور نوراں کا باپ پنڈت نیل کنٹھ کے ہاں کام کرتا تھا جب پٹھان لٹیرے اس محلے میں پہنچے اور نیل کنٹھ کا بڑا مکان دیکھ کر اسے لوٹنے لگے تو نوراں کے باپ نے اس وقت تک ان کو ڈیوڑھی میں روکے رکھا جب تک کہ پنڈت نیل کنٹھ اور اس کے بال بچے پچھلی کھڑکی سے کود کر ایک مسلمان ہمسائے کے مکان میں چھپ گئے۔ اس دھوکے بازی پر غصہ کھا کر پٹھانوں نے نوراں کے بوڑھے باپ کو وہیں گولی مار دی اور سارے محلے میں آگ لگا دی۔ اس افراتفری میں کسی طرح نیل کنٹھ اپنے بیوی بچوں سمیت گھاٹ تک پہنچ گئے اور ایک کشتی میں بیٹھ کر

دریا کے راستے شہر سے دُور نکل گئے لیکن کشتی کھولنے سے پہلے ہی وہ اپنی بیوی کو یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ اگر میرے لوٹنے سے پہلے پٹھان یہاں آجائیں تو کشتی کھول کر وتستا میاں کی لہروں پر چھوڑ دینا۔ وہ چاہے حفاظت سے کسی کنارے لگا دے چاہے اپنی لہروں کی گود میں تمہیں چھپالے۔ مگر تمہاری لاج ضرور بچالے گی۔" اور وہ خود نوراں کے مکان تک جا پہنچے، اور اس جلتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے گذر کر دھوئیں کے مارے بے ہوش ہو گئی نوراں کو اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر واپس گھاٹ تک پہنچے۔ خوش قسمتی سے پٹھان اس گھاٹ تک نہیں پہنچے تھے۔ اور اس طرح پنڈت نیل کنٹھ کے بچوں کے ساتھ نوراں کی زندگی اور آبرو دونوں بچ گئیں۔

جب ان کی کشتی بانڈی پور پہنچی تب انہیں ہندوستانی فوج کے آنے اور بارہمولہ کے آزاد ہونے کی خبر ملی۔ بارہمولہ میں لوٹنے کے بعد پنڈت نیل کنٹھ نے حسن علی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تاکہ نوراں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں۔ لیکن حسن علی کہاں تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب نوراں خودکشی کرنے پر تیار ہو گئی۔ مگر اس وقت بھی پنڈت نیل کنٹھ نے اس کی جان بچائی اور اُسے سمجھایا کہ خدا نے زندگی مرنے کے لئے نہیں دی بلکہ اس لئے دی ہے کہ اس کی مدد سے کائنات کو زیادہ سے زیادہ حسین بنایا جائے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔

نوراں نے بھری ہوئی آواز میں کہا ——— "مگر میرے لئے زندگی کا حُسن کس کام کا ہے ——— ؟"

بوڑھے نیل کنٹھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "تو کیا ہوا بیٹی ——— تمہارے کسی کام کی نہیں تو یہ زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دو۔ جس زندگی کو تم موت کے اندھیرے میں کھو دینا چاہتی ہو، وہی زندگی تم وطن کے حوالے کر سکتی ہو۔ تم چاہو تو یہ زندگی کتنے ہی دکھی دلوں میں اُمید کی روشنی بھر سکتی ہے۔ تم نوراں ہو تو چاروں طرف نُور پھیلاؤ۔ موت کا اندھیرا کیوں بڑھاتی ہو۔"

بوڑھے کی بات نوراں کے دل میں گھر کر گئی اور تب اس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ کشمیر کی نیشنل ملیشیا میں داخل ہو گئی۔ جہاں اس نے اپنے وطن کی حفاظت کیلئے

رائفل تک چلانا سیکھ لیا۔ اس نے اوّل رات کے سکولوں میں جاکر خود لکھنا پڑھنا سیکھا اور پھر اپنے جیسی ہزاروں پچھڑی ہوئی کشمیری عورتوں کی خاطر ان کے محلوں اور گھروں میں جاکر علم کی روشنی پھیلانی شروع کی۔ اور تب اُس نے دیکھا کہ اس کام میں وہ اکیلی نہیں ہے بلکہ کشمیر کی وادی میں جہاں صدیوں سے جہالت کے اندھیرے نے ایک بزدلانہ سی سستی طاری کر رکھی تھی وہاں چند سالوں میں چاروں طرف ایسی ہی ہزاروں روشنیاں ٹمٹمانے لگی ہیں۔ جاہل کہلانے والے کشمیری یا تو گویا لمبی نیند سے بیدار ہو رہے ہیں، اب وہ نہ صرف پڑوسیوں سے نہیں ڈرتے بلکہ خود اپنے دیس والے بھی ان کے اندھے اعتقاد کا جائز فائدہ اُٹھاکر اُنہیں بدھو نہیں بنا سکتے۔ انہوں نے نہ صرف پردیسی راجاؤں سے اپنا تاج و تخت چھین لیا ہے بلکہ اگر شیخ عبداللہ جیسا ان کا اپنا راہنما ذاتی لالچ میں اندھا ہو کر خود بادشاہ بننے کے لئے کشمیر کا مفاد بیچنا چاہے تو وہ اُسے بھی پل کے پل میں نیچے کھینچ کر جنتا کی عدالت کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا کر سکتے ہیں۔ اس تاریخی بیداری میں نوراں جیسی جنتا کے عام انسانوں کا بھی اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا جنتا کے نیتاؤں کا حصّہ تھا۔ چنانچہ نوراں اپنے آپ کو کشمیر کی نئی تاریخ کا ایک حصّہ سمجھنے لگی تھی۔

یہ سب کچھ تھا مگر حسن علی کی جُدائی کے غم نے ہی اُسے دوسروں کے دُکھ کا ساتھی بنا دیا چنانچہ ان سات برسوں میں اُسے کسی اور مرد کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ حسن علی سے اب مرنے کے بعد ہی ملاقات ہوگی اور اسی ملاقات کے لئے وہ اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھتی تھی۔ لیکن جب اسی دُنیا میں اچانک ایک دن نُور کے تڑکے حسن علی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو نوراں کا یہ حال تھا جیسے کسی پر اچانک بجلی گر جائے۔ تھوڑی دیر تو اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا، مگر جب حسن علی نے اُسی پُرانے انداز میں اُسے پیارسے پکارا "نوراں" تو وہ کسی ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح حسن علی کے سینے پر گر گئی اور پھر یوں معلوم ہوا جیسے جہلم ندی کا سارا پانی اُس کی آنکھوں میں اُمڈ آیا۔ وہ نیشنل ملیشیا کی پریڈ میں جانے کے لئے بہت سویرے اُٹھتی تھی۔ مگر حسن علی کے آ جانے سے وہ اپنی ساری تیاری بھول گئی۔ حسن علی نے اُسے بتایا کہ وہ رات بھر اوڑی سے بارہ مولہ تک پیدل چلتا

رہا ہے۔

بیرونی کے بارے حسن علی کا سارا بدن ٹھٹھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے جو ادنی لوئی لپیٹ رکھی تھی وہ برف کی ایک چادر معلوم ہوتی تھی چنانچہ نوراں نے فوراً سماوار میں کوئلے بھرے اور چائے میں ڈالنے کے لئے بادام کوٹنے لگی۔ اور کام کرتی جارہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی ہورہی تھیں۔

حسن علی نے اُسے بتایا کہ پٹھان حملہ آور اُسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور کہ اتنے برس وہ پاکستانی علاقے میں رہا۔

نوراں نے پوچھا ــــــ "تو جیل سے کس طرح بھاگے"۔

حسن علی نے مسکرا کر کہا ــــــ "میں جیل میں تو نہیں تھا"۔

"جیل میں نہیں تھے تو پھر زبردستی کسی مزدوری پر لگایا گیا ہوگا"۔

"نہیں"

"تو پھر وہاں کیا کرتے تھے ــــــ؟"

"بس آزادی سے گھومتا تھا"۔

نوراں سماوار میں ڈالنے کے لئے سبز چائے کی پتیاں ہتھیلی میں مل رہی تھی حسن علی کا جواب سُن کر اُس کے ہاتھ وہیں رُک گئے۔ وہ غور سے حسن علی کو دیکھنے لگی جس کے ہونٹوں پر اب تک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک جیسے وہ حسن علی کی مسکراہٹ تولتی رہی اور پھر........ خود بھی مسکرانے لگی۔ اس نے سماوار کے اُبلتے پانی میں چائے کی پتیاں ڈال دیں اور حسن علی کے قریب آکر اُسے پیار سے دیکھتی ہوئی بولی ــــــ "تم سے مجھے اسی بہادری کی اُمید تھی کہ تم اپنی مصیبتوں کا ذکر مجھ سے کبھی نہیں کروگے اور میرے سوالوں کو ہنس کر ٹال جاؤ گے۔ لیکن اب میں ایسی بدھو نہیں ہوں جیسی تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔ اب کشمیر نیا کشمیر بن رہا ہے۔ اور ہم لوگوں کو دنیا بھر کی سیاسی چالوں کی خبر ہے۔ کیونکہ دنیا کے بہت سے ملک ہمارے کشمیر کے بارے میں طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں ــــــ میں جانتی ہوں کہ کشمیر کا سچا سپوت جو پاکستانی لیٹروں کا ساتھی بننا منظور نہ کرے اُسے وہ جیل کے سوا کہیں نہیں رکھ سکتے

تم ضرور اُن کی جیل سے بھاگے ہو اور مجھے تمہاری بہادری پر ناز ہے ——"

حسن علی نے کچھ جواب دینا چاہا مگر نوراں نے پیار سے اُس کا مُنہ بند کر دیا اور کہنے لگی کہ "اب اور جھوٹ میں تمہارے مُنہ سے نہیں سُننا چاہتی۔ چائے تیار ہو گئی ہے میں تمہارے لئے قتلم لے آتی ہوں ——"

اور وہ مُسکراتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ گلی کے موڑ پر حسنہ نانبائی کی دُکان اب تک کھُل گئی تھی۔ نوراں نے دو قتلمے خریدے تو حسنہ نے پُوچھا —— "نوراں۔ کون مہمان آیا ہے جس کے لئے قتلمے خرید رہی ہو"

نوراں نے کہا —— "حسن علی پاکستانیوں کی جیل سے بھاگ کر آ گیا ہے" اور اس کا مُنہ نہ جانے کیوں ناز کے مارے سُرخ ہو گیا۔

حسنہ نانبائی اور اس کی دکان پر بیٹھے ہوئے دو گاہک اس خبر سے چونک پڑے اور اُنھوں نے بہت سے سوال پُوچھے جن کے من گھڑت جواب دے کر نوراں وہاں سے اپنے مکان کی طرف بھاگی اُس نے من ہی من میں حسن علی کی بہادری کا جو نقشہ بنا لیا تھا اس میں جیسے ایک نشہ تھا۔ اور اُس پنچھی کی طرح جسے ایک مدت تک پنجرے میں بند رکھنے کے بعد اچانک ہوا میں چھوڑ دیا جائے۔ نوراں کا من کبھی اپنے پنکھ کھول کر ایک اُڑان بھرتا لیکن فوراً اُڑنے سے پہلے ہی جیسے کسی سنکوچ کے مارے وہ پنکھ خود بخود بند ہو جاتے۔ اس کا من جیسے کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا اور واپس آ کر اس نے حسن علی کو چینی کے پیالے میں اُبلتی ہوئی چائے پلائی۔ قتلمہ کھلایا اور خود جلدی جلدی کہیں جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو ——" حسن علی نے پُوچھا

"آج ہماری نیشنل ملیشیا کی پریڈ ہے ——" نوراں نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں اس پریڈ سے کیا لینا ہے۔ اب تو میں آ گیا ہوں ——"

"ایک تم ان کی جیل سے آزاد ہو کر بھاگ آئے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس علاقے میں رہنے والے ہمارے سارے کشمیری آزاد ہو گئے ہیں۔ جب تک ہم اپنا چھینا ہوا علاقہ

اِن حملہ آوروں سے واپس نہ لے لیں ہم مادرِ کشمیر کے قرض کو بھول نہیں سکتے۔

جوں جوں وہ گھاٹی میں اُترتے گئے انہیں موڑ کے دونوں طرف دُور دُور تک سڑک دکھائی دینے لگی تھی۔ اپنی اپنی جگہ کھڑے والنٹیروں کی سُرخ جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر نوراں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی اپنی جھنڈی اس پُل کے اُوپر بڑی تمکنت سے لہرا رہی تھی جس کے نیچے حسن علی کا رکھا ہوا بم ایک وحشیانہ قہقہہ لگانے کے انتظار میں تھا اور حسن علی اس کے آگے آگے پستول تھامے پتھر سے نیچے اُتر رہا تھا۔

اچانک نوراں نے ایک جست لگائی اور حسن علی کے اُوپر دھڑام سے گر گئی۔ حسن علی لڑکھڑا کر گر گیا لیکن فوراً تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر اتنی دیر میں اس کے ہاتھ سے گرا ہوا پستول نوراں کے ہاتھ آ چکا تھا۔ نوراں زمین سے اُٹھ ہی رہی تھی کہ حسن علی نے پتھر اُٹھا کر اس کے ماتھے پر دے مارا مگر نوراں کی اُنگلیاں بھی اس سے بھی تیز تھیں۔ ادھر نوراں کو پتھر لگا اور اُدھر پستول کی گولی حسن علی کے سینے کے پار ہو گئی، اور وہ پانی کے کنارے جا گرا۔

نوراں کا سر پتھر کی چوٹ سے جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ خون نے اس کی آنکھوں کے آگے ایک سُرخ پردہ ڈال دیا تھا اور اندھیرا چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا لیکن اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو جمع کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پستول کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھی۔ حسن علی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لوہے کی تار اس کے گرنے سے اس طرح کھینچی گئی تھی کہ پُل کے نیچے رکھا ہوا بم شور مچاتے ہوئے نالے میں گر کر اس طرح پھٹا کہ ایک اور آواز چاروں طرف گونج گئی۔ لیکن پُل سلامت تھا اور نالے کی دودھیا لہریں اس بم کی مایوسی پر قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھیں۔

مرنے سے پہلے اس نے صرف اتنا کہا کہ جس حسن علی کی گود میں لیٹ کر کل رات وہ شادی کے سہانے سپنے دیکھتی رہی تھی، اسی حسن علی کی لاش کو گود میں لے کر پانی میں کس طرح دھکیلتی ہوئی وہ جہلم ندی کی لپکتی ہوئی لہروں تک پہنچ گئی۔

جب والنٹیر وہاں پہنچے تو اُنھوں نے کسی کو بھی وہاں نہیں دیکھا۔ اسی وقت

سرکاری موٹریں وہاں پہنچ گئیں۔ سب والنٹیروں نے جھنڈیاں اُٹھا کر کشمیر زندہ باد کے نعرے لگائے۔

جہلم کی لہروں پر سوار نورآں کا جسم ان سرحدوں کو پار کر کے ایک فاتحانہ انداز سے اس علاقہ میں آگے بڑھ رہا تھا جس پر دُشمنوں کا قبضہ تھا۔ خُون نے اس کے چاروں طرف پانی کی لہروں کو اس طرح رنگ دیا تھا گویا نیا کشمیر کا سُرخ جھنڈا کشمیر کی ایک بہادر بیٹی کے اعزاز میں لہرا رہا ہو ۔

کنول نین پرواز

امن کی طرف

ہارویچ سے ہوک آف ہالینڈ کے لئے روانہ ہونے والے جہاز کے اُوپر والے ڈیک کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے جب رات کے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے برطانوی ساحل سے میری نظریں کھسکتی ہوئی پاس ہی کھڑے ایک ڈچ جوان پر جم گئیں تو پہلا سوال جو میں نے پُوچھا وہ یہی عام سا سوال تھا جو ہر سیاح ہالینڈ جاتے ہوئے اپنے ذہن میں لائے گا ــــــ
”کیا اب بھی آپ کے دیش کے لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں؟“

چھ فٹ اور چھ انچ کے قد پر پھیلا ہوا نوجوان میری طرف دیکھ کر مُسکرایا اور پھر آہستہ سے ہنس دیا ــــــ ”اگر میں کہوں کہ یہ جھوٹ ہے تو ــــــ ؟“

”اول تو تمہارے جوتوں کی طرف دیکھ کر ــــ“ میں نے کہا ــــ ”اس بات کا ثبوت نہیں ملتا۔ دوسرے میں خود ہالینڈ جا رہا ہوں، اس لئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا کہ اِس میں کہاں تک صداقت ہے۔“

نوجوان نے بڑی نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا ــــ ”ہمارے دیش میں اور بھی کئی ایسی چیزیں ہیں جو آپ کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مگر اُن کا ذکر نیویارک کے ٹورسٹ آفس سے چھپنے والے لٹریچر میں نہیں ہوتا۔ ایک خاص پالیسی کے پیشِ نظر اِن چیزوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے مگر سچائی کسی پالیسی کی آڑ نہیں لیتی خود بخود سامنے آجاتی ہے۔“

ڈچ نوجوان نے نیویارک کا نام اس لئے لیا تھا کہ میں وہیں سے آ رہا تھا اور

کچھ دیر تک تو وہ مجھے "تم امریکی" کہہ کر بولتا رہا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں خالص ہندوستانی ہوں اور امریکہ سے اپنے دیش لوٹتے وقت ہالینڈ کا دورہ کرنے جا رہا ہوں تو اُس کے چہرے پر حیرانی کی ایک لمبی لکیر نہیں اُبھری بلکہ وہ مُسکرا کر بولا ——— "مجھے تمہاری باتوں کے انداز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم امریکی نہیں ہو لیکن میں پھر بھی خود کو دھوکا دیتا رہا ———"

پہلی ملاقات سے اب تک نوجوان نے باتیں بہت کم کی تھیں۔ شروع شروع میں تو اُس نے ہوں ہوں تک ہی اکتفا کی لیکن ڈیک پر اُس کی یہ سیدھی سادی باتیں سُن کر اُس کی شخصیت مجھے اور بھی دلچسپ نظر آنے لگی۔ اس کے علاوہ ہم دونوں جہاز کے ایک ہی کیبن میں پناہ گزین تھے۔ اس لئے یہ اور بھی ضروری تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جاننے کی زیادہ کوشش کریں۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے اور چار ہزار ٹن کا مختصر سا جہاز آہستہ آہستہ رودبار انگلستان کی لہروں پر ڈولتا ہوا رات کے اندھیرے کو چیرتا ہوا ہالینڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہم دونوں دیر تک ڈیک پر گھومتے رہے۔ سگریٹ پیتے رہے باتیں کرتے رہے لیکن فروری کی تیز اور سرد ہوا ہمارے کپڑوں کو کچھ اس طرح اُچھال رہی تھی جیسے اُسے ہمارا یوں گھومنا، سگریٹ پینا اور باتیں کرنا پسند نہ ہو۔ ڈچ نوجوان بولا ——— "سردی زیادہ ہے آئیے بار میں چلیں۔ کیا آپ کو پینے کا شوق ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ دیر بعد ہم بار میں تھے۔ بار میں بہت کم لوگ تھے اور جو تھے اُن کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی اپنے لئے کیبن میں جانے کی فکر میں ہوں۔ خیال بُرا نہیں تھا کیونکہ انگلستان کے مختلف شہروں سے روانہ ہونے والے مُسافر بڑی دیر تک اُس گاڑی میں اُونگھتے رہے تھے جو انہیں ہارویچ سے لے آئی تھی اور صبح جلدی اُٹھنا تھا کیونکہ جہاز کے پہنچنے کا وقت پانچ بجے بتایا گیا تھا۔ نیند سے بھری آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں مگر نوجوان کی باتوں نے مجھے اونگھنے سے بچا لیا۔

نوجوان جسم کے لحاظ سے کافی تنومند معلوم ہوتا تھا لیکن کنپٹوں کے قریب سے

گزرتی ہوئی سفید بالوں کی سفید دھاریوں کی وجہ سے اُس کے چہرے میں ایک گھمبیرتا اور اُداسی کی جھلک ملتی تھی۔ اُس کا چہرہ بڑا سخت اور کھُردرا تھا اور دائیں گال پر چوٹ کا گہرا نشان۔ اُس کے چہرے سے میں نے اُس کی عُمر کا اندازہ لگایا کہ وہ لگ بھگ چالیس[۴۰] برس کے قریب ہے۔

اُس کی باتوں میں کوئی فلسفیانہ نکتہ نہ تھا اور باتیں کرنے کا انداز بھی ایسا نہیں تھا جس سے اُس کے تعلیم یافتہ ہونے کا گمان ہو۔ اِس لئے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ کسی فیکٹری میں کام کرنے والا مزدور ہے۔

مجھ سے رہا نہ گیا اس لئے میں نے پُوچھ ہی لیا ـــــ "اگر اعتراض نہ ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

"کہئے ـــــ" وہ گلاس کو مُنہ تک لے جاتے ہوئے آخری گھونٹ چڑھاتے ہوئے بولا ـــ

"میں آپ کی عُمر اور پیشے کے بارے میں سوچ رہا ہوں؟"

"کیا سوچا ہے آپ نے؟"

میرا خیال ہے کہ آپ چالیس[۴۰] یا پینتیس[۳۵] برس کے قریب ہیں۔ اور آپ کسی فیکٹری میں کام کرتے ہیں؟"

وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ کُرسی میں یوں بیٹھ گیا جیسے اُس کا قد ایک دم سکڑ کر رہ گیا ہو ـــــ "آپ کا اندازہ کسی حد تک صحیح ہے ـــ" اُس نے نظریں نہیں اُٹھائیں بلکہ خالی گلاس کی طرف ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا رہا جیسے کسی شدید غم کا احساس ہو رہا ہو ـــــ

"ایک پیگ اور ـــــ" میں نے پُوچھا

"جی نہیں ـــــ" اُس نے گلاس سے نظریں اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

"جب مُجھ سے کوئی میری عُمر اور پیشے کے بارے میں پوچھتا ہے تو میری عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے کچھ عرصے سے میں زیادہ جذباتی بن گیا

ہوں۔ میں دو برس بعد اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ آپ کے چہرے کی طرف دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ دیس لوٹتے ہوئے کتنے خوش ہیں۔ مگر میرے لئے زندگی کی سب خوشیاں مر گئی ہیں ——" اور وہ چُپ ہو گیا۔

میں کچھ دیر چُپ رہا اور اِس انتظار میں تھا کہ وہ آگے بھی کچھ کہے گا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا —— اُسے خاموش دیکھ کر میں نے پھر مشورہ دیا —— "ایک پیگ اور میری خاطر ——"

مگر اُس نے جیسے میری بات نہیں سُنی۔ خالی گلاس کو مُنہ سے لگاتے ہوئے بولا —— "یہ کوریا کی لڑائی ختم نہیں ہو گی —— ؟"

میں اِس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ اِس لئے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے بولا —— "میں نے آپ کے پیشے اور عمر کے بارے میں ایک سوال کیا تھا، جس کے جواب میں یہ کہا کہ آپ کو اپنے دیش جانے پر کوئی خوشی نہیں۔ یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ کیا آپ ولایت میں زیادہ خوش تھے ——"

میرے اس سوال سے اُس کے ماتھے پر تھر کنے والی تیوری اور بھی گہری ہو گئی۔ دائیں گال پر زخم کا نشان جیسے اچانک اُبھر آیا۔ اُس وقت وہ مجھے کسی انگریزی فلم کا جاسوس معلوم ہوتا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہو گا اور کمرے میں ٹہلنا شروع کرے گا اور پھر ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھ کر کہے گا ——

"یہ ایک طویل کہانی ہے۔ میں اِس کہانی کا ہیرو بھی ہوں اور ولین بھی ——" مگر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا تک نہیں۔ صرف میری طرف ایک نظر سے دیکھا اور بولا —— "مجھے جنگ سے نفرت ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نوجوان کی اِس بات کا کیا جواب دوں —— ہاں میں ہاں ملانے کے خیال سے میں بولا —— "جنگ کو ہر انسان ناپسند کرتا ہے، جنگ سے لوگوں کا نقصان ہوتا ہے۔"

"اور سامراج کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔" وہ جیسے میری بات کو آگے بڑھاتے

ہوئے بولا۔

میں نے پھر اپنے مُنہ کو کچھ اِس انداز سے حرکت دی جس سے ظاہر ہو کہ صاحب آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

میری خواہش تھی کہ میں اُس کے ساتھ گھُل مل جاؤں تاکہ اُس کے بارے میں اور اُس کے دیش کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر سکوں لیکن وہ ایک بات کرنے کے بعد ایک پُراسرار طریقے سے خاموش ہو گیا۔ پھر لمحہ بھر کے بعد میرے چہرے کی طرف یوں دیکھا جیسے میرا ذہن ٹٹول رہا ہو۔ میں اُس کی دِل چسپی بڑھانے کے لئے بولا ——

"میں نے آپ کا دیش نہیں دیکھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے آپ کے مُلک سے غائبانہ پیار ہو گیا ہے۔ ہالینڈ بہت شاندار مُلک ہے۔ دُور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں پن چکیاں اور امسٹرڈم کی نہریں اور ——"

"ہندوستان بھی بہت اچھا دیش معلوم ہوتا ہے ——" وہ میری بات کاٹ کر بولا —— "مجھے بھی آپ کا دیش بہت پسند ہے، اِس لئے کہ آپ شانتی چاہتے ہیں ——"

"آپ ہالینڈ والے شانتی نہیں چاہتے کیا —— ؟"

"ہالینڈ والے ——" الفاظ جیسے اُس کے مُنہ میں ٹوٹ رہے تھے۔

"آپ کا اِشارہ شاید عوام کی طرف ہے ——"

"آپ لوگوں نے ——" میں بات کو صاف کرتے ہوئے بولا —— "جنگ کے دوران میں بہت نقصان اُٹھایا ہے ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو جنگ سے نفرت ہے۔ ہندوستان اگرچہ براہِ راست جنگ کی لپیٹ میں نہیں آیا لیکن خوں ریزی اور بربادی کا ڈرامہ تو ہم بھی دیکھ چُکے ہیں اور جب یہ چیزیں بڑے پیمانے پر شروع ہو جائیں تو تہذیب کے چشمے سُوکھ جاتے ہیں۔"

"مگر کوریا کا کیا ہو گا ——" اُس نے یہ بات کچھ اِس طرح دہرائی جیسے روتا ہوا بچہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو جائے اور پھر کھلونوں اور مٹھائی کا دھیان

آتے ہی زور زور سے رونا شروع کر دے ــــــ کیا بربادی کا کھیل وہاں اسی طرح سے جاری رہے گا؟"

اس نے پھر ایک سیدھا سا سوال پُوچھا تھا۔ لیکن جواب دیتے ہوئے میں اس لئے بھی گھبرایا کہ کہیں اس کی قومی حس کو ٹھیس نہ لگے۔ میں اس کے ملک جا رہا تھا۔ اس لئے مغربی نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے میری ذمّہ داریاں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ میں نے بات کو بڑے ڈپلومیٹک طریقے سے پیش کرتے ہوئے کہا ــــــ "آج کوریا میں جو ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس قسم کا تماشہ ہم پہلے بھی انڈونیشیا میں دیکھ چکے ہیں۔ ملایا اور ویٹ نام بھی اس ڈرامے کی مختلف کڑیاں ہیں۔"

انڈونیشیا کے نقطۂ نظر پر وہ چونک پڑا ــــــ "انڈونیشیا میں جو کچھ ہوا ہے امن اور آزادی چاہنے والا ہر شخص اُس کی مذمت کرے گا ــــــ" وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ــــــ "میں اُن دنوں لندن میں تھا۔ ہمارے دیش نے اس وقت جو کچھ کیا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ یو۔ این۔ او میں آزادی اور امن کے نعرے لگانے والے اُس وقت خاموش تھے ــــــ" اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ مجھے لمحہ بھر کے لئے احساس ہوا جیسے وہ کمیونسٹ ہو۔

کمیونسٹ کہہ رہا تھا ــــــ "میں نے دوسری جنگ عظیم دیکھی ہے مجھے فوجی زندگی سے نفرت ہے لیکن جب نازی درندوں نے ہمارے مُلک پر حملہ کیا تو اس وقت کوئی نوجوان چُپ نہ بیٹھ سکتا تھا۔ جب پہلی جنگ ختم ہوئی تو میرے باپ نے کہا تھا ــــــ "بیٹا اب دُنیا میں امن ہو گا ــــــ" مگر دوسری جنگ ہوئی اور ابھی اس کے زخم پُوری طرح سے مُندمل نہیں ہوئے کہ تیسری جنگ کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ یہ دیکھو زخم کا گہرا نشان ــــــ" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا اور ٹانگوں سے پتلون اُوپر کر دی ــــــ "اور یہ میری ٹانگ دیکھو اس میں گوشت نہیں۔ خون نہیں۔ احساس نہیں لیکن دل میں اس کا درد ہے۔"

حسرت ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا ——— "میں ایک سیدھا سادہ انسان ہوں۔ فیکٹری میں کام کرنے والا مزدور ہوں۔ میں نے سیاسیات کی موٹی موٹی کتابیں نہیں پڑھیں۔ لیکن میری آنکھوں نے جنگ کے جو خونیں منظر دیکھے ہیں انہیں پھر دیکھنے کی اب تاب نہیں۔ اس جنگ نے مجھ سے میرا گھر ہی نہیں چھینا میرا روزگار چھینا ہے، میری ٹانگ چھینی ہے۔ مجھے دس برس بوڑھا کر دیا ہے۔......" یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا۔ اُس کی آواز بھرآئی تھی۔ وہ خالی گلاس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اچانک اُسے سکاچ کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ اُس کے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار ہویدا تھے اور آنکھیں بھیگ گئی تھیں ——— مگر شاید اُسے آرام کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بولنا چاہتا تھا ——— وہ بول رہا تھا ——— "میں نے پچھلے چند برسوں میں کیا کچھ نہیں کیا۔ بیکری میں کام کیا ہے۔ مزدوری کی ہے۔ محاذ پر لڑا ہوں۔ ہم ایک اُونچے آدرش کے لئے لڑ رہے تھے۔ ایک بہتر نظام زندگی کی خاطر، کہاں ہے وہ زندگی ——— !اِس کی جگہ تیسری جنگ منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ زندگی کے ہر لمحے کی قیمت ڈال دی گئی ہے۔

آپ لندن کیوں گئے تھے؟

"روزگار ڈھونڈنے ———" اس نے بڑی صفائی سے جواب دیا ——— "شہر میں جس فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہاں اکثر ہڑتالیں ہوجاتی تھیں اور ان جھگڑوں کے لئے مجھے ہی ذمہ دار ٹھہرایا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن میں میرا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔ آخر کار میں تنگ آکر گاؤں میں بڑے بھائی کے پاس چلا آیا۔ مگر اُس کے پاس اتنی کم زمین تھی کہ مشکل سے اُس کی اپنی گذر ہوتی تھی ———" اُس کی آواز دھیمی پڑ گئی لندن میں میری محبوبہ تھی۔ اُس سے ملنے کی بھی مجھے آرزو تھی اور ساتھ ہی کام مل جانے کی اُمید تھی۔

"وہاں آپ کو کام مل گیا ——— ؟"

"کام مل گیا مگر محبوبہ نہیں ملی" ——— اُس کی نظریں ڈولتے ہوئے ریشمی پردوں

میں کھو گئیں.

" آپ ہالینڈ جا کر کیا کریں گے —؟"

"میں خود نہیں جانتا —— ؟" اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں.

میں نے قریب سے اخبار اُٹھایا. جنگ تیز ہو رہی تھی. کوریا کی جنگ. جنگ کی تصویریں، گولہ باری، بمباری، ہوائی جہاز، توپیں، ٹینک اور برف باری —— قدرت کی سفیدی پر...... آسمان کی سفیدی پر...... انسان کی سفیدی پر سیاہ چادر کا غلاف ڈال دیا گیا تھا تاکہ حُسن چھُپ جائے. زندگی چھُپ جائے —— ریشمی پردے ڈول رہے تھے. جہاز کے اندر اور باہر روشنی تھی، ہوا تھی —— فروری کی سردی اور ہوا شائیں شائیں —— سمندر کی شائیں شائیں —— جہاز سمندر کی سطح پر کسی معصوم کھلونے کی طرح ڈول رہا تھا. رات کے اندھیرے میں کسی تارپیڈو کے ڈر سے بے خبر —— باہر ہوا تھی اور اندر سٹیم ہیٹ اور خاموشی اور سکاچ، لیکن اس خاموشی، حرارت اور زندگی سے بھی جس سے شائیں شائیں کی آواز آ رہی تھی —— یہ ڈچ نوجوان کی زندگی کی شائیں شائیں تھیں. وہ نوجوان جسے جنگ سے نفرت تھی اور جس نے زندگی سے پیار کرنا چاہا تھا لیکن اس پیار کے بدلے میں اُس کی ٹانگ چھین لی گئی تھی. اس کا روزگار چھین لیا گیا اور اس کی محبوبہ چھین لی گئی تھی — کیا وہ نوجوان اب کبھی بیدار نہ ہو گا —— اس کی بند آنکھوں کی طرف دیکھ کر مجھے خیال آیا — !

میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں. بار خالی ہو چکا تھا اور کلاک کے بازو وقت کے ساتھ دوڑنے کے بعد اب اُس نقطے پر پہنچ گئے تھے جہاں رات کی تاریکی صبح کی سرحد میں داخل ہو رہی تھی —— "بارہ بج گئے ہیں —" میں نے اونچی آواز میں کہا

اُس نے آنکھیں کھولیں مگر نہ کلاک کی طرف دیکھا اور نہ میری طرف —— اُس نے پھر ایک سوال کیا —— " امریکہ میں زندگی کیسی ہے ؟"

"پیسہ ہو تو بُری نہیں."

"پیسہ ——" وہ طنزیہ ہنس کر بولا —— " پیسے کی شرط آپ نے خوب رکھی ہے.

وہاں لوگ جنگ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں —"

اِس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ نیویارک سے لندن واپس آتے ہوئے جہاز پر میری چند امریکی نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں، میں نے اُن کے یورپ کے سفر کے بارے میں پوچھا —— تو ایک نوجوان کہنے لگا —— "میں کاروبار کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں —" دوسرا بولا —— "لندن میں میری بہن ہے اُس سے ملنے جا رہا ہوں ——" کسی نے فرانس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اور کسی نے جرمنی میں اپنی محبوبہ سے ملنے کا بہانہ بتایا۔ لیکن جب میں نے جبری بھرتی کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے —— "خدا کے لئے جنگ کا نام مت لو ——" اُن میں سے ایک، پچھلی جنگِ عظیم میں یورپ کی لڑائی دیکھ چکا تھا، کہنے لگا —— "توبہ جنگ کے خونی منظر یاد آتے ہیں تو اب بھی دل کانپ اُٹھتا ہے۔ جبری بھرتی ہو یا نہ ہو ہم تو دور جا رہے ہیں۔

جب میں نے یہ قصہ ڈچ نوجوان کو سنایا تو کہنے لگا —— "آپ کا قصہ سُن کر مجھے بھی لطیفہ قسم کی ایک بات یاد آ گئی —— کسی نے ایک امریکن سے امریکہ کے دارالخلافے کے بارے میں پوچھا تو اُس نے جواب دیا —— SOME WHERE ON THE CONTINENT —— اِسے لطیفہ کہئے یا کچھ اور ——"

میں پہلے بھی سُن چکا تھا لیکن اس وقت ڈچ نوجوان نے جس سلیقے سے اسے میری بات کے ساتھ جوڑ دیا۔ اُس پر میں اُس کے حُسنِ ظن کی داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا —— "میرا خیال ہے کہ آپ کے دیش میں بھی فوجوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور اطلانتک معاہدے میں آپ کا بھی ہاتھ ہے ——"

اُس نے جواب نہیں دیا۔ شاید وہ جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا —— "آیئے چلتے ہیں، نیند آ رہی ہے اور پھر جلدی اُٹھنا بھی ہے"

ہم دونوں کارے ڈور سے گزر کر نچلے ڈیک پر آ گئے۔ جب ہم کارے ڈور سے گزر رہے تھے تو وہ اچانک ایک کیبن کے سامنے رک گیا۔ کیبن کا دروازہ بند نہیں تھا مگر پردے نے اُسے پوری طرح ڈھک دیا تھا۔ اندر سے ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ان باتوں میں زنانہ ہنسی غالب تھی۔ اُس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا اور آنکھوں میں ایک گہری کالی لکیر پھیلتی چلی گئی۔ بس پل بھر کے لئے ـــــ اور دوسرے لمحے ہم اپنے کیبن میں تھے۔

کپڑے بدل کر ہم اپنے بستر میں گھس گئے۔ میں نے اپنے بستر کی بتی بجھا دی مگر اُس نے اپنی بتی جلتے رہنے کی درخواست کی ـــــ کہنے لگا ـــــ "مجھے اب اندھیرے میں نیند نہیں آتی ـــ" وہ دیر تک چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر خود بول اُٹھا ـــــ "مجھے ہالینڈ واپس جانے کی کوئی خوشی نہیں۔ مگر لندن چھوڑنے کا بھی مجھے کوئی افسوس نہیں۔ اب تو مجھے لندن سے نفرت سی ہو چکی ہے۔ مگر انگریز عورتوں سے سخت نفرت ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر بولا ـــــ "جنگ کے دوران میں مجھے ایک انگریز لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ جب لندن میں اُسے میری نقلی ٹانگ کا پتہ چلا تو وہ بدل گئی۔"

"آپ اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔"

"ہاں ـــــ" اور مجھے احساس ہوا جیسے یہ 'ہاں' اُس کے گلے میں دم توڑ رہی ہو۔

"مجھے جنگ سے نفرت ہے۔ مجھے عورتوں سے نفرت ہے۔"

اس کے بعد جانے وہ کیا کہتا رہا کیونکہ مجھے نیند آ گئی تھی۔ لیکن ایک بار جب میری آنکھ کھلی تو بتی بدستور جل رہی تھی مگر وہ بستر میں نہیں تھا۔ جہاز کے ہچکولے بتا رہے تھے کہ ابھی ہم سمندر میں ہی ہیں۔ گھڑی تین بجا رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ باتھ روم گیا ہے ـــــ پانچ منٹ۔ دس منٹ۔ پندرہ منٹ ـــــ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے سے باہر نظر ڈال دی، مگر وہاں سوائے اونگھتے ہوئے چوکیدار کے

اور کوئی نہ تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ اوور کوٹ پہن کر میں کاریڈور سے گزر کر ایک بڑے ڈیک پر چلا آیا۔ ہوا بدستور سنسنا رہی تھی اور لہروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ سامنے لوہے کے جنگلے کے قریب مجھے ایک دھندلا سا سایہ نظر آیا۔ وہ نوجوان جنگلے کا سہارا لئے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے ــــــ؟" میں نے قریب جا کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ــــ" وہ نہایت اداس لہجے میں بولا۔ "بدن ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔"

"پاگل مت بنو ــــــ" میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ــــ "اندر چلو یہاں بہت سردی ہے۔ تم بیمار معلوم ہوتے ہو۔"

خلاف توقع میری بات مان گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ نیچے چلا آیا۔ کاریڈور سے گزرتے ہوئے وہ پھر اسی کیبن کے سامنے رکا۔ اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا ــــــــ "وہ لڑکی اسی جہاز پر ہے اور یہی مون منانے ہالینڈ جا رہی ہے۔"

جہاز ہوک آف ہالینڈ پہنچ گیا۔ مگر چھ بجے سے پہلے نیچے اترنے کی اجازت نہ ملی۔ ہم کچھ دیر ڈیک پر کھڑے بندرگاہ کا نظارہ کرتے رہے۔ باہر ابھی تک تاریکی چھائی ہوئی تھی اور سردی بجلی کے بلب جیسے اس اندھیرے کو چیرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ دور مکانوں کی روشنیاں دھند میں کانپ رہی تھیں ــــــ جب جہاز کے ساتھ سیڑھی لگا دی گئی تو ڈچ نوجوان بولا ــــــ "آپ چونکہ اجنبی ہیں اس لئے آپ کے کاغذات دیکھے جانے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں کسٹم شیڈ یا پھر پلیٹ فارم پر آپ کا انتظار کروں گا ــــ" امیگریشن سیکشن میں افسر کچھ دیر میرے پاسپورٹ کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر بولا ــــــ "آپ جرمنی جا رہے ہیں ــــ؟"

"جرمنی ــــــ؟" میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ــــ "نہیں تو"

اس نے پاسپورٹ کا وہ حصہ میرے سامنے کر دیا جس پر نیویارک کے ڈچ کانسلیٹ کی مہر لگی ہوئی تھی ــــــ "آپ کے ویزا (VISA) میں لکھا ہے کہ

آپ TRANSIT میں ہیں۔ اس سے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ آپ ہالینڈ ٹھہرنا چاہتے ہیں۔"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے" وہ پاسپورٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا —— "آپ یہاں بارہ ۱۲ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

"مگر یہ آپ کے کانسلیٹ کی غلطی ہے ——" میں صفائی پیش کرتے ہوئے بولا "مجھے ڈچ زبان نہیں آتی۔ میں نے اُن لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے چار پانچ روز یہاں ٹھہرنا ہے ——"

"ہم ——" افسر لاپروائی سے بولا —— "مجھے افسوس ہے۔"

"آپ کو افسوس ہے اور مجھے افسوس نہیں ——" میں ذرا ترش روئی سے بولا —— "کیا میں اتنی دُور سے صرف بارہ ۱۲ گھنٹے بتانے کے لئے آیا ہوں اور وہ بھی اِس سردی میں —— میرے پاس میری آفیشل چٹھی ہے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ میرا یہاں کچھ روز ٹھہرنا ضروری ہے ——" مگر جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پتہ چلا کہ چٹھی تو بیگ میں تھی اور وہ سارا سامان کسٹم شیڈ میں پہنچ چکا تھا۔ کم بخت کوئی پورٹر بھی تو قریب نہ تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔ میں نے افسر کی طرف بڑی متعجبانہ نظروں سے دیکھا۔ شاید اُسے میری حالت پر کچھ رحم آجائے۔ اُس کے چہرے پر بے پروائی اور اجنبیت دیکھ کر میرا جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ اچانک میری نظر ڈچ نوجوان پر پڑی جو کسٹم شیڈ والے دروازے سے مجھے اپنی طرف بُلا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنی طرف آنے کو کہا —— "کیا بات ہے" وہ میرے قریب آ کر بولا۔

میں نے اُسے سب بات بتائی۔ تو پہلے اُس نے افسر سے اپنی بھاشا میں بات کی اور پھر میرا پاسپورٹ لے کر اندر چلا گیا۔ جب وہ تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا —— "نیا ویزا بن رہا ہے۔ آپ ان لوگوں کو فیس دیں میں اب پلیٹ فارم پر آپ کا انتظار کروں گا ——"

جب میرا سامان گاڑی میں پہنچ گیا تو وہ بولا —— "میں نے اُن لوگوں

سے کہہ دیا تھا کہ میں آپ کو لندن سے جانتا ہوں۔"

میں اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ الفاظ میرے پاس نہیں تھے۔ مگر وہ کچھ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے مجھ سے بے تکلف ہونا چاہتا ہو۔ وہ کھڑکی سے باہر بڑی حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا ——— دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی طرف جیسے اُس کی نظریں کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

گاڑی چھوٹے چھوٹے پُلوں سے گزرتی، میدانوں سے ہوتی ہوئی ہیگ کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ باہر ابھی تک دُھند تھی۔ اور دُھند میں ڈوبے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندے کسی پریوں کے دیش کی کہانی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ فصلیں کاٹی جا چکی تھیں اور کہیں کہیں خشک گھاس کے بڑے بڑے ڈھیر جمع تھے ——— یہ منظر بڑا پھیکا پھیکا سا نظر آ رہا تھا۔

"امریکہ میں گاڑیاں شاندار ہوتی ہوں گی ———" وہ کھڑکی سے نظریں ہٹاتے بولا ——— "وہاں تو میں نے سُنا ہے دیہات بھی مشینی اور سائنسی برکتوں سے مالا مال ہیں ——— ہمارے ہاں تو اب بھی کئی جگہ پُرانے طریقے سے کھیتی باڑی ہوتی ہے ———"

میں کہنا چاہتا تھا کہ وہاں تو شاید سب کچھ ہے۔ مگر یہاں ایسا کیوں نہیں جب کہ مارشل پلان کے ذریعے اتنا کچھ یہاں بھیجا جا رہا ہے۔

"تم جھوٹ بولتے ہو ———" مگر میں یہ اُس سے نہ کہہ سکا۔

قریباً بیس پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی گاڑی کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھے ہوئے میں نے دوسرے مسافروں پر نظر ڈالی ——— ایک بوڑھی عورت، ایک نوجوان لڑکی اور ایک کُتا ہر آنے والے اسٹیشن پر گاڑی رُکتے ہی اپنے کان کھڑے کرتا۔ مُنہ کو اُونچا کر کے ہوا سونگھتا، اور پھر گاڑی کے چلنے پر نوجوان لڑکی کی طرف ایک نظر دیکھ کر سر اپنی جگہ رکھ دیتا۔ لڑکی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی اور بوڑھی عورت نیم غنودگی کے عالم میں سر کھڑکی سے لگائے بیٹھی تھی۔

ہر آنے والے اسٹیشن پر وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی۔ جیسے نئے مسافروں کا سواگت کرنا چاہتی ہو اور پھر گاڑی چلنے پر اپنا سر کھڑکی پر رکھ کر ہماری طرف یوں دیکھتی جیسے کہنا چاہتی ہو ——— "کوئی بھی نہیں آتا۔"

وہ کہنے لگا ——— "میں نے بھائی کو چِٹھی لکھی تھی مگر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی چلا آیا۔ وہ جانے کیا سوچتا ہوگا ———"

"وہ بڑا بھائی ہے۔ آپ کی مجبوری کو وہ سمجھ سکتا ہے ———" میں نے اُسے تسلّی دی

"کچھ بھی ہو ———" وہ بولا ——— "اب تو میں یہیں رہوں گا۔ اپنے حقوق کے لئے لڑوں گا اور ان ہی خوبصورت کھیتوں میں میری قبر بنے گی ———" اُس نے کھڑکی کا شیشہ اُوپر کر دیا، اور سر باہر نکالا جیسے تازہ ہوا سونگھنا چاہتا ہو ——— "مارچ تک ایسا ہی موسم رہے گا۔ بارش ہوتی رہے گی، اور پھر دُور دور تک ہریالی پھیل جائے گی ——— نیا سال، نئی فصلیں اور چاروں طرف پھولوں کی خوش بُو ہوگی ——— او مائی نادرلینڈ، میں تمہیں خوب صورت پھولوں اور بہاروں سے لدا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں ———"

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھر آئی اور اُس کی آنکھوں سے ایک ننھا سا آنسو اُس کے رخسار پر ڈھلک آیا مگر اُس کی باتوں میں یقین تھا اور آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی ——— خوشی جو شاید اُس کی مٹھی میں ناچ رہی تھی ٭

سوم ناتھ زتشی

طمانچہ

ہم کہاں جا رہے تھے، مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ میرا ساتھی ہی یہ بخوبی جانتا تھا۔ اُسے ہی ان پیچ در پیچ راستوں اور پگڈنڈیوں کے نشیب و فراز سے واقفیت تھی، پر مجھے اتنا معلوم تھا کہ بابوجی نے مجھے اپنے گاؤں، جہاں اُن کا ہیڈ کوارٹر تھا، بلایا تھا۔ بابوجی میرے رشتے کے بھائی تھے اور رفاہِ عام کے محکمے میں اوورسیر تھے۔

میرے ساتھی کا نام خالق تھا شاید —— ہاں خالق خان! ایک نحیف سا آدمی تھا جس کی پیشانی پر جھریاں ہی جھریاں تھیں اور داڑھی ہاتھ بھر لمبی تھی۔ جس پر اُس کے بار بار تھوکنے سے سردی کی وجہ سے تھوک جم گیا تھا۔ اُس کے میلے بدن پر موٹے کپڑے کا کرتہ تھا اور ٹانگوں میں پٹو کے چند چیتھڑوں سے بنا ہوا پاجامہ اور اُس کے اُوپر بوسیدہ پتوا تھا۔ اُس کی عمر بھر کی کمائی وہی ایک ٹٹو تھا جس پر میں سوار تھا اور جس کے آگے آگے وہ لگام تھامے جا رہا تھا۔

جاڑے کے دن تھے اُس روز فضا میں زیادہ خنکی تھی، کالے بادل آسمان پر آوارہ ہو رہے تھے۔ ہم کھیتوں میں سے جاتی ہوئی پگڈنڈی پر گامزن تھے۔ میں راستے کے پیچ اور اُلجھاؤ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا، اور متواتر ٹٹو پر بیٹھے بیٹھے میرا بدن چور چور سا ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا اِس دُبلے پتلے آدمی نے صبح سے یہی کہا، اِس کھیت سے پرے اُن بید کے درختوں کے پاس ابھی پہنچ جائیں گے۔ میرا یہ حال ہے اور وہ تھکنے کا نام تک نہیں لیتا۔

میں نے خالق سے پُوچھا۔ "میٹھ اب کتنی دور ہے؟ یہ سانپ کی طرح بل کھاتی

ہوئی پگڈنڈیاں کبھی ختم بھی ہوں گی کہ نہیں ——؟"

خالق نے چلتے چلتے ہی آہستہ سے کہا —— "بس پہنچ ہی گئے مہاراج، دو ایک کھیتوں کا ہیر پھیر ہے، اور پھر بابوجی کا مکان ——"

بابوجی خالق کو میٹھ کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ اُن کے ماتحت جتنے بھی قُلی کام کرتے تھے اُن کا یہی سرغنہ تھا۔ اُسے اپنے علاقے کی ہر سڑک کے خواہ وہ کچی ہو یا پکی، اُتار چڑھاؤ سے واقفیت تھی کیونکہ عمر بھر یہی کام کرتا رہا۔ اور خدا کے بعد بابوجی پر بھروسہ بھی تھا۔

میری نظر بار بار اُس پر پڑتی تھی اور میں دل ہی دل میں اُس کے بھولے پن پر سوچ رہا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر بعد گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا — "خالق شہر چلو گے میرے ساتھ؟"

خالق نے نفرت آمیز لہجے میں کہا —— "نہیں جی، شہر جائیں میرے دُشمن۔ ہم تھوڑا ہی کسی سے روپیہ قرض لیتے ہیں۔ ہم شہر کیوں جائیں، اور پھر جنگل کی چڑیا جنگل ہی میں بھلی ہے۔"

میں اس کا یہ فلسفہ نہ سمجھ سکا۔ وہ شہر سے صرف بائیس میل دُور رہتا تھا لیکن اُسے شاید گمان تھا کہ شہر وہ لوگ جاتے ہیں، جن پر کسی نے دیوانی مقدمہ کیا ہو، اور گاؤں کی پنچایت اُس مقدمے کا فیصلہ نہ کر سکی ہو۔ کیونکہ اُس کے گاؤں کے بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے جو اپنا کام کاج چھوڑ کر چار پانچ دن پیدل سفر کر کے شہر جایا کرتے —— میں خاموش رہا۔

"سمجھ گئے نا" —— خالق نے تھوڑے وقفہ کے بعد دوبارہ کہا —— "جو زمین دے اور قرضہ دے، لیکن دونوں کا لین دین صاف نہ ہو، بھلا ہم نے آج تک کسی کا ایک پیسہ بھی کھایا —— دادا مرحوم کے وقت کا قرضہ تک چکا دیا ——"

میں نے کہا —— "شاید تم غریب نہیں ہو، غریب وہ ہے جس کی زمین نہ ہو اور جو کام نہ کرے جو اپنا پیٹ نہ پال سکے، جو مجبور ہو اور خالق ہو ——"

وہ حیران رہ گیا اور اپنے تھوڑے وقفہ کے بعد کہا —— "زمین —— مجھے تو نہیں ملی جنہیں ملنی تھی اُنہیں مل گئی ——"

اور پھر اُس نے اپنے آپ کو تسلّی دیکر کہا —— "نہیں جی، میں غریب نہیں کیا ہوا مجھے زمین نہ ملی۔ پر مجھے اس کی بات پر بھروسہ ہے اور توکل کرتا ہوں۔"

اس کی وضع قطع اور پوشاک سے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اگر خدا کی بنائی ہوئی کوئی صورت یا شکل ہے جو اپنی پوشاک اور بول چال سے خدا پر توکّل اور صبر کا ثبوت دے رہی ہے تو وہ صرف خالق ہے۔

میں نے پوچھا —— "تمہارے گاؤں میں جتنے بھی لوگ ہیں کیا وہ سب خدا پر توکّل کرتے ہیں —— ؟"

خالق نے فخریہ طور کہا —— "ہاں کچھ کرتے ہیں کچھ نہیں، مہاراج توکّل نہ کریں تو جہنم اُن ہی کے لئے ہے۔ لیکن اب ایسی ہوا چلنے لگی ہے کہ بہت سے لوگ خدا کے دئے ہوئے پر قناعت نہیں کرتے۔"

میں ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسا، میں نے ایک نظر میں اُس کی میلی کچیلی چھاتی کی طرف دیکھا جس پر اُلجھے ہوئے سفید بال تھے۔ اور پہاڑ کی طرح عُریانی تھی، پر اُس کے سر پر موٹی سُرخ دستار ایک شان سے بندھی تھی جس شان کی قدر اُس کے ماتحت قُلی ہی کر سکتے تھے اور وہ دستار اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ اُسے گاؤں بھر میں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

میں نے وقفہ کے بعد کہا —— "خالق تم بوڑھے آدمی ہو، تھکتے تو نہیں —— ؟"

اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا —— "ہم تھکتے وکتے نہیں، ہماری جلد موٹی ہے کھانا پینا موٹا ہے۔ پہننا اوڑھنا موٹا ہے، اور تو اور ہم اپنے بابوجی کی مہربانی سے آرام سے بسر کرتے ہیں۔"

بابوجی کا علاقہ تیس مُربع میل تھا۔ خالق کو قلیوں کی نگرانی کرنا ہوتی تھی، اس کے علاوہ وہ بابوجی کی خدمت انجام دینا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ لیکن تو بھی بابوجی کو ان سے چڑ سی تھی۔ استفسار کرنے پر وہ اس کی نسبت کہا کرتے —— "کون —— ؟ وہ خالق مردہ —— ؟ بڑا سُست آدمی ہے۔ بار بار نازبرداریاں کرنے سے سر چڑھ گیا ہے۔"

ہم بابوجی کے تکیۂ کلام سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اس کے نام کے ساتھ ہر بار اُٹھتے بیٹھتے گالی دے کر اُسے یاد کیا کرتے تھے ـــــ میں حیران تھا!

میں نے کہا ـــــ "تو کیا تم آرام ہی کرتے رہتے ہو؟ تم سے کچھ بھی کام نہیں لیا جاتا؟"

اُس نے گھوڑے کو روک لیا، اور میری طرف مڑ کر گھورتے ہوئے کہا ـــــ

"مہاراج آپ مذاق کرتے ہیں، کام نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے؟ کون نازبرداریاں کرے اور آج کل کے زمانے میں ـــــ"

میں نے طنزاً کہا ـــــ "مگر دیکھو تم آج تک قناعت کرتے آئے ہو، اب بوڑھاپے میں لالچ کرنا کیا اچھا ہے ـــــ؟ جمعداری کے بعد دُنیا چھوڑ دو گے، تو جنّت کے دروازے تم پر کھلیں گے اور پھر تمہاری محتاجی جاتی رہے گی ـــــ"

اس نے میری اس بات سے گویا وہ سب کچھ پالیا جس کی اُسے آج تک تلاش تھی اس کی آنکھوں میں نور سا دکھائی دیا۔ اس نے خوشی کا ایک سانس لیا، اور جنّت کے سارے مزے اور سکھ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ اس نے میری بات ختم ہوتے ہی کہا ـــــ مہاراج بات خوب کہی۔ میں نہ کہتا تھا، قناعت پروردگارِ عالمین کی آزمائش ہے اُس کا گھر وسیع ہے، اور اُس کے آگے جو ہاتھ پھیلائے تو کیا مجال وہ نہ دے اور جس نے صبر اور توکّل سے کام لیا، جنّت کے مزے لیگا۔ آہا ـــــ مہاراج! جنّت ـــــ میں کیا کہوں؟

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ ہمارا مُلک جنّت سے کیا کم ہے، سنہرے کھیت، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے اور ہرے بھرے جنگل ......

وہ پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف لگام تھامے ہوئے تھے۔ میری نظر دُور ایک چنار کی طرف گئی۔ جو ہمارے راستے میں پڑنے والا تھا۔ وہاں کچھ چیز مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی دکھائی دی۔ میں نے خالق کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"خالق ــــــ اب ذرا تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ چنار تلے گھڑی دو گھڑی سستا لیں۔ مجھ میں اب آگے جانے کی سکت باقی نہیں رہی، میرا بدن ٹوٹ سا گیا، تم بڑے تندرست ہو، اور چلنے میں جوان لگتے ہو" ــــــ

چنار کے نزدیک اُبلتا ہوا ایک چشمہ تھا۔ چشمے کو دیکھ کر میں نے پیاس کی شدّت کو بھی محسوس کیا۔ پانی کے دو چار گھونٹ پی کر پیاس بجھائی اور ایک لمبا سانس لیکر خالق کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے ڈکار لیتے ہوئے کہا:

"میٹھا ــــ بڑا میٹھا پانی ہے اس چشمے کا۔ جنّت میں بھی نصیب نہ ہوگا تجھے۔"

خالق نے کہا ــــــ "سرکار، باؤجی ہی کی مہربانی سے پچھلے سال اسے پختہ بنایا گیا ہے۔" اور اتنا کہنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور اپنا سر اپنے دونوں زانوؤں میں چھپا لیا۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ خالق ایک دُبلا پتلا آدمی ہے، اب تھک گیا ہوگا۔ اس لئے گردن جھکائے بیٹھا ہے۔

چاروں طرف سے سرد ہوائیں آکر میرے چہرے اور کانوں کی خبر لے رہی تھیں۔ بادل ویسے ہی چھائے تھے جیسے ہم نے یہ راہ پکڑنے سے پہلے پہلے آسمان پر دیکھے تھے۔ ٹنڈ مُنڈ درختوں پر کبھی کبھی پرندے آکر بیٹھ جاتے اور دو ایک لمحے ٹھہر کر پھر ہوا ہو جاتے تھے۔

میں اُٹھا اور ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ قرب و جوار میں نظر دوڑائی، ساتھ کے کھیت میں سے پگڈنڈی جا رہی تھی اور کوئی دو تین سو گز کے فاصلے پر سفیدوں کی ایک قطار دکھائی دے رہی تھی۔ چنار کے نزدیک کچی اینٹوں کا ایک مکان تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ میرے دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی، میری آنکھیں پھیل گئیں، اور مجھ پر جنون کا سا دورہ ہو گیا۔ میں اس سارے ماحول کو دیکھ کر اور کچھ یاد کرتے ہوئے خالق کے پاس آیا اور پوچھا:

"خالق وہ سفیدوں کی قطار ــــــ"

اس نے جلد جلد سر اُٹھا کر کہا ــــــ "ہاں مہاراج جرنیلی سڑک ہے۔"

"جرنیلی سڑک ——؟" میں چونک اٹھا۔ میں نے مکان کو دوبارہ دیکھا میرے دل کا اضطراب بڑھنے لگا اور پھر خالق سے پوچھا —— "یہ چشمہ کب پختہ بنایا گیا ہے خالق ——"

اس نے ایک بار گردن لٹکائے ہی آہستہ سے جواب دیا —— "پچھلے سال کی بات ہے مہاراج ——!"

میں حیران ہو گیا، خالق کی ان دونوں باتوں کے جواب نے میرے اس خیال کی تائید کی کہ مجھے پہلے بھی اس جگہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں پھر اٹھا اور ادھر اُدھر دو ایک قدم چلنے کے بعد پھر خالق کے پاس آیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میں نے بے قراری سے پوچھا —— "خالق!"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اُس کے منہ سے بے اختیار "اُف" نکلی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی، جس میں زیادہ تر مایوسی کی جھلک نمایاں تھی۔

خالق کی اس دیوانگی کو میں نہ سمجھ سکا، میرے دل پر دہشت سی طاری ہوئی اور میں نے دوسری بار اُس سے کہا —— "تجھے کیا ہو گیا خالق ——؟"

اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، پلکیں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطروں سے بھری پڑی تھیں، اور جو قطرے گرتے تھے سیدھے اُس کی داڑھی پر جا کر چمکنے لگتے تھے "تم نے اُف کیوں کی، کیا یاد آیا ——؟"

خالق نے روتے ہوئے کہا —— "کچھ بھی نہیں، فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ پر مہاراج آپ بھی رونے لگے ہیں —— کیا بات ہے ——؟"

اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھ لیتا کہ وہ کس کا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا —— "کچھ بھی نہیں، میں بہت اچھا ہوں۔" کیا حقیقت یہ ہے کہ میں اچھا نہ تھا۔ میرے دل میں کچھ ضرور تھا۔

میں نے پھر پوچھا —— "تم رو کیوں رہے تھے۔ تم نے آہ کیوں بھری؟"
خالق نے اور آنسو بھرتے ہوئے کہا —— "میں جانی کا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

وہ پچھلے سال مری ہے۔"

"کس کا ہو جانی کا ___؟ کون جانی ___؟"

خالق نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ___ "میری بیوی جانی! مرنے سے پہلے اس نے کہا تھا کہ کوئی جگہ ایسی ہو، جہاں اُسے مر کر دفن کیا جائے۔ اُسے ایسی جگہیں جنت معلوم ہوتی تھیں، مجھے اس سے بڑی محبت تھی وہ مجھے خوش رکھتی تھی۔ پر مر کار کیا کروں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا جو اُسے لے گیا ___"

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا ___ "خالق اس خیال کو دل میں جگہ نہ دو، دیوانے ہو جاؤ گے، اور پھر تم میں استقلال ہے، صبر ہے، توکل کرو ___"

یہ کہہ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اُسے تو ایسا معلوم ہوا جیسے میں ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا، اور اُس پر احسان کر رہا تھا، پر میرا تخیل ___

ہم پھر چلنے لگے، اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ___ "میری بیوی مری ہے، اور آپ ناحق رو رہے ہیں۔"

میں نے قدم اُٹھا کر کہا ___ "ناحق نہیں رو رہا، جس کے دل پر گذرے وہی جانے خالق، میں بھی اپنی قسمت پر ماتم کر رہا ہوں۔"

وہ حیرت کا مجسمہ بن کر کھڑا میری طرف دیکھنے لگا۔ سوچنے کے بعد بولا ___ "کیا مطلب ___؟"

"تم نہیں سمجھ سکے خالق، میں نے بھی محبت کی تھی، میری اُس محبت کا آغاز اسی مقام پر ___ ہائے مجھے اچھی طرح یاد ہے، ٹھیک اسی جگہ ہوا تھا لیکن اب ___ اب کچھ بھی نہیں، وہ آگ سُلگ سُلگ کر ہی بجھ گئی۔ اور بجھ کر ___ راکھ ہو گئی، آہ خالق، ایک بار وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ سیر کو گئی تھی، ہم بھی گئے تھے۔ ہمارا ڈونگا شہر واپس جاتی بار پکی سڑک کے اُس پار نالے میں قریباً دو گھنٹے ٹھہرا۔ وہ بھی وہیں ٹھہرے۔ جب وہ اِدھر اُدھر ٹہلتے پھرتے چلے گئے میں اس پگڈنڈی سے جو اُن سفیدوں سے شروع ہوتی ہے، ٹہلتا ٹہلتا اس طرف

آنکلا ـــــ ذرا قدم تیز اُٹھاؤ خالق ! شام ہونے کو آئی ہے ـــــ اور یہاں یہ چشمہ اور یہ ماحول دیکھ کر میں سب کچھ بھول گیا۔ یقیناً اپنے کو بھی بھول گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد وہ بھی اسی طرف گھومتے گھومتے آئی ۔ مجھے کھویا ہوا سا پا کر کہنے لگی :
ـــــ کیا سوچ رہے ہو ـــــ دیوانے ؟"

میں اُس کی باتیں سنتا رہا، خالق سمجھتے بھی ہو۔ سمجھو اُس نے مجھ سے محبت کا اظہار کرنا شروع کیا، وہ اُٹھی اور میرے پیچھے چشمہ سے پانی کی ایک اوک بھر کر لائی اور میرے مُنہ پر اس زور سے پانی دے مارا کہ سُبحان اللہ ـــ میں اس کی اس جرأت پر بہت ہی حیران ہوا۔

"مجھے اس واقعہ سے پہلے ہی اُس سے محبت ہو چکی تھی ۔ پر کبھی اُس پر آزادی کے ساتھ اظہار نہ کر سکا تھا۔ اُس کی جرأت سے میں بہت ہی حیران ہوا۔ وہ میری طرف بہت دیر تک دیکھتی رہی، اور پھر ہر سمت آہستہ آہستہ نگاہ ڈالی۔ اُس کی نگاہ میں ارمان تھے اُمید تھی، اور ایک ایسی مسکراہٹ جو مجھ سے کہنا چاہتی تھی کہ قدرت محبت کا پیغام دے رہی تھی۔

وہ دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ـــــ "کیا سوچ رہے ہو ؟ ۔ جادو نہیں اُترا ـــــ ؟ ابھی دیوانگی ہے ـــــ ؟ "خالق تم اِن باتوں کا بُرا تو نہیں مان رہے ـــــ ؟ میں تجھے پارسائی سے چھڑا کر اپنے گناہوں کی داستان سُنا رہا ہوں ـــــ ہاں تو میرے ہونٹ ہلنے لگے ۔ میرے دل میں خوشی ناچنے لگی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے کہا ـــــ "تیری تلاش تھی مجھے۔ تُم ہی میری دیوانگی ہو۔ آ، ـــــ میری روح ـــــ آ میرے پاس ـــــ !" اُس کی آنکھوں میں محبت کے آنسو ڈھلک رہے تھے، میں نے آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگایا، اور فرطِ محبت سے اُسے چوم لیا ـــــ

یہ تھی میری محبت کی ابتدا ۔ لیکن اب اس کی انتہا ہو چکی ہے ۔ دُنیا نے اُسے مجھ سے دور رہنے ہی میں کچھ مصلحت سمجھ لی ۔ کیا کروں خالق مجبور ہوں، اُس کی تباہی

مُجھ سے نہ ہو سکی۔ میں کبھی کبھی اُس تپتی ہوئی آگ کی گرمی محسوس کر رہا ہوں، صرف گرمی اُس سے آگے کچھ بھی نہیں ——"

خالق نے قدم روکتے ہوئے کہا —— "ہاں مہاراج میری ہی طرف دیکھو میں نے کیا کیا جواب آپ کرینگے —— ؟ توکّل اور قناعت کرو۔ نہیں تو کیا کر سکتے ہو؟"

خالق کے جواب سے میری پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے اپنی طنزیہ ہنسیوں کے معاوضے میں ایک ایسا تھپیڑ محسوس کیا جس کے نشان نہ معلوم کتنی دیر تک میرے مُنہ پر باقی رہیں گے .... میں اپنی باتوں پر نادم تھا جو چشمے پر پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اُس سے کہی تھیں۔ میری پشیمانی کی کوئی حد نہ تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا —— "ٹھیک ہے خالق —— میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ اِس درد کی کوئی دوا نہ کر سکا ——

میں نے محسوس کیا جو گرمی مجھے کبھی کبھی اپنی محبت کے لئے تڑپا دیتی تھی وہ مجھے اب خالق کی باتوں سے مسلسل طور پر بیمار کرنے والی ہے۔ حتیٰ کہ چنار کے تنے کی طرح اندر ہی اندر سے ....

باؤجی کا مکان سامنے تھا اور وہ کھڑے کھڑکی میں سے ہمیں دیکھ کر مُسکرا رہے تھے —— !



اختر محی الدین

اور رات مر گئی

جس طرح چراغ کی آخری ہچکی زیادہ پُر نور ہوتی ہے بالکل اُسی طرح اس دم توڑتی ہوئی رات کا اندھیرا زیادہ گہرا اور گھناونا ہو گیا تھا اور یہ گہری اور گھناونی تاریکی باغ پر اس طرح مسلط تھی جس طرح کفن اوڑھی ہوئی لاش پر تابوت کے اندھیرے مسلط ہوتے ہیں۔ پودوں کی ڈالیاں مُردہ جسموں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں۔ کلیوں کا سیاہ چہرہ منحوس اور مضمحل نظر آتا تھا۔ اور کسی اُلّو کی پرواز سے ہوا میں جو ارتعاش پیدا ہوتا تھا وہ بہت سی کلیوں اور پھولوں کو ڈالیوں سے توڑنے اور مر جانے پر مجبور کرتا تھا۔ اور اگر کہیں کوئی اُلّو کسی چڑیا، بلبل یا کوئل کے گھونسلے میں سے ایک دو بچے اُٹھانے کے لئے درخت کی ٹہنی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو اس کے بوجھ کے نیچے ٹہنی چیخ کر ٹوٹ جاتی اور گھونسلے کے ساتھ زمین پر آرہتی تب شور اُٹھتا۔ بچوں کی چیں چیں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ اور اُن کے گستاخ ماں باپ جو بظاہر بڑے نحیف، کمزور اور لاچار نظر آتے تھے۔ تُل جاتے اور باغ میں کہرام مچاتے اور بیچارے اُلّو کو مجبور کرتے کہ وہ اپنی نیّت بدلے اور ایک دو بچوں کے بجائے سب خاندان کو سزا دے۔ اتنا ہی نہیں، بہت سے اُلّو پرندوں کے اس سمع خراش شور کو سُن کر جائے وقوع پر جمع ہو جاتے اور تب پرندوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے اور زیادہ سے زیادہ پرندوں اور اُن کے بچوں کو مارنے کے صلے میں اپنی حکومت سے بہادری کے تمغے پاتے جو عمر بھر تک اُن کے سینوں پر لٹکتے رہتے۔ اُلّوؤں کی حکومت ایسے ہی جانبازوں کے دم قدم سے آباد تھی اور حکومت اِن جانبازوں اور وفاداروں کی

خوشنودی کے لئے گستاخ چڑیوں، بلبلوں اور کویلوں اور اُن کے بدتمیز بچوں پر حملے کرتے اور اُن کو ختم کرنے کی اجازت دیتی اور یہ جانباز حملے کرتے۔ گستاخوں کو سزا دیتے اور اُلوؤں کی حکومت اِس خوف و ہراس اور دہشتناکی کے طفیل زندہ رہتی۔

ہاں تو اُلوؤں کی یہ رات آخری ہچکی لے رہی تھی۔ تاریکی شدید طور پر گہری ہو رہی تھی اور اُلوؤں کی حکومت پورے شباب پر تھی۔ چمگادڑیں اپنے پر پھیلائے ہوئے جاسوسوں کی طرح باغ کے اُوپر منڈلا رہی تھیں اور انہیں جہاں کہیں بھی باغ کے کسی بھی کونے میں کوئی سہما سکڑا ہوا پرندہ اپنی چونچ پروں میں دبائے نظر آتا تو وہ اُن کے قریب آ کر اس قدر زور سے چیخ مارتے کہ بے چارہ پرندہ ہڑ بڑا کر چوں چوں کرنے لگتا۔ اُلو اپنے کارندوں کے کارناموں پر مسکراتے اور اُن کی بڑی بڑی آنکھیں اندھیرے کا جگر چیرتی ہوئی پرندے کی بے بسی پر خوشی سے ناچتی ہوئی نظر آتیں۔ اور اگر کبھی کوئی پرندہ چمگادڑوں کی یورش کے باوجود اپنی گردن کو اکڑا کر رکھتا اور چوں چوں کرنے سے انکار کرتا تب چمگادڑیں اپنے پروں کو بجاتی ہوئی شور مچاتی ہوئی اُلوؤں کے پاس جاتیں اور اطلاع دیتیں:

دشمن ـــــ باغ کے کونے میں دشمن

(یاد رہے اُلوؤں کی اندھیری لغت میں دشمن کے معنی بڑے وسیع ہیں۔ نسیم سحری جو صبح کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔ سپیدۂ سحر صبح کی آمد پر شور مچا کر جاگنے والے پرندے کلیاں اور اُن کا منہ دھلانے والی شبنم، سورج جو اُلوؤں کو اندھا کرتا ہے۔ باغ کے پرندوں کی بے نور آنکھوں کی روشنی واپس لاتا ہے) اور پھر دشمن پر حملہ کیا جاتا حکومت کے لئے ٹیکس کے طور پر اُس کی جان لی جاتی۔ پرندے کی رُوح اپنے خاندان سمیت اندھیرے باغ میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دی جاتی۔ جو اُڑنے سے پہلے کسی کانٹے سے اُلجھ کر رہ جاتی۔ کتنی ہی بلبلوں کی روحیں اس اندھیری رات میں پھولوں سے ملنے کے بجائے کانٹوں سے اُلجھ گئیں اور اُلجھتی رہیں۔

رات کے اِس آخری حصے میں باغ میں امن وامان قائم تھا۔ جان پڑتا تھا کہ پرندے اب دم توڑ چکے ہیں۔ اب باغ میں زندگی کا تسلسل قائم

ہے تو محض ان اُلّوؤں اور چمگادڑوں کی وجہ سے جو باغ کو اپنی ملکیت اور اندھیرے کو ابدی اور ازلی جان کر مزے سے اُڑتے پھرتے جاتے تھے۔ .... رات کبھی ختم بھی ہوتی ہے ——— ؟ نہیں یہ خیال اُلّوؤں اور چمگادڑوں کے لیے پریشان کن تو تھا لیکن اس رات سے پہلے بھی کئی راتیں آئی ہیں اور ان راتوں کی صبحیں بھی ہوئیں۔ لیکن آج کی رات ——— آج کی رات امر ہے، لافانی ابدی ——— اس میں تغیر نہیں۔ انقلاب نہیں آسکتا ——— اندھیری رات زندہ باد! گھرے اندھیرے پائندہ باد! لیکن .... لیکن کیا ——— ؟ نہیں ——— چھی چھی بچارے اُلّو شب اندھیرے بن میں تھے۔ بظاہر خوش لیکن اندر سے کوئی آواز کوئی دہشت للکار للکار کر کہتی جا رہی تھی .... ؟

اور اگر یہ رات ختم ہوتی تو ——— ؟

کھٹ ——— ایک ٹہنی ٹوٹی، ایک گھونسلا گرا، شور اٹھا ——— چیں چیں چیں ——— پھر ہنگامہ ہوا۔ ہو ہو، ہو ہو ہو ——— محشر بپا ہوا پھر تھوڑی دیر کے لئے اُڑان، پھر خاموشی ——— گہری خاموشی اور سناٹا، اور ایک ٹہنی پر بیٹھی ہوئی بُلبُل نے اپنے خوف زدہ دل کی دھڑکن کو روکنے کی کوشش کی ——— اُف یہ خوف و ہراس، یہ دہشت ——— کہیں اس کے مُنہ سے چیخ نہ نکلے، اگر چیخ نکلی تو قیامت ——— اُس نے اپنی چونچ کو زور سے بند کیا۔ اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو زور سے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ بہت زور سے ہش، پروان چڑھو میری معصوم اُمیدو! میں تمہارے صدقے جاؤں، میری ننھی تمنّاؤ! ہش ہش ——— اور کسی بوڑھے اُلّو کی ہوک سے سارا جنگل کانپ اُٹھا اتنے میں صورِ اسرافیل بجا تھے بلبلوں کے دل سمٹ گئے۔ اُلّو پھر ہو کنے لگا۔ رات امر ہے" بلبلوں نے بچوں کو سینے کے ساتھ بھینچکر سوچا ——— اور اُس کی بے نُور آنکھوں میں موتی ایسے سفید سفید آنسو آگئے

ٹھیک اسی وقت دُور مشرق سے ہولے ہولے اور چپکے چپکے نسیم سحر آئی اور

باغ میں داخل ہوئی۔ فضا میں ایک خنکی سی طاری ہوئی۔ اُلوّں اور چمگادڑوں نے سردی محسوس کی اور بلبل کی آنکھوں سے کسی جھونکے کے خوشگوار لمس نے آنسو پونچھے تب ہلکے سروں میں کوئی ساز بجنے لگا۔ دلفریب اور جانفزا ——— ساز بجتا گیا۔ خنکی بڑھتی گئی، لیکن اندھیرا اب بھی چاروں اور مسلّط تھا۔ تب باغ کے کسی کونے میں بلبل نے سنا۔ کوئی گا رہا تھا۔ ہلکی اور سُریلی آوازیں ——— آواز کے ساز پر ٹہنی ہلتی تھی اور بُلبُل ——— دہشت زدہ کہ کہیں الوّوں کو اس موجودگی کا پتہ نہ چلے ——— ٹہنی پر جھولتی تھی ———

میں آئی ہوا ہوں نسیم سحر ہوں
میں پیغامبر ہوں صُبح کی
اُٹھو بلبلو، کوئلو، پُد ہُدو ——— اب اُٹھو
کہ سحر آ رہی ہے

یہ زندگی کا ترانہ تھا۔ روشنی کا گیت تھا اور حیات کی پُکار تھی ——— لیکن ——؟ لیکن یہ اندھیرا ——— یہ سیاہی ——— یہ دہشت۔ نہیں نہیں یہ صبح کی ہوا نہیں۔ یہ دھوکا ہے، جھوٹ ہے، سراب ہے، اور بلبل کو کل کا دِن یاد آیا۔ جب وہ کتنے ہی پھولوں پر بیٹھی گا چکی تھی۔ جب اُس کے بچّے چوں چوں کرتے انڈوں کو توڑ کر باہر نکل آئے، اور وہ سارا دِن اُن کے لئے دانہ دنکا لاتی رہی، پھر شام ہوئی۔ آسمانوں پر سُرخ شفق پھولوں کو شرماتی ہوئی چھا گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سُرخ سُرمئی اور سیاہ ہوتی چلی گئی اور روشنی اور اندھیرے کی باقاعدہ جنگ میں روشنی چنگاری بن کر ستاروں کو شرربار آنکھوں میں جا دوڑی اور بلبل ساری رات اِن ہی ستاروں کو دیکھ کر جیتی رہی کہ نُور زندہ ہے۔ روشنی ختم نہیں ہوتی۔ اگر یہ روشنی آسمانوں سے اُتر کر پھر اندھیرے پر حملہ کرے تو صبح ہوگی — صُبح .... صُبح !

ہوا کا ایک اور جھونکا بلبل کے پروں کو شرارتاً چھیڑتا ہوا چلا اور ساز بج اُٹھا:

میں مشرق سے آئی ہوئی نسیم سحر ہوں

میں دامن میں بھر بھر کے لائی ہوں شبنم
چٹک جاؤ کلیو، گلو مُسکراؤ
کھلو سنبلو
کہ سحر آ رہی ہے۔

بلبل بڑبڑا اُٹھی —— نہیں یہ ٹہنی جھولتی ہے، اور وہ اپنی بزدلی پر مُسکرائی، ٹہنی میں ایک نرم اور نازک سا لوچ پیدا ہوا اور پتے سرسرانے لگے: جیسے کلی کو سرگوشی میں چڑا رہے ہوں۔ صبح کی دُلہن اور کلی کے چہرے پر شرم کے مارے پسینے آنے لگے، اور وہ سُرخ ہونے لگی۔ وہ آنکھیں جھپکاتے مُسکرا رہے تھے۔ اور امید کی ایک کرن آنکھوں کے رستے سے بلبل کے دِل و دماغ اور رُوح میں سرایت کر گئی۔ فضا میں پھر ارتعاش پیدا ہوا، اور ساز بج اُٹھے۔

اُدھر دُور مشرق کی اُونچی چٹانوں پر
رات مر رہی ہے۔
وہ دیکھو ستارے چلے جا رہے ہیں
کہ مسرّت سے تکتے رہے رات بھر
اِس اندھیرے کو

امید جو بلبل کی رُوح میں سرایت کر چکی ہے۔ ہمّت پا کر بغاوت بن گئی۔ صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا اور بلبل نے لمبی سانس کھینچ کر اندھیرے کے خلاف اُونچے سروں میں چہکنا چاہا —— لیکن —— ہش —— سنو تو کوئل کوک رہی ہے —— ہاں کوئل۔

کُو کُو —— کُو
اے دوستو
اُٹھو جاگ یہ
حیات کی

پکار رہے

خُون تیزی سے دورہ کرنے لگا۔ بلبل نے پر سنوارے اور کسی نامعلوم جوش کی وجہ سے اس کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ چلانا چاہتی تھی۔ صُبح کو پکار پکار کر بُلانا چاہتی تھی —— اور —— اور وہ بھی گانے لگی۔ نسیم سحر کے ساتھ اُس کی آواز میں اپنی آواز ملا کر۔

یہ ظالم اندھیرا کہ جس میں
سزا تھی چہکنا
منع تھا پھُدکنا
مگر اب
وہ دیکھو
کہ رات مر رہی ہے
فتح آخر نُور کی ہی ہو رہی ہے —— سحر آ رہی ہے

مشرق کی اُونچی چٹانوں پر نُور کی سپیدی، اندھیرے کی رُوح قبض کر رہی تھی۔ ستارے آکاش پر اس طرح غائب ہوتے جا رہے تھے جیسے وہ بھی پگھل پگھل کر اپنی روشنی سپید سحر پر نچھاور کر رہے ہوں۔ باغ چہک اُٹھا۔ رات کی خاموشی میں اُلّو کو یقین ہوا تھا کہ پرندے سرے سے ہی ختم ہو گئے ہیں لیکن اب سارا باغ گا رہا تھا۔ ہزاروں اور لاکھوں پرندے ایک ساتھ پکار رہے تھے

فتح آخر نُور کی ہو رہی ہے
سحر آ رہی ہے

رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہی تھی۔ اُلو ہاتھ مل رہے تھے —— ہُو ہُو ہُو —— ہُو ہُو ہُو —— سارے باغ میں ایک نئی قیامت بپا ہو گئی۔ بغاوت —— بغاوت —— ہمارے خلاف، ان کمزور مٹھی بھر پرندوں کی بغاوت —— نہیں یہ سب کچھ برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اُلّو جنگجو قوم ہے۔ اُلّو بہادر ہیں ـــــ ان کے سینوں پر بہادری کے تمغے ہیں۔ بغاوت دبائی جائے گی اور سارے اُلّو ایک بہت بڑے چنار پر جمع ہو گئے۔ ان کے پر اس طرح بکھرے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ جس طرح ایک شکست خوردہ جرنیل کے پریشان دماغ میں اُلجھے اور بکھرے ہوئے خیالات!

کسی اُلّو نے تجویز پیش کی ـــــ یارو ـــ میرے مددگارو ـــ اگر حکومت اب بھی کرنی ہے تو کسی کو صبح باغ میں مت داخل ہونے دو ـــ اگر میری بات مان لی جائے تو یہ عرض کروں گا کہ باغ کے اُوپر اپنے پروں کا شامیانہ باندھ دو تاکہ سورج کی ایک کرن بھی باغ میں داخل نہ ہونے پائے۔

ناممکن ـــ ناممکن ـــ ناممکن ہُو ہُو ہُو کے درمیان بوڑھے چنار پر شوروغل مچ گیا۔

پھر کوئی چلایا ـــــ صُبح ہم سے رُک نہیں سکتی۔ بہتر ہے کہ ہم خودکشی کرلیں، یہ کہہ کر وہ خود ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پھر ہنگامہ برپا ہوا۔ یہ بزدلی ہے ـــــ

ایک چھوٹا اُلّو بولنے لگا تو سارے کے سارے اِنہماک سے سننے لگے، وہ بولا ـــ نانی باپ جب صبح ہوئی تو ہم آنکھیں بند کریں گے۔ اور صُبح کو دیکھیں گے ہی نہیں۔ تب مزہ ہے ۔ صبح نہیں ہوگی ۔ اور وہ پروں سے تالیاں بجانے لگا۔ کسی اُلّو کی گرجدار آواز سُنائی دی ـــــ "اے اُلّو کے پٹھے تو ہنستا ہے" اور اُلّو کے پٹھے نے رونا شروع کیا ـــ پھر کوئی سنجیدہ مزاج اُلّو بول اُٹھا ـــــ "میرے کارندو تمہیں اِس بات کا علم نہیں ہوگا کہ صُبح کے آنے کے ذمّہ دار صرف باغ کے پرندے ہوتے ہیں۔ اگر باغ میں پرندے نہ چہچہائیں۔ نہ کلی کھلے گی نہ شبنم ہوگی نہ ہی کبھی صبح ہوگی۔ اِس لئے میری تجویز ہے کہ ہم سب اُلّو اُٹھیں اور اُٹھ کر اُن سب پرندوں پر یلغار کریں۔ اِس منحوس سورج کو چڑھنے سے پیشتر ہی ہم سارے باغ کو اجاڑ دیں گے اور پرندوں کو ختم

کریں گے۔

وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے وہ پہلے ہی کوئی بہت بڑی سازش کر کے آیا تھا اور اس سازش کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا تھا ——— یہ سن کر سب اُلّو خاموش ہو گئے لیکن ایک بوڑھا اُلّو جو صبح کے آنے سے پہلے ہی اندھا ہو گیا تھا بولا ——— "مجھ گنہگار کی ایک بات سنو میرے بچو ——— یہ جو تمہیں مُٹھی بھر پَر کمزور اور بے جان دکھائی دیتے ہیں کمزور نہیں۔ ان کے پنجوں میں اب عقابی قوت اور ان کے پَروں میں برقی سرعت پیدا ہو گئی ہے۔ اب ہم سے یہ مر نہیں سکتے ——— میری بات سنو میرے بچو ———"

پھر ایک شور پیدا ہوا ——— "یہ غدّار ہے۔ قوم کا دشمن ہے۔ مارو، پھاڑو اور اُلّوؤں کی آنکھوں میں پھر رات کی طرح خون اُتر آیا۔ وہ پھر غضبناک ہو گئے اور بوڑھے چنار کی شاخیں ان کے بوجھ تلے چیخنے لگیں۔

رات تقریباً مر چکی تھی اور مشرق کی سفیدی آگے بڑھ کر سُرخ ہو رہی تھی سُرخ بلبل کے خون کی طرح۔ کوئل کے دل کی طرح سُرخ ——— باغ کے پرندے مشرق کی اس سُرخی کو دیکھ دیکھ کر زور سے زیادہ سریلی اور مدھر آوازیں گا رہے تھے ——— فتح آخر نور ہی کی ہو رہی ہے۔

یکلخت بوڑھے چنار کی خشک ٹہنیوں میں ہیجان پیدا ہوا۔ سب اُلّو فضا میں منڈلانے لگے اور ہُو ہُو ہُو کی کریہہ آواز سے کائنات تھرا اُٹھی ——— مارو، پھاڑو ——— اور فتح نور کی ہو رہی ہے ——— کی ملی جلی بھاری اور سُریلی آوازیں چاروں سمت سنائی دینے لگیں۔ باغ میں نٹ رجن کا ناچ ہونے لگا اور بھاگم دوڑ اور شور شرابہ ہر طرف پیدا ہوا ——— اُسی وقت مشرق سے سُورج نے باغ کے چاروں طرف نور کے تیر پھینکے جو سنسناتے ہوئے فضا کو چیرتے ہوئے تمام اُلّوؤں کی آنکھوں میں پیوست ہو گئے ——— اور رات مر گئی ——— ۱۱

تیج بہادر بھان

گلے سڑے پھل

نورے نے دکان کھول ہی لی تھی کہ عزیزا آن ٹپکا۔

عزیزے کے آتے ہی نورے کے ذہن میں عجیب سے خیالات رواں ہو جاتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے عزیزے کی لمبی نوکیلی ناک اُس کی اپنی چپٹی ناک کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ غیر ارادی طور پر وہ پھل کی ٹوکریوں سے نظریں ہٹا کر عزیزے کے خربوزے نما سر کا مقابلہ اپنے بے ڈھنگے سر کے ساتھ کرنے لگتا۔ جھریاں دونوں کے ماتھے پر تھیں۔ پر عزیزے کے ماتھے کی جھریاں سوچ بچار کا پتہ دیتیں اور اُس کے اپنے ماتھے کی جھریاں بڑھاپے کی۔

روز دکان کھلتے ہی عزیزا تمباکو پینے کے لئے اُس کے پاس آتا تھا۔ اور ہر روز اُس کے ذہن میں یہ خیالات رینگنے لگتے تھے۔ عزیزے کے آتے ہی وہ دکان میں لگے سستے آئینہ میں اپنی صورت غور سے جانچنا شروع کر دیتا۔ آئینے میں اُس کا چہرہ عجیب صورتیں بدلتا رہتا۔ کبھی ناک لمبی ہو کر سانپ کی طرح لہرانے لگتی اور کبھی سرے سے ہی غائب ہو جاتی۔ صرف نتھنوں کے سوراخ معمول سے بڑے نظر آیا کرتے۔ آنکھیں دو حقیر نقطوں میں تبدیل ہوتیں اور چہرہ ذرا ہلا تو اتنی پھیلتیں...... اتنی پھیلتیں کہ وہ گھبرا کر مُنہ پھیرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

نورے کو اس آئینے سے چڑ تھی۔ پر آئینہ ہٹانا اُسے منظور نہ تھا۔ اب پھلوں کی بکری ہی کون سی ہو رہی تھی اور صرف ایک آئینہ ہی تو تھا اُس کی دکان میں ......

جس میں پھلوں کا عکس عجیب عجیب سا لگتا تھا۔ دُکان کی دِل کشی میں بہت اضافہ ہوتا تھا۔ دُور سے تو دُکان پھلوں سے بھری نظر آتی تھی۔

آج بھی روز کی طرح اُس نے آئینے پر کپڑا پھیرا۔ اور آج بھی روز کی طرح اُسے عزیزے کا جسم آئینے میں گانٹھوں سے پُر دکھائی دیا۔ عزیزے کو اپنے پاس محسوس کر کے وہ بہت مسرور ہوا۔ عزیزہ اُس کا دوست تھا۔ ہمدرد تھا۔ غمخوار تھا۔ نورے کو گھریلو اُلجھنیں جیسے ہر کسی کو سُنانے کی اُسے بیماری سی ہو گئی تھی۔ صرف عزیزے کو ہی متاثر کرتے تھے۔ صرف ایک ہی عزیزہ تو تھا جو اپنی مُشکلات کے باوجود بھی اُس کا دِل بڑھاتا رہتا۔ مشکلات کی وجہ سمجھایا کرتا۔ انہیں دُور کرنے کے لئے فکرمند رہا کرتا۔ اور وہی ایک شخص تھا محلے میں جو سب کو نئے قوانین کے متعلق بتلاتا رہتا ——— خاص کر تو کشمیر کے مسئلے اور غیر ملکی مسئلوں کو واضح کرتا رہتا تھا۔ نورے کو یہ فکر نہ تھی کہ دُنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے وہ تو صرف پھل فروخت کرنا جانتا تھا۔ اور اُسے افسوس تھا کہ لوگ پھل کھانا چھوڑ رہے ہیں ہاں ——— جلسوں جلوسوں کے دِن اُس کی بکری ذرا بڑھ جاتی تھی اس لئے وہ عزیزے سے ملتے ہی پُوچھ بیٹھتا ——— "کیوں بھئی .... یہ مہمان کشمیر کا دورہ کب تک کرتے رہیں گے ——— ؟ سُنا ہے عزیزے آج پھر جلسہ ہو گا ——— ؟"

روز کی طرح سب کُچھ ہو رہا تھا ——— عزیزہ بیٹھا پھل کی خالی پیٹی سے پیٹھ لگائے حقہ گڑگڑا رہا تھا اور راہ گیروں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد عزیزہ اُس کے ہاتھ میں حقہ تھما کر پُوچھ بیٹھے گا ——— "بول بھئی نُورے .. .. دُکان کا کیا حال چال ہے ——— ؟" اور پھر جواب سُنے بغیر پھلوں کے کاروبار پر تبصرہ کرنے لگے گا ——— پھلوں سے ہوتے ہوئے وہ دُنیا کے حالات پر آئے گا اور پھر کسی اکے دُکے خریدار کو دیکھ کر برس پڑے گا ——— "سُن بے نُورے .... میں کہہ رہا ہوں .... یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ——— مُردے ہیں مُردے ——— ارے بھئی

اُدھر امریکہ فارموسا میں ایٹم بم بھیجنے کو تیار ہو رہا ہے۔ اِدھر افریقہ میں کالے گورے کا امتیاز شدید ہوتا جا رہا ہے ـــــ اپنے کشمیر ہی کو لو ـــــ پاکستان گدھ کی طرح سر پر منڈلا رہا ہے ـــــ اور یہ لوگ ...... کس باریکی سے ڈھونڈ رہا تھا داغ ناشپاتیوں میں یہ خریدار ـــــ اور جو دل میں ناسور بڑھ رہے ہیں۔ اُنھیں کوئی نہیں ٹٹولتا ـــــ"

اور وہ بھی تو اپنا جواب تولے بغیر ہی دے دیگا ـــــ "ہاں بھئی عزیزے ـــــ عجیب لوگ ہیں یہ ـــــ پر کچھ سُنا تم نے .... ہندوستان میں پھل ڈبوں میں بند کرنے کے لئے کچھ نئے کارخانے کھل رہے ہیں۔ اب تو پھلوں کی مانگ بڑھ جائے گی ـــــ پرمٹ لا دو نا کہیں سے ـــــ پھل پڑے پڑے سڑ رہے ہیں ـــــ"

عزیزا سنے گا اور ایسے سر ہلائے گا جیسے اُس سے بالکل مایوس ہو گیا ہو ـــــ "ارے میں جن لوگوں کی باتیں کر رہا ہوں تم بھی اُن میں سے ایک ہو ـــــ" پر اُس کو کھسیانہ دیکھ کر عزیزہ جلدی سے بات موڑے گا ـــــ "تم فکر نہ کرو .... پرمٹ کے لئے کوشش کروں گا۔ پر بھئی اپنے اِردگرد کا بھی کچھ دھیان رکھا کرو۔ پتھر تو ہو نہیں تم ـــــ اچھا بھئی میں تو چلا گھر کو ـــــ"

نورہ عزیزے کو گھر کی اور جاتے دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرے گا۔ کیا واقعی اس کا دماغ ٹھیک نہیں۔ اتنا کچھ دنیا میں ہو رہا ہے، اور وہ ہے کہ ....!

دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ واقعی اُس کا دماغ ٹھیک نہیں۔ وہ یہاں بیٹھے بیٹھے معمول کے متعلق سوچ رہا ہے اور گھر پر ہرشی چاول کا انتظار کر رہی تھی ـــــ دو دن سے چاول ختم ہو گئے تھے اور اُس کے پاس کوئی پیسہ بھی نہ تھا خریدنے کے لئے ...... پھل پڑے پڑے سڑ رہے تھے ـــــ یہ دو دن وہ سوکھے مرجھاتے پھلوں پر ہی گذارہ کر آئے تھے۔ تاجرہ سے تو نگلے نہ جاتے تھے یہ پھل اور ہرشی بے چاری .... بڑھاپے میں جس نے اُس

کے گھر کی چار دیواری کو روشن کیا تھا۔ کتنی مچلی تھی وہ چاولوں کے لئے ــــ ؟
رو رو کر آنکھیں لال ہو گئی تھیں اُس کی ــــ !

سڑک پر نگاہیں گاڑھتے ہوئے وہ سوچنے لگا ــــ "عزیزے سے کیسے مانگ لوں ...... بارہ سیر تو اُدھار آئے ہیں اُس کے گھر سے .... اور شاید اب اُس کے پاس بھی کچھ نہ ہوں ...... تو ..... تو ..... کچھ نہ سُوجھ کر وہ بڑبڑا اُٹھا ــــ خدایا ــــ یہ ہری ہری ناشپاتیاں ــــ لال لال سیب ــــ پیلے پیلے سنہرے بگو گوشے ــــ آبِ حیات کے کٹورے صرف سڑنے کیلئے ہی پیدا کئے ہیں تم ــــ کیا ہاجرہ کو سوکھے سڑے پھل زبردستی نگلنے پڑینگے ــــ کیا ہر شی کی آنکھوں میں بھوک اسنونی ہی چاہئے ...... نہیں .... ایسا نہیں ہونا چاہئے ...... اُسے چاول لانے پڑیں گے ...... اپنی ہر شی کے لئے کہیں سے لانے پڑینگے۔" اور اُس نے عزیزہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو پھر سے دل کو آمادہ کیا۔ وہ عزیزے کی طرف مڑا تو ٹھٹھک سا گیا۔

عزیزہ خلافِ معمول چُپ بیٹھا تھا۔ چلم بُجھ گئی تھی ــــ پھر بھی وہ حقّے کے کش کھینچنے میں مصروف تھا۔ ماتھے پر کی جھریاں اور گہری ہو گئی تھیں۔ نورے سے رہا نہ گیا۔ عزیزے کو اتنا خاموش دیکھ کر وہ سب کچھ بھُول گیا ــــ "کس سوچ میں ہو عزیزے ...."

عزیزہ چونک نہ پڑا اور اُسے مایوسی ہوئی ــــ عزیز اڈکریوں کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے کہنے لگا ــــ "دنیا میں امن پسند لوگوں کو للکارا جا رہا ہے۔"

اب کے نُورا خود چونک گیا ــــ "کیوں پاکستانیوں نے پھر حملہ کیا یا کوریا میں پھر جنگ شروع ہو گئی ــــ ؟"

"نہیں بھئی ــــ مگر خطرہ بڑھ رہا ہے ــــ بغداد پیکیٹ نے ہندوستان کو گھیرنا شروع کیا، اور شاید ایشیا میں جنگ چھڑ جائے ــــ عزیزے نے حقہ بدستور گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا ــــ

"جیسے جرمن جنگ ــــ" نُورا دل کی دھڑکنوں کی تیزی کو سنبھالتے ہوئے

بول پڑا ــــ "ہاں بلکہ اس سے بھی خطرناک جنگ ــــ ایٹم اور ہائیڈروجن کی جنگ ــــ" اور عزیزے نے حقّہ کی نے کو آخر مُنہ سے جُدا کر ہی دیا۔

نورا سوچنے لگا۔ پر وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اُس کے دل میں خوشی کا طوفان پھوٹ پڑا۔ جس کی تیزی اُس کے چہرے پر بھی تیزی سے عیاں ہونے لگی۔ پھلوں کی گلی سڑی ٹوکریوں پر نگاہیں جاتے ہوئے وہ بیتے زمانے کو یاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔

جب وہ دکان دار نہ تھا بلکہ دن میں موسمی میوؤں سے بھری چھابڑی اُٹھائے پھرا کرتا تھا ــــ چھ آنے سیر ــــ خوبانیاں او ــــ آڑو او ...... ناشپاتیاں او ......

یہ آوازیں گلے کو زخمی بنا دیتی تھیں اور دن بھر سڑکیں ناپ ناپ کے وہ شام کو ننگے پیروں میں چھالوں کی کسک لیکر لوٹتا تھا۔ کمائی کے چار یا پانچ آنے اُسے دن بھر کی تھکاوٹ سے نجات نہ دلاتے تھے، اور دوسرے دن پُرانی تھکاوٹ کو سنبھالتے ہوئے وہ پھر گلی کوچوں کے چکر کاٹنے لگتا۔ اور یکایک اُس کی زندگی میں تغیر رونما ہوا۔ جرمن جنگ چھڑ گئی۔ فوجی اور گورے کافی تعداد میں آنے لگے۔ اُس کی بکری بڑھی اور وہ چھابڑی والے سے گاڑی والا بن بیٹھا ــــ صُبح صُبح وہ گاڑی لے کر کہیں چوراہے پر ڈیرا جما دیتا ــــ دن بھر بیٹھے بیٹھے آرام سے پھل بیچتا رہتا اور شام کو خالی گاڑی دھکیلتا ہوا گھر کو اُمیدوں سے پُر لوٹ آتا۔ کتنے اچھے دن تھے وہ ــــ اُن دنوں اُس نے اچھا کھایا، اچھا پیا، اچھا پہنا ...... شادی کی ...... چھوٹا سا مکان بنوایا ...... جنگ کی تیز رفتاری نے اُس کی خواہشوں کو بھی تیز کر دیا۔ چھوٹی سی گاڑی اور اُس پر کُچھ گِنی چُنی ٹوکریاں ــــ نُور محمّد پھل والا ہوکر اُس سے سہانہ گیا۔ اِس لئے اُس نے ایک چھوٹی سی دُکان کرایہ پر لی۔ دُکان پہ بنی سیڑھیوں پر رکھی ہوئی ٹوکریوں پر رکھے ہوئے رنگ برنگے ہرے ...... اُن پر خوبصورت میٹھے پھل سجے سنوارے ــــ کتنے اچھے لگا کرتے تھے ــــ اور کڑے ہی اُس کی دکان لوگوں کی نظروں کو کھینچا کرتی تھی۔ اُس کی دکان ہی تو سارے بازار کی رونق تھی، آرائش تھی۔ اور اب بھی آرائش ہوتی اگر قبائلی حملہ آور نہ آئے ہوتے۔

وہ لٹیرے کیا آ گئے کہ اُس کے برسوں کے پسینے مٹی میں مل گئے۔ جو کچھ بچا کھچا تھا وہ اب تک پیٹ میں جھونکتا آیا تھا اور لال لال ——— پیلے پیلے ——— پھل اُس کی آنکھوں کے سامنے سڑتے رہے اور اب اگر جنگ چھڑ گئی تو ———

اُس کو عزیزے کے نکرمند چہرے سے چڑ سی ہو گئی، وہ بول اُٹھا

"تم ایسے کیوں بیٹھے ہو ———؟ ارے تم خوش ہو جاؤ عزیزے ——— جانتے ہو جرمن جنگ سے پہلے میری کیا حالت تھی ——— چھابڑی اُٹھائے پھرتا تھا۔ پر جنگ کے بعد میری صورت ہی بدل گئی ——— میری ہی کیا ——— جنگ نے ہزاروں کی صورت بدل دی ——— یہ دکان بھی تو ———"

"کیا کہہ رہے ہو ———؟" عزیزا چونک سا پڑا "تم خوش ہو رہے ہو۔"

"کیوں نہیں ——— اگر جنگ چھڑ گئی تو یہ دکان پھر سے چمک اُٹھے گی ...... پہلی جنگ میں، میں نے بہت کمایا ...... اگر یہ قبائلی سالے ......" وہ بات پوری نہ کر سکا۔

عزیزا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو اور وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

"تم بدھو ہو نُورے ———" اور نُورے نے معمول کی طرح سر نہ جھکا لیا

عزیزا کہتا گیا

"یہ ٹھیک ہے جرمن جنگ کے سبب تم امیر بن گئے۔ چھابڑی اُٹھائے پھرنے کے بجائے دکاندار بن بیٹھے۔ پر جرمن جنگ بہت دور تھی۔ ہزاروں میل دور ——— اِس لئے تم جنگ کا ٹھیک اندازہ نہ لگا سکے۔ سوچو تو...... وہاں لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہو گی!"

"مجھے کیا معلوم ......؟ پھر بھی میں نے جرمن جنگ میں کافی نفع اُٹھایا۔" نُورا بڑی مشکل سے نظر آتی ہوئی اُمید بھری کرن کو نہ کھونا چاہتا تھا

"اور یہی تیرے لئے کافی ہے ——— کیوں ———" عزیزا غصے سے کہنے لگا ———

"تم جنگ کا نام سُن کر یہی سمجھتے ہو کہ جنگ ایک معمولی حادثہ ہے۔ صرف وہ تم کو دکان دوبارہ بھرتی ہے......"

"میں نے کب کہا کہ ـــ" نُورا عزیزے کی تیزی کو نہ سہہ کر صفائی پیش کرنے لگا۔

"تم نے نہ کہا ہو ـــ پھر بھی تمہارا مطلب یہی ہے" عزیزا واقعی بپھر گیا ـــ "جرمن جنگ کی جتنی تباہ کاریاں ہوئیں وہ تمہاری نظر میں تو کیا ـــ تمہارے خیال سے بھی دُور ہیں۔ اپنی ہی مثال لو ـــ قبائلیوں نے حملہ کیا تو تمہارے اپنے ملک کے کتنے ہی گاؤں ـــ کتنے ہی قصبے نذرِ آتش ہوگئے کتنے ہی بے گناہ انسان کچلے گئے ـــ ابھی ابھی لاشوں کی گھِن فضا میں محلول ہے ـــ تم جو اُن کی پہنچ سے باہر تھے۔ جنگ کے زہریلے اثرات سے بچ نہ پائے۔ تمہارا سارا کاروبار ختم ہوگیا۔ تمہارے ٹھیکے گئے، اور اس وقت تمہارے گھر میں سات سال بعد ـــ"

نُورا بات کاٹتے ہوئے بولا ـــ "ٹھیک ہے اِس وقت میرے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر شے بھوکی ہے۔ حاجرہ بھوکی ہے۔ میں بھوکا ہوں ...... اسی لئے تو میں جنگ چاہتا ہوں، تاکہ میرا کاروبار پھر چل نکلے اور ہم بھوکے نہ رہیں۔" نُورا آج زندگی کی ساری تلخی ...... بھوک کی ساری کسک عزیزے تک پہنچانا چاہتا تھا ـــ اتنے سال کے بعد کے ـــ اتنے برسوں کی مصیبت نے اُسے اب آخری حد تک پہنچا دیا تھا ـــ پر عزیزے نے اُسے روک لیا۔ عزیزا کہہ رہا تھا ـــ

"تم جذبات کی رو میں ڈوبتے جا رہے ہو نُورے ـــ تم ٹھنڈے دماغ سے سوچتے کیوں نہیں ـــ کیا بھوک نے تمہیں اتنا گرا دیا ہے ـــ؟ جنگ ہی نے تو تمہاری یہ حالت بنا دی ہے ـــ اگر تم جنگ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ تمہاری حالت کچھ ٹھیک ہو جائے گی تو یہ تمہاری بھول ہے ـــ حماقت ہے

...... نہ ...... نہ ...... تم نہ بولو۔ تم صرف اتنا سوچ لو کہ اگر جنگ پھیلتے پھیلتے یہاں تک پہنچ جائیگی ...... تب تم کہاں جاؤ گے ــــ کیا کرو گے ــــ تمہاری بیوی ...... تمہاری بچی ...... معصوم ہر شئی ...... معصوم ہر شئی ...... معصوم ہر ...
وُہ اور کچھ اور نہ سُن سکا ــــ دماغ کے فراموش کونے سے درد کی ایک لہر اُٹھی اور سارے بدن پر چھا گئی اور وہ بوکھلا سا گیا۔ آنکھوں کے سامنے ماضی کے دھندلے نقش اُبھرنے لگے۔ اس پر حقیقت ایک بڑے پھوڑے کی طرح واضح ہونے لگی جو بغیر درد کے اُبھر آتا ہے۔ اور صرف چوٹ لگنے پر پتہ دیتا ہے کہ میں اُبھر آیا ہوں اور خرابے نے واقعی سخت چوٹ کی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ آئینے میں اُس کی آنکھیں پھیلتی جا رہی ہیں ــــ پھیلتی جا رہی ہیں ــــ !

وہ اکیلا لڑکھڑاتے اور سفیدے کے درختوں کے درمیان پگڈنڈی کو گھور رہا تھا ــــ پگڈنڈی کے ساتھ ہی ٹیلی فون کا ٹیڑھا ہوا کھمبا الم ناک داستان کا آغاز کر رہا تھا ــــ وہ خوامخواہ سوچنے لگا تھا ــــ "اب آیا ہوں تو رُکنے سے کیا فائدہ ــــ جیسے وہ اب واپس لوٹ سکتا تھا۔ بس تو کب کی چلی گئی تھی اس لئے کچھ ہچکچاتے ہوئے وہ پاؤں کے نزدیک پڑی ہوئی گٹھری کو کندے کا سہارا دیکر اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر ہو لیا۔ پگڈنڈی کے اِردگرد خالی کھیت خاموش تھے اور اونچی زمین پر جو کھلیاں کا کام دیتی تھی پر کالے راکھ کے ڈھیر سیاہ دھبے سے دکھائی دے رہے تھے اور اُن کے ہرے درخت کا جُھنڈ آپس میں سرگوشی سی کر رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ کی آڑ میں گاؤں تھا، اور اُس کے بعد میوے کا باغ ...... جسے دیکھنے کے لئے وہ ہاجرہ کے منع کرنے کے باوجود یہاں آیا تھا۔

شہر چھوڑتے ہی اُس کی نگاہیں قبائلیوں کی تباہ کاریوں سے ٹکرا گئی تھیں جلی فصل سے بھرے کھلیاں ــــ اَدھ جلے مکان ــــ ملبے کے ڈھیروں کے ساتھ ساتھ انسانی ہڈیوں کے ڈھیر ...... پیڑوں کی ٹوٹی شاخیں بکھری ہوئیں ...... اور کتوں کے جھنڈ کے جھنڈ ــــ جو انسانی گوشت کھا کھا کے موٹے ہو گئے تھے ــــ

سڑک کے دونوں طرف گڑھے کھدے ہوئے ـــــ زمین کی ہری چھاتی پر مٹیالے ناسور ـــــ اُسے محسوس ہوا تھا، ان گڑھوں سے جن کے کناروں پر کھدی مٹی کے ڈھیر ابھی نم تھے۔ قبائلیوں کے جہنمی چہرے دیکھتے ہی دیکھتے نمودار ہوں گے۔ محسوس ہوتے ہی اُس کا دم گھٹ سا گیا۔ ٹھنڈ کے باوجود چہرے پر نمی پھُوٹ پڑی تھی۔

وہ کھائیاں پیچھے چھوڑ چکا تھا اور اب وہ درختوں کے جھنڈ میں سے گزر رہا تھا۔ درختوں کے گھنے تنوں کی درزمیں سے اُس کی نگاہیں کبھی کبھی کسی اُدھ جلے مکان میں پھنس سی جاتی تھیں اور دوسرے ہی لمحے وہ خوف سے گٹھڑی کو کندھے پر زور سے دبانے لگتا۔ آج اُس نے بہت کچھ دیکھا تھا...... بہت کچھ سہا تھا۔

گٹھڑی کچھ بھاری نہ تھی۔ پھر بھی کندھے پر بوجھ بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ درختوں کا جھنڈ پار کر کے وہ ایک ہی دفعہ گاؤں کی اور دیکھ سکا ـــــ دیکھتے ہی اُسے کپکپی سی آنے لگی۔ گاؤں کی جگہ مٹی اور پتھر کے ڈھیر کھڑے تھے۔ مٹی اور پتھر کے دراڑوں میں کہیں کہیں ہلکا ہلکا دھواں نکل کے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا فضا میں منتشر ہو رہا تھا ادھ جلے شہتیر کالے ناگوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ ٹوٹی دیواریں اپنی بربادی پر بین کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ نزدیک پہنچا تو دو چار کتے ملبے کے ڈھیروں پر اُبھر کر بھونکنے لگے۔ جب کبھی وہ یہاں آیا کرتا تھا۔ یہ کتے بھونک بھونک کر گاؤں والوں کو اُس کے آنے کا پتہ دیتے تھے۔ اور کچھ بچے ـــــ دو چار آدمی ـــــ مکانوں سے باہر نکل کر آنے والے مہمان کو دُور سے ہی پہچاننے کی کوشش کرتے تھے۔ کھڑکی میں سے کسی عورت کا لال پھرن دیکھ کر وہ خوش ہو جاتا تھا۔ پر آج مکان نہ تھے مکانوں میں کھڑکیاں نہ تھیں۔ اِس لئے یہاں کوئی نہیں آیا۔ چنانچہ وہ اپنی نگاہیں گھبرا کر پھر پگڈنڈی پر جھکانے کے لئے مجبور ہو گیا۔

وہ ملبے اور پتھروں کے ایک بڑے ڈھیر کے قریب پہنچ گیا تھا کہ داہنے ہاتھ پر پتھر ہلنے کی آواز سنائی دی۔ اور اُس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ گھبرا کر اُس نے نظر پھیری اُسے وحشت سی ہونے لگی۔ سامنے کوئی پھٹے چیتھڑوں میں ملبوس لنگڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ آدمی

سامنے آیا۔ نُورے کو چہرہ کچھ مانوس سا محسوس ہوا۔ یہ پتلی ناک —— پتلے پتلے ہونٹ —— پچکے گال —— گلے میں کالا تعویذ —— اور تعویذ سفید دھاگے سے کاڑھا ہوا ننھا سا تارا —— اُس کے چہرے پر خوشی کا دریا موجزن ہوا۔

"غفار جو تم ہو ——" وہ چیخ پڑا۔ دفعتاً غفار جو کی لڑکھڑاہٹ نے اُسے پھر حقیقت کے خوفناک گڑھے میں گھسیٹ دیا۔ ہونٹ پھیلتے پھیلتے رُک گئے، اور ہاتھ تیزی سے غفار جو کی امداد کو بڑھ گئے۔

غفار جو —— عبدالغفار —— جسے گاؤں والے بہت مانتے تھے۔ گاؤں کا سب سے بڑا ہنس مکھ آدمی —— سمجھ دار —— صوفی —— صاف ستھرا غفار جو —— ایک پھٹے تکیے سے بھی بُری حالت میں —— نُورے کو رونا سا آ گیا —— غفار جو ہانپنے لگا۔ اِس لئے وہ دونوں ہی ملبے کے ڈھیر پر بیٹھ گئے اور کتے اِرد گرد گھیرا ڈالے انہیں تیز نظروں سے تکنے لگے۔

"ٹانگ کو کیا ہوا ——" خاموشی سے گھبرا کر نُورا بول اُٹھا

"کچھ نہیں —— گولی لگ گئی ہے ——" اور وہ پریشان ہوا۔ غفار جو ایسے کہہ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو —— سوئی چبھ گئی ہے —— اور سوئی تو روز چبھ جاتی ہے۔"

"تم حیران ہو رہے ہو —— کیوں —— یہ تو اب بہت پُرانی ہے ہم گولیوں سے اچھی طرح مانوس ہو گئے ہیں ——" غفار جو گٹھڑی پر نگاہیں گاڑھے رُک رُک کر کہہ رہا تھا —— "اِن آنکھوں نے ہزاروں کو گولیاں کھاتے دیکھا ہے، اور تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا —— اِن کانوں نے ہزاروں دھماکے سنے جن میں معصوم بچّوں کی چیخ و پکار بھی دب کے رہ گئی۔ گولیاں یہاں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ پاؤں تلے روندھی جاتی تھیں۔ سیسے کے ٹکڑے —— خوبصورت گول گول ٹکڑے —— یہ بہت زہریلے —— موت سے لدے پھندے —— اور وہ لوگ بھی بہت زہریلے تھے۔ کھدیانوں کو

آگ لگانے جا رہے تھے۔ ہم نے انہیں روکنا چاہا تو پھر دھڑا دھڑ موت برسانے لگے۔ اب کوئی ان سے اتنا پوچھے کہ گولیاں چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب بہو بیٹیوں کی بے حرمتی کی ——— بچوں کو روندا ——— ملا ——— گھر بار جلا ڈالے ——— قرآن پاک کی بے عزتی کی ——— یہ گولیاں کم تھیں کیا ——— جو اور گولیاں چلانے کی ضرورت پڑی ———"

غفار جو کی آواز میں موت حاوی تھی ——— وہ روکنا چاہتا تھا۔ غفار جو کو ——— کہنا چاہتا تھا کہ یہ برہنہ کھیت ——— کچھ ہفتے پہلے جو شاداب تھے یہ ملبے کے ڈھیر جن میں نقرئی قہقہے گونجا کرتے تھے۔ یہ جلے کھلیان ——— کسان کے خوابوں کی تعبیر ——— مزدور کی محنت کا انعام اور یہ گاؤں جو خوشی..... غم...... محبت کا گہوارہ تھا جس میں زندگی مچلتی تھی، کافی ہیں ہراساں کرنے کے لئے ——— انسان کو پاگل بنانے کے لئے ——— کیا کچھ نہ کہنا چاہتا تھا وہ ——— پر وہ کچھ نہ کہہ سکا ——— اس نے تو صرف دیکھا تھا۔ لیکن غفار جو نے سہا تھا۔ برداشت کیا تھا۔ اس لئے کچھ نہ سوجھ کر وہ سامنے پڑی گٹھڑی کو مروڑنے لگا۔ غفار جو سے دفعتاً پوچھا

"اس میں کیا ہے ——— ؟

"بس ——— یہی ——— کچھ کپڑے اور ———"

"کپڑے ——— کپڑے کس کے لئے ———" غفار جو مہنس سا دیا تھا۔

"عائشہ کے لئے ——— اور کچھ نمک بھی ہے ——— نمک کا کال ہے آج کل"۔ ... میں نے سوچا ———"گاؤں میں ———"

غفار جو کے ماتھے کی شکنیں گہری ہوگئیں۔ آنکھوں میں وہی پرانی صوفیانہ چمک عود کر آئی ——— گٹھڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگا۔

"کپڑے اور نمک ——— کپڑے بذات خود ارمان ہیں ——— قہقہے ہیں۔

خوبصورتی ہیں —— اور نمک —— نمک جھول ہے —— جلن ہے —— حیدہ جہد ہے —— جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو زندگی ہے —— تمہارے مالی کی بیٹی عائشہ —— بے چاری عائشہ کو اب چیزوں کی ضرورت نہیں —— پر گاؤں میں اور بھی تو ہیں —— اور بھی ——"

"کیوں عائشہ کہاں ہے —— کیا ہوا اُسے ——" اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ کتنی دفعہ اُبھرا اور ڈوب گیا۔ اُس کا دل —— وہ جھنجلا اُٹھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جھنجلاہٹ غفار جو کی کھردری آواز کے زیر و بم پر ڈوبنے لگی۔ غفار جو کی آواز میں چھپی بے کسی —— بے بسی اور غصے کی لہروں کے درمیان اُس نے عائشہ کے باپ —— اپنے بوڑھے مالی کو گولی کھاتے محسوس کیا۔ عائشہ کو گولی کھاتے محسوس کیا —— عائشہ کے ننھے شفاف سینے پر خون اُبھرتا جا رہا تھا —— خون کا دھبہ پھیلتا جا رہا تھا —— بُری طرح پھیلتا جا رہا تھا۔

اور لال لال گرم گرم خون آئینے پر پھیلتا جا رہا تھا۔ رِس رِس کے پھیلتا جا رہا تھا۔ نورے کی آنکھوں کے بیچ کچھ اُبلتا سا محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم لوہے سے داغ دی ہوں آنکھیں.... درد کی شدت نے اُسے آنکھیں بھیج لینے پر مجبور کیا —— پر وہ ذہن سے جنگ کی تباہ کاریوں کو بھلا نہ سکا۔ عائشہ —— زخمی —— سسکتی —— موت کی تاریک گہرائیوں میں ڈوبتی عائشہ اور اُس کی اپنی ننھی ہرشی —— بڑھاپے کا سہارا —— ہرشی اور عائشہ —— فرق تو کچھ بھی نہیں.... اوہ..... کچھ بھی نہیں ——!

نورے نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں تو اُس کی نگاہیں سامنے پڑی ہوئی ٹوکری پر جم سی گئیں۔ ٹوکری میں گلے سڑے پھل —— ناشپاتی —— سیب —— کیلے —— آڑو —— بے ترتیب پڑے تھے اور اُسے محسوس ہوا کہ جنگ سب پھلوں کو گلا سڑا دیتی ہے۔ واقعی سب پھلوں کو گلا سڑا دیتی ہے۔ چاہے وہ کیلا ہو یا آڑو... سیب ہو یا ناشپاتی.... کشمیر ہو یا کوریا..... سب گل سڑ جاتے ہیں —— سب گل سڑ جاتے ہیں.....!

اُمیش کول

عورت اور مرد

دو سال پہلے خدیجہ کے باپ کی بوڑھی اُمنگیں ایک مجبوری سے ٹکرائی تھیں اور ایک ضرورت نے اُس کے تھکے ماندے دِنوں کو کھٹکھٹایا تھا۔ خدیجہ کا بیاہ ــــ اور باپ کی نظروں کے سامنے ایک ڈولی رینگ گئی تھی اور کانوں میں بھانڈوں کی آوازوں کا گمان ہوا تھا۔ اُسے محسوس ہوا تھا جیسے بستی کی عورتیں کندھے سے کندھا لگائے کچھ گا رہی تھیں اور کوئی ادھیڑ عورت چھینٹ کا ایک نیا سا پھرن پہنے ایک کانگڑی لئے بھاگ دوڑ میں مصروف ہے اور کانگڑی میں اِسبند جل رہا ہے، اور ایک جوان صاف ستھری پگڑی باندھے چار خانے کی ایک نئی سوتی چادر اوڑھے گھوڑے پر سوار ہو کے آ رہا ہے ــــ ایک پٹاخہ چھوٹتا ہے ــــ "خدیجی تیرا بیاہ ہوگا" ــــ باپ نے یکایک کہا تھا۔ اور خدیجہ ایکبار چونک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے اُس کی سانسیں رُک گئی تھیں۔ اور دھڑکنیں خلط ملط سی ہوئیں۔ جوانی کلبلائی مگر جلدی سو پڑی ــــ اور پھر کچھ نہ ہوا۔

اپنی ڈھیلی خشک زُلفوں کو ہونٹوں میں دبائے دابے خدیجہ نے کوئی خاکہ نہیں کھینچا تھا اور نہ ہی چوٹیاں بناتے بناتے کسی سوچ میں پڑ کر وہ رُک گئی تھی۔ اپنے سینے کے اُبھار کے احساس نے اُسے کسی لمحے بھی نہ شرمایا تھا۔ اُس کی چتون میں کوئی تھکاوٹ نہ تھی اور نہ اُس کی نظریں بوجھل ہوئی تھیں ــــ اُس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔

اور ایک شام جب بادلوں کے کنارے لال ہوئے تھے اور کھیتوں کے آر پار دھواں سا چھا رہا تھا۔ خدیجہ بیاہ دی گئی۔ سکندر کے ساتھ ــــ سکندر ــــ ایک ایسا تانگے جو سڑک کے کنارے

زندگی کاٹتا ہے۔ کہیں پر پختہ سڑک سے کوئی کنکر اُکھڑے تو اُسے واپس دباتا ہے۔ اُس کے اُوپر تھوڑی سی مٹی تھوڑی سی ریت ڈال کر اسے ہموار کرتا ہے اور بھاگتی ہوئی لاریوں کے پیچھے نظریں دوڑاتا ہے —— لاریاں جن کے نیچے چار پہیے نہایت تیزی کے ساتھ گھومتے ہیں اور جن کی چھتوں پر چائے کی بوریاں ہوتی ہیں۔ میووں سے بھری پیٹیاں ہوتی ہیں اور مچھلیوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے ڈرکرے ہوا کرتے ہیں۔ اور کبھی کوئی مُرغا ہوا کرتا ہے۔

سکندر کا باپ بھی قُلی تھا اور بچپن سے ہی باپ اُسے اپنے ساتھ لے جاکر ماہیں میں بٹھایا کرتا تھا جس طرح چرواہے اپنے بھیڑ کو یہاں بٹھاتے ہیں۔ یا خوانچے والے خوانچوں کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن سکندر کو تب تب اس کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ کئی بار باپ کو چکمہ دیکر بھاگ بھی آیا تھا۔ گر باپ سے بچکر کہاں جاتا۔ پر ایسی حالت میں باپ کے مضبوط ہاتھ سکندر کی ننھی گردن پر پڑتے، اور سکندر کو اُس کے ساتھ جانا پڑتا۔ باپ آگے آگے اور بیٹا پیچھے پیچھے۔ بیٹا پیچھے پیچھے اور باپ آگے آگے —— چار قدم لمبا ایک محدود پنجرہ جسمیں دُنیا کا بڑا جانور ہاتھ پاؤں مار کر رہ جاتا ہے۔

آخر باپ کی تمنا اس کی موت کے بعد ہی رنگ لائی، اور "صاحب" نے مہربانی کرکے اس کی پرانی اور پھیکے لال رنگ کی پگڑی سکندر کے سر پر رکھ لی اور اب سکندر باضابطہ گھر بسانے جارہا تھا

سڑک سے دو میل پگڈنڈی چل کر چندر ہامہ میں اُس کا گھر تھا۔ ایک جھونپڑا جس کے اُوپر اللہ کی رحمت ایک پھوس چھت کی صورت میں سایہ فگن تھی۔ اور نیچے انسان کا معجزہ ایک نرتش۔ مٹی کی چار دیواریں تھیں۔ جن میں کوئی کنکر نہ تھا اس وجہ سے انہیں کبھی ہموار کرنے کی نوبت نہ آئی تھی —— اور اُس شام ایک مدھم لالٹین کے سہارے دُلہن کو لاکر اس جھونپڑے میں بٹھایا گیا تھا۔ جیسے کوئی طالب علم تکون میں دائرہ بٹھاتا ہے۔ محض بٹھانے کی غرض سے ——

گھر میں دو ہانڈیاں تھیں۔ ایک چٹائی تھی مٹی کا ایک دیا، اور بغیر ڈھکنے کے لکڑی کا ایک بدصورت صندوقچہ اور بکھرے ہوئے چند چیتھڑے —— اور بس یہی

تھی اُس کی عُمر بھر کی پُونجی جو اُس نے اپنے آپ کو ایک شاہراہ کی بھینٹ چڑھا کر حاصِل کی تھی۔

یہ سب کہیں سے آتے ہیں اور کہیں جاتے ہیں، کبھی کوئی لاری رُکنے نہیں پاتی۔ کبھی کوئی مُرغا چھلانگ کر ہانڈی میں نہیں گر جاتا۔ کبھی کوئی مچھلی حصے میں نہیں آتی —— زندگی دو بڑی بڑی منڈیوں کے بیچ ایک نامعلوم سے مقام پر لڑکھڑاتی ہے۔

خدیجہ اِن سب کے سہارے دِن جوڑنے والی تھی کہ اُسے سِکندر کی ٹھوس محبّت ملی اور پھر ان کو چھیدتے ہوئے اُس کے شانوں پر مینخوں کے نشان پڑے۔ اُس کا خاوند اُسے جوتوں سے پیٹتا گیا۔ دوشیزگی اور گرہستی کے سنگم پر چند مینخیں گاڑ دی گئی تھیں تاکہ تکون سے دائرہ اُکھڑنے نہ پائے۔ تکون اور دائرہ —— مرد اور عورت!

اُس روز سِکندر سویرے ہی آیا۔ تھکا ہوا تھا مگر چہرے پر بشاشت تھی۔ ہڈیوں میں درد تھا۔ مگر حرکت میں پھرتی تھی۔ پھٹا ہوا کوٹ تھا مگر جیب میں روپے تھے۔ اُس کو تنخواہ ملی تھی۔ ایک دم بارہ روپے۔

گھٹنوں پر پگڑی رکھتے رکھتے وہ خدیجہ سے مخاطب ہوا —— "خدیجی خُدا نے ہماری سُن لی"

"کیا ——؟" خدیجہ کی زخمی آرزوئیں اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں —— اور پھر سکندر نے کہا —— "تنخواہ ملی —— ہفتہ بعد عید ہے ایک مُرغا لیں گے ——" خدیجہ کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اُسے ایک دوسری بات یاد آ گئی۔ ذرا وقفے کے بعد بولی —— "مُرغ سے پہلے تو صدیق کی رقم چکانی ہے مہینہ پہلے خان لئے ہیں۔ اب تک ایک کوڑی بھی ادا نہ ہوئی۔ وہ آسمان سر پر اُٹھا لیں گے"

"کیا آسمان سر پر اُٹھا لیں گے ——" سکندر کچھ طیش میں آیا۔ کچھ تاؤ کے ساتھ بولا۔ اُسے تنخواہ ملی تھی اور اُس کی جیب —— بارہ روپے تھے —— زیادہ اوٹ پٹانگ کی تو کہہ دینگے کہ دھان اُٹھا کر واپس لے جائیں۔

"مگر وہ تو ختم ہوئے ہیں ——" خدیجہ نے اپنے آپ کو بھول کر ذرا شوخی کے ساتھ کہا
ختم ہوئے —— سکندر کو حیرت ہوئی۔ کیسے ابھی سے ختم ہوئے —— ؟
اُس نے سوال کیا —— ؟ تو زیادہ خرچ کرتی ہے —— کچھ بھر گیا —— خدیجہ بگڑ کر
بولی —— میں نے کون سے میکے بھیجے۔ جو کچھ خرچ ہوا تمہارے دیکھتے ہوئے ہوا۔ میرے
دیکھتے کیا ہوا۔ میں کوئی دھرنا مارتا ہوں یہاں گھر پر صبح سویرے جاتا ہوں۔ شام گئے آتا ہوں
مجھے کیا معلوم تم میرے پیچھے کیا کرتی ہو۔ الفاظ کڑوے تھے۔ خدیجہ چپ نہ رہ سکی۔ چلا اُٹھی۔
—— کیا کرتی ہوں۔ کوئی پیشہ کماتی ہوں ——"

سکندر اور بھی زور سے چلایا —— "کماتی کیوں نہیں جا کر —— یہاں
کیا کھائے گی۔ کلیجہ اپنا"

"اور تم کیا کھاؤ گے ——" ؟

"میں کہتا ہوں چپ رہ"

"مجھے دھمکاتے ہے"

"نہیں رہے گی چپ ——" کہنے کے ساتھ ہی سکندر نے سوٹی اُٹھائی
اور خدیجہ کے سر پر دے ماری، اور پھر جھونپڑی میں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ یہاں
تک کہ پڑوسن ایک دفعہ پھر آ پہنچی اور بیچ بچاؤ میں پڑ کر نبیٹارا کر لیا۔ خدیجہ بے دم
سی پڑ گئی اور سکندر گالیاں جھاڑتے باہر آ گیا۔ اور اپنے کام پر چلا گیا۔ پڑوسن اپنے
گھر چلی گئی۔ اور خدیجہ سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر اُس نے پیٹنا شروع کیا۔ اور تب وہ
اُس دن کو کوسنے لگی جس دن وہ اس گھر میں آئی تھی۔ جس دن اُس کا بیاہ ہوا
تھا۔ پھر وہ اپنے باپ کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ اُس بدمعاش کو جس نے یہ رشتہ ٹھہرایا تھا
اور اُس پیر کو جس نے نکاح پڑھا تھا۔ اور تب تھک کر باہر دھوپ میں چل کر بیٹھ
گئی اور اُنگلی سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگی۔

اُس کے دل کی ساری ضربیں اور دماغ کی ساری کیفیتیں اُگل اُگل کر لکیروں میں
سمٹ رہی تھیں۔

ایک روندی ہوئی بے جان سی ٹیڑھی لکیر اور گہری باغیانہ سی کھڑی لکیر، پھر دونوں کو کاٹتی ہوئی ایک تیسری لکیر جسمیں نہ یہ تھا اور نہ وہ ——— اور تب لکیروں کی ایک بلڑ جن میں انتقام اور بے بسی کا احوال تھا، خودکشی اور موت کے ارادے تھے۔ اُڑ جانے اور بھاگنے کے فیصلے تھے۔

دھوپ ڈھل گئی اور اب سُورج کی کرنیں جھونپڑی کی چھت کے کناروں کو چھو رہی تھیں۔ اتنے میں آس پاس سے کچھ عورتیں آکر پڑوسن کے صحن میں جمع ہوگئیں اور ایک مختصر سی اُچھل کود کے بعد دو قطاروں میں بٹ کر روف گانے لگیں۔ خدیجہ نے دونوں ہاتھوں سے لکیروں کو مٹا ڈالا اور پھر مٹی کی دیوار سے لگ کر روف گانے والی عورتوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کے شانے دکھ رہے تھے۔ بازو پر دانتوں کے نشانوں میں وقفوں کے بعد درد اُبھر رہا تھا۔ جیسے کوئی سوئی چبھو رہا ہو، اور خدیجہ بنا دیکھے ہی بیچ بیچ میں بازو کو سہلاتی جا رہی تھی۔ انگلیوں پر نیل پڑ گئے تھے۔ اور داہنے پیر پر خون کی ایک لکیر سی جم گئی تھی جس کی اسے کوئی سدھ نہ تھی۔ چہرہ پیلا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ، جو ایسا لگ رہا تھا اس کی اپنی نہیں کسی اور کی ہے۔ کہیں دُور سے کسی مُسکراہٹ کی پرچھائیاں اُس کے ہونٹوں پر پڑ رہی ہیں۔ جس کا منبع خدیجہ میں نہیں بالکل سراب کی طرح جس کا پاس پہنچنے پر کوئی وجود نہیں ملتا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک سطحی چمک جس کے نیچے یاس کے دلدل تھے۔ جیسے کسی جوہڑ کے پانی پر آسمان کی شفاف نیلاہٹ تیر رہی ہو۔

روف کے جھمیلے میں کوئی چھیڑ چلی ایک قہقہہ بلند ہوا۔ خدیجہ کے چہرے پر بھی ایک ہنسی بکھر گئی۔ روف میں پھر باقاعدگی آگئی اور خدیجہ کے چہرے کی ہنسی غائب ہوگئی ایک کھلکھلاہٹ پھر چلی، اور کسی نے وہیں سے آواز دی ——— اری وہ کیا کر رہی ہے اُدھر، اشارہ خدیجہ کی طرف تھا جیسے کوئی ساٹھ سال کی ساس ہے ——— سب دور سے۔ بچنا چاہتی ہے ——— ایک بولی ——— گھسیٹ لا اس ——— دوسری نے کہا ——— اور پڑوسن دوڑ کر آئی اور خدیجہ کے دونوں بازوؤں کو تھاما ———

"اوہ ——"! خدیجہ کراہ اُٹھی —— "بازو کو نہ چھیڑ زونی درد ہوتا ہے۔"
وہ پھر دھیرے سے بولی —— ایسے پنڈ نہیں چھوٹتا۔ روف کرنا ہی پڑے گا۔"
شوخی کے ساتھ اصرار ہوا —— "نہیں" خدیجہ نے پھر سر ہلایا۔
"چل بھی ——" آخری اور پوری کوشش تھی —— خدیجہ نہ ہلی، اور پڑوسن مایوس ہو کر چلدی اور پھر روف میں شامل ہو گئی۔ اور روف کے گیت بدستور شام کی فضاؤں میں جھولنے لگے۔ چاند نکل آیا اور کرنوں نے چندر ماہ کو نکھارا
عورتیں ایک ایک کرکے گئیں —— پڑوسن بھی چلی گئی۔ مگر خدیجہ گم سم وہیں کھڑی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں تھک گئیں۔ اور اُسے اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی —— دیوار سے ہٹ کر وہ دروازے کے قریب آئی۔ مگر ٹھٹھک گئی —— یہاں کون ہے —— یہ گھر کس کا ہے —— آگ لگے اِس جھونپڑے کو —— ! مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا کہ یہ گھر اُسی کا ہے۔ سکندر کون ہوتا ہے اس کو روکنے والا وہ اندر چلنے لگی۔ مگر ہمت نہ ہوئی یا پھر دل نہ چاہا یا ویسے ہی ہٹ سے مجبور ہوئی اور تب صحن میں سے ایک ....
اُٹھاکر اُس نے اُس کا سرہانہ بنایا۔

دیوار پر سے مدتوں کا پڑا ہوا ایک پھٹا ہوا ٹاٹ اُٹھا لائی۔ مگر اُسے پھینک دیا۔ اور پھر ایسے ہی سونے کی کوشش کرنے لگی —— ٹوٹا ہوا جسم رگ رگ میں درد اور تھکی ہوئی آنکھیں ہلکے سر درد کے ساتھ ساتھ خدیجہ کی پلکیں بوجھل ہوئیں اور دھیرے دھیرے اُس کی آنکھوں پر نیند کا پردہ گر گیا۔
چاند چمک رہا تھا اور خدیجہ —— ایک عورت روپہلی چاندنی میں بیٹھی۔ ہوا کے جھونکوں نے اُس کے بالوں کو پہلے مُنہ پر بکھیر دیا تھا۔ اور کندھے پر سے پھٹے ہوئے پھرن کو سرکا دیا تھا۔ اور ایک مرمریں گول بازو ننگا تھا۔ بازوں پر دانتوں کے چند نشان تھے۔
یہ عورت یہ عُریاں بازو، یہ چاندنی اور یہ پریشان زلفیں —— نہیں،

یہ پرانے پتھر کا زمانہ - ابھی انسان کھلے آسمان تلے سوئے ہیں۔ پتھر کے سرہانے بناتے ہیں اور ٹاٹ اوڑھتے ہیں اور دانتوں سے مانس کاٹ دیتے ہیں ـــــ زندگی صحرا ہے اور مسکراہٹوں پر نیل پڑ گئے ہیں۔ روف کے گیت فاصلے پر ہیں اور دور لاریاں سڑک پر سے گزرتی ہیں۔

صبح ہونے سے پہلے ہی خدیجہ جاگ پڑی۔ ماحول پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی اور کوئی لطیف تتلی اور پُرکیف خنکی سرمئی فضا میں تیر رہی تھی۔ جیسے دن کا جلاد اور رات کی سیاہی ساتھ ساتھ سو رہے ہوں اور اُن پر شبنم کی شراب چھڑک دی گئی ہو۔ ایک عجیب سا میٹھا میٹھا خمار ـــــ

اونگھ کھلتے ہی خدیجہ کی نظر دروازے پر پڑ گئی۔ دروازے پر سکندر اپنی پھٹی سی چادر ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا۔ ایکبار لاشعوری طور پر دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر خدیجہ نے منہ پھیر لیا۔ اُس کا سویا ہوا درد جاگ پڑا، اور وہ تڑپ اُٹھی ـــــ میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ایسے زندگی نہیں کٹ سکتی۔ طلاق بھلے سے دے میں تھوڑی ہی مر جاؤنگی ـــــ؟ اور گھٹنوں میں ٹھوڑی دھر کر وہ دوسری طرف منہ پھیر کر ایک ٹھیکری پر نظریں جمانے لگی۔ سکندر دبے پاؤں آیا۔ خدیجہ نے آہٹ سنی مگر آنکھ نہ اُٹھائی۔ کچھ اور کسما کر وہ بڑبڑانے لگی۔

"اب چولھا جلانے کی گھڑی آئی ہے ـــــ جیسے یہاں سب کچھ تیار پڑا ہے ...... منانے چلا ہے ـــــ اور اُس کے جی میں آیا کہ وہ سکندر کو بڑی سے بڑی بد دعا دے۔

"کیوں کمینی گئی تھی نا کسی یار کے پاس" سکندر بولا

"ہاں گئی تھی" ـــــ خدیجہ کے لہجے میں لاپرواہی اور شدت تھی ـــــ سکندر مزید بگڑا ـــــ "آگے سے بولتی ہے بے حیا ـــــ" کہتے کہتے اُس نے مُکا تان لیا اور خدیجہ کے چہرے کے خدّوخال بگڑے۔ مگر وہ خاموش رہی!

"چل اندر کیوں نہیں چلتی ———— ؟" سکندر بولا
"نہیں چلوں گی۔ بجلی گرے تیرے اس جھونپڑے پر"
"تجھے کھڑے کھڑے موت آئے۔ چلتی کیوں نہیں۔"

خدیجہ جیسے بھڑک اُٹھی۔ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دیوار کی طرف نظریں گئیں۔ جہاں سے پڑوسن یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ خدیجہ کا لہجہ بدلا، اور وہ اُس سے مخاطب ہوئی ———— "دیکھ رہی ہے اس کی بے شرمی ——— کل پیٹ پیٹ کے لہولہان کر دیا آج کس طرح باتیں بنا رہا ہے۔ جیسے اُس کا کوئی قصور نہیں" خدیجہ کا گلا رندھ گیا اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پڑوسن سکندر کو تاکنے لگی۔ اور اُسکی آنکھوں سے نفرت اور حقارت کے مسلسل تیر برسنے لگے۔ اور سکندر کے کلیجے کو چھیدتے گئے۔ پڑوسن کی نظروں کی تاب نہ لاکر سکندر دوسری طرف دیکھنے لگا اور پڑوسن بولنے لگی۔

"سکندر تمہیں کیا ہوا ہے، تم کس قدر وحشی ہو ———— میں کہتی ہوں کہ تمہارے یہ بھاگ تھے ورنہ تمہارے پلے تو موئی مرغی بھی نہ پڑتی۔ اپنے دل سے پوچھ کر تمہارے ہاتھوں سے یہ گلاب جھڑ گیا کہ نہیں ———"

"کیا کہنے اس گلاکے۔ بات بات پر باولی کتیا کی طرح کاٹ کھاتی ہے۔ سر کچل کے نہ رکھ دوں اس کا"

جھنجھلا کر سکندر جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ خدیجہ بدستور رو رہی تھی۔ پڑوسن کی طرف دیکھنے کی اُسے ہمت نہ پڑی۔ انسانی غیرت کی آخری کڑی جو بہت مضبوط ہوا کرتی ہے، جو کبھی نہیں ٹوٹتی، جس پر چوٹ پڑ جائے تو آدمی پلٹتا ہے۔ حملہ کرنے کے لئے ————

خدیجہ نے چاہا کہ پڑوسن وہاں سے چلی جائے اور وہ اکیلی رہ جائے مگر پڑوسن دیوار کو پھاند کر اُس کے قریب آئی اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔
"پھر اور کچھ ہوا تھا کیا ———— ؟"

"نہیں ——" خدیجہ نے سر ہلایا
"رات بھر باہر ہی سوتی رہی کیا؟"
"نہیں ——" خدیجہ کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس نے سر ہلایا۔
"کچھ کھایا تھا ——؟"
"نہیں ——" خدیجہ نے پھر ویسے ہی سر ہلایا۔
"مجھ سے کہا ہوتا ——" پڑوسن نے خدیجہ کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے کہا۔
"ابھی تک چائے تک بھی نہ پی ہو گی —— چل ایک پیالی چائے پی آ"
"نہیں نہیں ——" خدیجہ نے سٹپٹاتے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا اپنے ہی گھر پر تیار کر"
"کروں گی ——!" خدیجہ کے لہجے میں کوئی چھپا ہوا فیصلہ تھا۔
سِکندر باہر آ گیا۔ ایک نظر خدیجہ پر اور ایک نظر پڑوسن پر ڈالی۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر تین پیسے نکال لئے اور خدیجہ کی طرف پھینکتے ہوئے بولا —— "لے اس کی روٹیاں لے آنا" —— اور پیسے پتھر کے سرہانے سے ٹکرا گئے۔
ایک ساز سا بج اُٹھا۔ زندگی کا ایک اہم ساز —— تین پیسے —— عورت اور مرد کے درمیان سب سے بڑا رشتہ۔ تین پیسے۔ جن کی غیر حاضری میں تکون اور دائرے کے کنارے ملنے سے رہ جاتے ہیں۔
جو غائب ہیں، کہیں دبے ہوئے ہیں۔ سڑک کے کنکروں کی طرح۔ مرد، عورت، وفا اور تین پیسے ——!!
اور خدیجہ کی آنکھوں میں جیسے یہ پیسے چھوٗنے جا رہے ہوں۔ اکڑ کر کہنے لگی۔
"نہیں ہمیں ضرورت تیرے پیسے ——"
"یوں خالی پیٹ مر نہ جائے گی ——"

"مر جاؤں گی تیری بلا سے ـــــــ اپنے پیسے رکھ لے حرام ہیں مجھ پر ـــ"

"تو ہی سمجھا اب اس بے وقوف کو ـــــــ" سکندر نے پڑوسن سے کہا، اور ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک آہ بھرتے ہوئے مایوس سا اپنے کام پر چلا گیا۔

خدیجہ بڑبڑائی ـــــــ "یہ پڑے ہیں تیرے پیسے۔ میں ان پر تھوکوں بھی نہیں ـــــــ"

پڑوسن پیسے اٹھاتے ہوئے کہنے لگی ـــــــ "کیوں ضد کرتی ہے۔ پھر پیٹی جائے گی ـــــــ اپنے مرد سے یوں اُلجھا کرتے ہیں۔ تو میں روٹیاں لاتی ہوں تو تب تک چائے اُبال لے۔"

اُس نے خود ہی کہا، اور خود ہی اسے فیصلہ ٹھہرایا اور چلی گئی۔ خدیجہ نے پیچھے سے پکارا۔ اُسے روٹی نہیں چاہئے۔ اور تب وہ سوچنے لگی کہ وہ اس گھر میں نہیں جائیگی۔ یہیں پڑی رہے گی۔ کچھ نہ کھائے گی لیکن جلد ہی اُٹھ کر وہ اندر چلی گئی ـــــــ دوراہا جہاں انسان ایک طرف جانا چاہتا ہے، اور اُسے دوسری طرف جانا پڑتا ہے اور خدیجہ اندر جاکر چائے کی پڑیا تلاش کرنے لگی۔

اُس شام سکندر دوڑتا، اُچھلتا گھر میں داخل ہوا۔ چہرے پر کوئی نئی نویلی رونق تھی اور زبان پر کوئی گیت جیسے دل کی گہرائیوں سے اُمڈ رہا تھا۔ جیسے آج کوئی بڑی فتح حاصل ہوئی تھی ـــــــ اپنے بازو تھپتھپاتے ہوئے وہ خدیجہ سے اس طرح مخاطب ہوا جیسے اب تک کچھ نہ ہوا تھا ـــــــ "ذرا پاس تو آ"

"اب کیا ہے ـــــــ"؟ خدیجہ کے الفاظ بدستور تلخ تھے۔

"وہاں سے کیا چیخ رہی ہے پاس آکر دیکھ ـــــــ" کہتے کہتے سکندر نے جیب سے سبز کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ خدیجہ اپنے آپ کو نہ روک سکی کیونکہ سبز کاغذ کے غلاف میں اس طرح آج تک کوئی چیز سکندر کی جیب سے نہ نکلی تھی

وہ سب کچھ بھول گئی اور اُچک کر سکندر کے قریب چل کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ سکندر نے اب کی بار اُسکی آنکھوں میں جھانکا۔ اُس کے ہونٹوں کو دیکھا اور سینے کے نیچے سلوٹوں پر نظر ڈالی۔ کچھ خوشی چھائی، اور خدیجہ نے اپنی تیز تیز سانسوں اور دھڑکنوں کو سُنا۔ سکندر بولا "آج سڑک پر ایک لاری رُکی تھی"۔ خدیجہ منتظر تھی کہ آگے کیا ہوا ——— اور سکندر کہنے لگا ——— "کچھ خرابی ہوئی تھی مشین میں ———" خدیجہ نے سر ہلایا ——— "جب تک مشین ٹھیک ہوئی سواریاں ٹہلنے لگیں ———" خدیجہ نے پھر سر ہلایا ——— "جب گاڑی چل پڑی تو میں نے اسے نزدیک ہی پایا ———" خدیجہ کا اضطراب بڑھ گیا، اور سکندر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا۔ اندر سے چاندی کی پیالی نکلی۔

دُنیا کے ایک خطّے کے ایک کونے میں اب تُلی کی جھونپڑی میں چاندی کی ایک پیالی ——— آج اتفاق سے ایک گاڑی رُکی تھی اور ایک چیز بھول سے بیچ رستے میں رہ گئی تھی۔

خدیجہ نے جھپٹ کر پیالی کو سکندر کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ پھر اُسے نیچے رکھا۔ اپنے ہاتھوں کو پیرہن سے صاف کیا۔ اور جھاڑا، اور پیالی کو اُٹھایا۔ آنکھیں میچ سی لیں، اور پیالی کو سینے سے لگایا۔ پھر وہ مختلف زاویوں سے اُسے پرکھنے لگی۔ تب اُس نے اُسے چھپا کر اپنے پاس رکھنا چاہا۔ ایک خیال، ایک تمنّا، ایک آرزو ——— دوسرے ہی لمحے وہ اُتر سی گئی۔ اُس کی اتنی اوقات نہیں۔ چاندی کی پیالی بہت بڑی چیز ہے۔ رُکتے رُکتے اُس کے ہاتھ آگے بڑھے سکندر نے کہا۔

"رکھ لے اپنے پاس ———"

"نہیں ———" خدیجہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

"روتی کیوں ہے رے پگلی ———" ایک مرد کی محبت اُس کی رُوح سے چھلک کر بول رہی تھی ——— "چاندی کی پیالی کی کیا بساط۔

غریبی دم نہیں مار دیتی ورنہ تو سمجھتی ہے مجھے تم سے محبت نہیں۔ اور میں تمہیں پیٹ کر خوش ہوتا ہوں ——"

آنسوؤں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ خدیجہ پھوٹ پڑی، اور سکندر کے سینے سے لگ گئی —— دوسری شام خدیجہ اپنی پڑوسنوں کے ساتھ روف میں شامل ہوئی —— !!

پروفیسر حامدی کاشمیری

سپنوں کے گھاؤ

بنڈ روڈ کی اونچائی سے سڑک سیدھی نیچے کو جاتی ہے اور شاہی باغ کی طرف مڑتی ہے۔ اس سڑک پر چلتے چلتے اچانک میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سڑک پر بھاگتے ہوئے لوگ موہوم سایوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور متحرک سایوں کی اس بھیڑ میں وہ میرے پاس سے گذرتی ہے۔ لمحہ بھر کو ہماری آنکھیں مل جاتی ہیں۔ اور مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اُس کے چہرے پر مانوسیت کی روشنی ہے اور ہونٹوں پر ایک دبی سی غیر واضح مسکراہٹ! اور میں دل میں ارمانوں اور خواہشوں کا گلا دبا کے جسم کی لاش کو گھسیٹتا ہوا دفتر کی راہ لیتا ہوں۔

ٹیبل پر فائلوں کی کالی دیوار کھڑی ہو گئی ہے۔ سپرانٹنڈنٹ داس جی کا بھیانک چہرہ دیوار کے اُس پار تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرا روز کا معمول ہے۔

تین سال گذر گئے

تین سال سے بنڈ روڈ کی اُس نشیبی سڑک سے گزرتے ہوئے میری یہی حالت ہو جاتی ہے۔ میری اِس جذباتی کیفیت کا کیا نام — یہ مجھے خود معلوم نہیں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ زندگی کے روز و شب کے ویرانوں میں چند لمحے کے لئے دُور دُور تک برکھا ہو جاتی ہے۔ روز میں پونے دس بجے گھر سے نکلتا ہوں۔

ریڈیو سے آخری فرمائشی گیت نشر ہو رہا ہے۔ میں بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل پڑتا ہوں۔ کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر! رضیہ کچن سے چیخ رہی ہے۔ بس ایک منٹ میں آ رہی ہوں۔ لیکن اس ایک منٹ کی اہمیت کوئی مجھ سے پوچھے۔ بے چاری رضیہ کو کیا معلوم میں اُس سے بات کئے بغیر نکل آتا ہوں اور سیدھا بنڈ روڈ پر پہنچتا ہوں اور بنڈ روڈ کی نشیبی سڑک سے گزرتے ہوئے میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ میرے پاس سے گزرتی ہے۔

لیکن آج ——

میرے خدا اس کالی دیوار میں کوئی سوراخ بھی نہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور کسی موج ہوا کا گزر بھی نہیں۔ میرا ہاتھ پیڈ پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے —— دُھند چھٹ رہی ہے

بس سٹینڈ پر لوگوں کی بھیڑ تھی، دُھوپ تیز تھی اور انتظار کی گھڑیاں دل میں تھکن اور بیزاری پیدا کر رہی تھیں۔ ٹکٹ میں لے چکا تھا اور اب بس کا انتظار تھا۔ پتہ نہیں بس کیوں لیٹ ہو رہی ہے۔ دو گھنٹوں کا طویل اور اُکتا دینے والا سفر ہے۔ کیسے کٹے گا یہ سفر —— ؟ اور پھر اتنا غیر رومانی سفر ——! مَردوں کے اِس بے ہنگم ہجوم میں صرف دو بوڑھی عورتیں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ اور جماہیوں پر جماہیاں لے رہی ہیں۔ میری نظر شکنوں کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں وہ سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔

"آپ ؟ یہاں کہاں —— ؟" اُس کی سیاہ چمکتی ہوئی مانوس آنکھوں نے مجھے بولنے کی ہمت عطا کی۔

"یہی بات میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں ——" اُس نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اس عورت کو برسوں سے جانتا ہوں۔ ہم بار بار ملے ہیں۔ باتیں کر چکے ہیں اور ——

"میں آفس کے کام سے شبید نگر جا رہا ہوں۔"

"ہوں۔"

"اور آپ — ؟

"میں گھر جا رہی ہوں۔

"گھر — ؟"

"ہاں گھر —"

"لیکن یہاں آپ کا گھر۔"

"یہاں میں نوکری کر رہی ہوں۔" اُس کی آنکھوں میں دُھند پھیل گئی اور وہ رُک کر بولی۔ "اور سچّی بات تو یہ ہے کہ میرا گھر ہی نہیں اور اگر ہے تو میرے ساتھ ساتھ ہے —"

میں تعجّب سے اُسے دیکھتا رہا۔

"میں صرف ایک روز کیلئے جا رہی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کل سڑک پر آپ نہیں ملیں گی؟"

"آپ بھی تو نہیں ہوں گے —" وہ ہنس پڑی۔

میں بھی ہنس دیا۔

اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے میں شاید انسانی تعلقات کی غیر متوقع تبدیلیوں کی پُر اسراریت پر سوچ رہا تھا۔

وہ میری ہم سفر تھی

بس سیدھی سڑک پر جا رہی تھی اور میں اُس کی بات سُن رہا تھا۔ پیاری پیاری باتیں، دل میں اُترنے والی، بے لاگ۔ وہ خود اعتمادی سے بول رہی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُس کے وجود کی تنہائیوں میں اپنے بندھے پر کھول رہا ہوں اور میرے سامنے ایک کے بعد دوسرا اُفق روشن ہو رہا ہے، وہ ایک دُبلی

پتلی سی عورت تھی۔ چہرے پر زردی لئے ہوئے۔ لیکن جس کی شخصیت میں ایک ناقابل بیان دل کشی تھی۔

اُف مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

میں نے خیالوں کے ریلے کو ذہن سے پرے جھٹک دیا اور پوری توجہ سے فائل پر جھک گیا۔ دو تین کیسوں سے نمٹنے کے بعد میرا ذہن پھر میرے قابو سے باہر ہو گیا۔

اتوار کی شام کو میں ہوٹل روڈ پر بے مقصد پھر رہا تھا۔ بجلی کے قمقموں کی روشنی میں سڑک بالکل دُلہن بنی پڑی تھی اور سڑک کے دو رویہ شیشے کی الماریوں سے سجی ہوئی دُکانوں سے روشنی کا سمندر باہر آ رہا تھا۔ میں روز اِس سڑک پر گھومتا ہوں۔ یہ سڑک شام کو لہرائے رنگوں، دہکتی خوشبوؤں اور جھلملاتے قہقہوں سے آباد ہو جاتی ہے۔ خوبصورت عورتوں کے لچکیلے جسموں کی سُلگتی قربتیں سلیولیس باہوں کی خوشبو۔ چمکتی سڈول پنڈلیاں —— اور میں سنسان راستوں پر اکیلا چلتا ہوا رات گئے گھر پہنچتا ہوں۔ تکان سے نڈھال۔ خیالوں میں دُنیا بھر کا انتشار لئے ہوئے تاریکی میں لپٹی ہوئی خستہ حال سیڑھی۔ دیواروں پر کالے دھبے، کمرے میں چیزوں کا انتشار، بے ترتیبی، نحوست، وحشت، میلے سے بستر پر پڑے بچے اور رضیہ کا غصہ، غم سے کھولتا ہوا وجود۔ اُس کے زرد سے استخوانی چہرے پر ہانپتی ہوئی پرچھائیاں، آنکھوں میں بیزاری اور تھکن۔ پپڑی جمے ہونٹ —— اور میں تشنج کی حالت میں اپنے کمرے میں جا کر جسم کی لاش کو بستر پر گرا دیتا ہوں اور ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں۔

میرے تھکے قدم نیشنل بک سینٹر کی طرف اُٹھے۔ کیوں نہ کوئی تازہ ناول خریدا جائے۔ میں دُکان کے اندر آیا اور اندر سے وہ باہر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے قدم رُک گئے، وہ مُسکرائی ——

"آپ ——"

اُس کے چہرے پر زردی تھی۔ بال خشک اور اُلجھے ہوئے۔ پپوٹے بھاری
"ہاں، لیکن آپ کو کوئی شک ہے کیا؟" اُس کی سیاہ آنکھوں میں خلوص
کی چمک تھی۔

"نہیں تو ـــــ"

اور وہ جانے لگی۔ مجھے چُپ سی لگ گئی تھی، اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں اس
سے کسی موضوع پر بات کروں ـــــ؟ وہ جا رہی ہے۔ میں کچھ دیر کے لئے اُسے
روکنا چاہتا تھا۔ اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں! مجھے اُس سے باتیں کرنے میں
بہت مزہ ملتا ہے۔ لیکن ـــــ

"اچھا گڈ بائی"

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"گھر ـــــ!"

"چلئے میں چوک تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں"

"شکریہ ـــــ!"

اور پھر ہم نیم تاریک سڑکوں پر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

ہم دونوں خاموش تھے! اور پھر اُس نے خاموشی توڑ دی

"تین کمروں کا سیٹ ہے، اور کچن، اور کرایہ ساٹھ روپے۔ میں سکول سے آ کر
کھانا پکاتی ہوں، اور مُنّی کو دودھ پلاتی ہوں۔ اس کے بعد میری حالت دیکھنے کی ہے۔"
وہ ہنس پڑی۔ کھلی کھلی سی اُجاڑ ہنسی ـــــ "میں تنہا رہ جاتی ہوں، اور
تنہائی مجھے پریشان کرتی ہے۔ یہاں کوئی جان پہچان کا انسان بھی نہیں۔ دل بات کرنے
کو ترستا ہے۔ میں اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ کبھی اُٹھتی ہوں اور کمروں میں
ہانپتی ہوئی پھرتی ہوں۔ خاموشی میرے اعصاب کو کچلتی ہے۔ دیواریں قریب
آ کر گھیر لیتی ہیں اور میرے سینے میں کتنی چیخیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ڈاکٹروں نے
کہا۔ مجھے نیوراسس ہو گیا ہے۔ شاید سچ کہہ رہے ہوں گے۔ عجیب گھٹن سی ہوتی ہے

گھبرا کے کتاب ہاتھ میں اُٹھاتی ہوں۔ تقریباً روز ایک نئی کتاب خریدتی ہوں۔ اگر مُجھے کتاب نہ ملے میں خودکشی کر لوں۔ ہاں ہاں خودکشی۔ بھلا زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ چھ سال سے میں زندگی کے بوجھ کو شانوں پر اُٹھائے پھر رہی ہوں۔ ہاشم صاحب شہید نگر میں جام فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ اُنہیں وہاں بہت کام رہتا ہے ——————"

"ہاشم صاحب آپ کے پاس کیوں نہیں آتے ؟"

"وہ نوکری چھوڑ کر کیسے آئیں گے ؟" اور پھر مُجھ سے زیادہ اُنہیں اپنی بہن زاہدہ عزیز ہے جو اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ اُن کے گھر میں حُکمرانی کرتی ہے۔ ہاشم صاحب زاہدہ سے بہت ڈرتے ہیں۔ مجال ہے کہ گھر میں زاہدہ کے حُکم سے کوئی سرتابی کرے۔ اُن کے اِشارے کے بغیر وہاں پتّا بھی نہیں ہلتا۔ اور مُجھ سے صرف اس لئے ناراضی ہے کہ میں یہاں نوکری کیوں کرتی ہوں۔ نوکری نہ کروں تو کیا کروں ؟ ہاشم صاحب مہینے کے آخر میں ڈیڑھ سو کی ڈیڑھ سو رقم زاہدہ کی ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔ اور دوسری تاریخ کو میرے پاس دوڑے چلے آتے ہیں۔ اور ——— عجیب سلسلہ ہے۔ میری نوکری کو تو ایک بہانہ بنایا گیا ہے۔ ہاشم یہ باتیں کہاں سمجھیں گے اُن کی کھوپڑی میں اُن کے قد کے مُطابق ہی تو بس اتنا سا بھیجا ہے ——— سچ پُوچھئے تو یہ زندگی زہر لگتی ہے اور سوچ سوچ کر میری رگوں میں زہر پھیل جاتا ہے۔

وہ سڑک کے تاریک غبار میں تحلیل ہو چُکی تھی۔

اور میں کرسی میں بُت کی طرح نصب ہو چکا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے بیل بجائی۔ خاموشی چیخ اُٹھی۔ چپراسی اندر آیا اور اُس نے سپرنٹنڈنٹ کی میز سے ڈاک کی ٹرے اُٹھائی اور میرے سامنے رکھی۔ میں اُسے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔

اتوار کو موسم اچانک بدلا۔ بادل آئے اور برسے، میں گھر میں قید ہو کر رہ گیا۔ دِل کی وحشت بڑھنے لگی اور پھر رضیہ کی چیخ چیخ ——— ابھی پندرہ تاریخ کو اُس کے چچازاد بھائی کی پانچویں لڑکی کی شادی ہو رہی تھی اور وہ آج ہی سے بضد

تھی کہ سونے کی مالا بازار سے خریدی جائے۔ یہ وہی چچازاد بھائی ہیں جن کی شکل بھی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ خیر! معاملے کے اس پہلو پر مجھے توجہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اُس کا مالی پہلو میرے لئے پریشان کُن ضرور تھا۔ کم سے کم تین سو روپیوں کا بندوبست کرنا معمولی کام نہ تھا۔ لیکن رضیہ اس پر سوچنے کی زحمت کیوں کرتی؟ وہ سوچتی کم اور بولتی زیادہ ہے ——— اور میں تلملا کر وہاں سے نکلا۔ اس جاہل عورت کو سمجھانا میرے بس کا کام نہیں۔ بس سٹاپ پر بس رُکی اور مجھے اس کا احساس اس وقت ہوا جب بس چلی گئی، اور میں پیدل چلنے لگا ——— انسان عجیب مخلوق ہے۔ خود ہی گلے میں آہنی زنجیریں ڈالتا ہے۔ خود ہی آزادی کیلئے پیچ و تاب کھاتا ہے ——— میرے سینے کا بوجھ بہت بھاری ہو چکا تھا۔ اتنا بھاری کہ میری سانسیں رُکنے لگی تھیں اور میرے قدم سیدھے نہیں پڑ رہے تھے۔ میں کہاں جا رہا تھا مجھے بالکل احساس نہ تھا۔ لیکن اس خیال سے سکون مل رہا تھا کہ گھر سے دُور جا رہا ہوں ——— گھر جہاں نحوست کے سائے منڈلاتے ہیں۔ جہاں ہر لمحہ عذاب ہے۔ کتنی جاہل اور ضدی عورت میرے پلے باندھی گئی ہے اور آج دس سال سے یہ بوجھ میری گردن پر سوار ہے۔ اُف! یہ کوئی زندگی ہے جہاں پتھر برستے ہوں وہاں کوئی کب تک اپنے آئینے کی نگہداشت کرے۔ میرے دِل کا آئینہ کب کا چکنا چور ہو گیا تھا۔

لیکن ——— میں اب گراونڈ روڈ سے چوک کی طرف آ رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے کنال روڈ کا رُخ کیا۔ میں چلتا رہا اور میرے دل و دماغ سے دھواں اُٹھتا رہا۔

اچانک میرے قدم رُک گئے۔ یہ ایک خاموش گلی تھی اور میرے سامنے ایک نئی بنی ہوئی سہ منزلہ عمارت تھی۔ پلاسٹر اور رنگ و روغن سے عاری۔ میں نے دروازے کی کنڈی ہلائی۔

ایک لمحہ گزر گیا۔

میں نے پھر کنڈی ہلائی۔ معاً اندر سے کوئی سرگوشی سرک آئی۔ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت سوالیہ نشان بنی ہوئی میرے

سامنے کھڑی تھی۔

"میں مسز ہاشم سے ملنا چاہتا ہوں ——— وہ گھر ہی میں ہیں؟"

"آیئے، آیئے اُوپر ہیں۔"

میں زینوں پر قدم رکھ رہا تھا اور میرا دِل ڈوبا جا رہا تھا۔

عورت نے دوسری منزل میں دہلیز کے بائیں طرف ایک کمرے میں مجھے بٹھایا، اور خود باہر چلی گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ چند معمولی سی چیزیں کمرے میں رکھی تھیں۔ دو تین پُرانی کرسیاں۔ روغن سے عاری دیواریں، دیواروں پر چند تصویریں آویزاں۔ کمرہ صاف تھا اور ایک طرف دری پر پھول دار چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ سامنے کی دیوار کے اندر الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ بہت سے رسالے۔ مجھے مسز ہاشم کی عظمت کا احساس ہوا ——— کتنی کتابیں ——— میرے دِل میں مایوسی نے چٹکی لی۔ اِنسان کتنا بے بس ہے۔ مجبور! اور حالات کتنے سنگین ——— کالج میں پڑھنے کے دوران میں نے کیا کیا خواب بُنے تھے۔ میں کسی کالج میں پروفیسر ہو جاؤنگا۔ اور میرا سب قیمتی سرمایہ کتابیں ہوں گی۔ گھر میں ایک لائبریری ہوگی۔ لیکن والد صاحب کی بے وقت موت نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل ڈالا ——— اور میں ایری گیشن آفس کے اُس تاریک کمرے میں قید ہو کر رہ گیا۔ یہ زرد سی میلی دیواریں یہ پھٹیچر سا فرش، یہ ———

ہم دونوں چائے پی رہے تھے

اور کھڑکی پر شام بکھر رہی تھی

"میں زندگی سے بھاگ آیا ہوں۔"

"زندگی سے کوئی بھاگ نہیں آسکتا۔"

"کیوں ——— ؟"

"اِس لئے کہ زندگی اِنسان کا تعاقب کرتی ہے۔ آپ بھاگتے ہیں اور وہ آپ کے ——— ؟"

"اور موت ___"

"وہ شکست ہے۔ انسان کی فطرت میں شکست نام کی کوئی چیز نہیں ___ میرا یہ عقیدہ اب مضبوط ہوتا جارہا ہے کہ زندگی ایک بار ملتی ہے ___ ایک بار اسے خوب گلے لگاؤ، اسے پیار کرو، اسے اوڑھنا بچھونا بناؤ، اسکی لذتوں سے روح میں قوس قزح کے رنگ بھر لو ___ زندگی کا ہر لمحہ یہی آواز دیتا ہے لیکن کتنے ہیں جو اس آواز کو سنتے ہیں ___؟" اس کے لہجے میں وارفتگی تھی۔ آنکھوں میں خود آگہی کا نور تھا۔ اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ عورت اور عورت میں کتنا فاصلہ ہے ___ وہ میرے پاس ہی کرسی پر اطمینان سے بیٹھی تھی۔ سادہ سے معمولی لباس میں ملبوس جو اس کی تنگدستی اور غریبی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر کتنی امیر تھی۔

"ہاشم صاحب نے شادی کے ایک سال کے بعد زاہدہ کے کہنے پر مجھ سے جھگڑا کیا، سخت جھگڑا۔ مجھے گالیاں دیں اور جوتے سے مارا اور مجھے زبردستی سے میکے بھیج دیا اور دو سال تک میری خبر نہ لی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب منی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور پھر جب میں رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی اور اپنے لئے دق کی بیماری مول لینے کی تیاری کر رہی تھی۔ پروفیسر فضل سے میری ملاقات ہوئی۔ عجیب لاابالی کی طبیعت کے مالک ہیں۔ آزاد، بے باک۔ اپنی سوچوں پر زندہ رہنے والے، فرسودہ اخلاق، مذہب اور تہذیب کی نام نہاد قدروں کے زبردست مخالف۔ انھوں نے ایم اے کے دوران میری بڑی مدد کی۔ میں اُن کے گھر اُن سے ملنے جاتی اور گھنٹوں تک اُن سے باتیں کرتی۔ پروفیسر فضل نے مجھے ایک نئی آگہی دی ___ زندگی حسن ہے اور حسن کو گلے لگاؤ، اور مسرتوں سے اپنا دامن بھر لو ___"
لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی

"کاش میں نے پروفیسر فضل کی بات مانی ہوتی۔ اُس نے آہ کھینچی۔

"کون سی بات ___؟"

"وہ ــــــ وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں ــــــ" اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی اُبھری اور مٹ گئی ــــــ "اُس وقت شاید میں ذہنی طور پر اتنی تیار نہ تھی۔ اُن کی بیوی تھی اور چار بچے۔ اُس زمانے میں یہ میرے لئے ایک سنگین مسئلہ بن گیا تھا۔ آج مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے۔ ہاشم کا وجود اور عدم میرے لئے آج بھی یکساں ہے اور اُس زمانے میں بھی تھا ــــــ اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ گھر کا سُکھ اور مسرّت بے معنی ہے، بے معنی۔ دُکھ اور سُکھ انفرادی تجربہ ہے۔ اِنسان اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ اور اپنے لئے مرتا ہے اور یہ سب کچھ لمحوں میں ہوتا ہے ــــــ"

مسز ہاشم اعتماد اور بے باکی سے بول رہی تھی اور میں اُس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اور جب میں شام کے اندھیرے میں وہاں سے نکلا تو وہ کہہ رہی تھی ــــــ

"اِتوار کو ضرور آیئے۔ رات کا کھانا یہیں کھائیں گے۔"

"ضرور آؤں گا اور خُوب باتیں ہوں گی۔"

اتوار کی رات کو میں وہاں گیا۔ باہر چبھتی ہوئی سرد ہوا چل رہی تھی کمرے میں داخل ہو کر مجھے گرمی اور آسودگی کا احساس ہوا۔ مسز ہاشم نے بہت لذیذ کھانا پکایا تھا اور کھانا کھانے کے بعد ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ منّی کو میری گود میں کھیلتے کھیلتے نیند آ گئی تھی اور ادھیڑ عمر کی عورت نے اُسے دوسرے کمرے میں سلایا تھا۔ کمرے میں اب صرف ہم دو بیٹھے تھے۔ ادھیڑ عمر کی عورت اوپر کی منزل میں اپنے کمرے میں نماز پڑھنے گئی تھی۔ مسز ہاشم نے باریک لکیروں والا ایک سُرخ رنگ کا سُوٹ پہن لیا تھا۔ اُس کے سینے کا بہت سا حصّہ کُھلا تھا اور بجلی کی روشنی میں دلفریب نظر آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ پوڈر کی ہلکی تہہ سے چمک رہا تھا۔ کپڑوں اور بالوں سے سینٹ کی لطیف خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس کی سُرمگیں پلکیں بوجھل تھیں۔ اور خواب آلود! وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی

اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا اور —— اور وہ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔

اچانک وہ چپ ہو گئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ پرے کھینچ لیا۔ اُس کی آنکھیں جھک گئیں، میں چونک سا گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے —— ؟" اُس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی، اور میں اُس کے خوبصورت جسم کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا بجا ہوگا —— ؟" اُس نے انگڑائی لی۔

"بارہ بج چکے ہیں ——" میں نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اب اجازت چاہوں گا ——"

"باہر تیز بارش ہو رہی ہے اور آندھی چل رہی ہے۔ آپ —— یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہے۔"

دوسرے لمحے مسز ہاشم میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں، اور وہ سانسوں میں اُلجھ اُلجھ کر کہہ رہی تھی۔

"زندگی میں پہلی بار میں کسی سے قریب آئی ہوں اور میرا دل سچی محبت سے دھڑکا ہے ——"

"محبّت ——" میرے احساس میں رنگ و نُور کی پھوار برس رہی تھی ریڈیو سے آخری ثنالینی گانا نشر ہو رہا تھا، اور میں جلدی سے کمرے سے نکل رہا تھا۔ رضیہ نے مجھے دیکھ کر اپنا مُنہ پھیر لیا۔ اُس کے ہونٹ پھولے ہوئے تھے۔ اور چہرہ تاریک ہو گیا تھا ——

سڑک کے موڑ پر میری نظریں اُٹھیں تو —— وہ سامنے سے نمودار نہ ہوئی اور میں زیر لب مسکرایا

دوسرے دِن بھی وہ وہاں نظر نہ آئی۔

تیسرے دِن بھی —— ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ وہ سوموار کی

صبح ہی کو اپنا سارا سامان لے کر چلی گئی —"
وہ کیوں چلی گئی۔
کیا وہ واپس نہ آئے گی —
آج بھی جب میں بنڈ روڈ کی نشیبی سڑک پر چل رہا تھا تو موڑ پر وہ نظر نہ آئی اور مجھے محسوس ہوا کہ راستے میرے لئے تاریک ہو گئے ہیں۔ اور میں جسم کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں —— مسز ہاشم کو اتنے قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کے باوجود —— کیا میں نے مسز ہاشم کو سچ مچ قریب سے دیکھا ہے ——
"اظہار صاحب کمال ہے۔ تین بج رہے ہیں اور آپ نے ابھی تک ارجنٹ کیس بھی واپس نہیں کئے۔ کیا آپ سو رہے ہیں یا کام کر رہے ہیں —— داس جی کا چہرہ کالی دیوار کو پھاند کر میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔
اور مجھے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ سپنوں میں اُلجھنے کا بھلا یہ کون موقع ہے —— میں نے دل کو سمجھایا ✤

دیپک کول

کل رات کی بات

تمہاری قسم تم ایسے میں بھی کتنے پیارے لگتے ہو ـــــ کچھ افسردہ ہو، کچھ پچھتاوا ہے۔ کچھ سہمے سہمے ہو، اور کچھ بے قراری ہے۔ ارے تم نے پیچھے مڑ کر کیوں دیکھا۔ پہلے یہ تو کہو، تم نے سُن تو نہ لی میری بات ـــــ؟ میں نے بہت دیر سے کہی تھی، بہت دھیرے سے، قسم لے لو مجھ سے اگر میں نے مذاق کیا ہو۔ یقین جانو دوست تم ایسی حالت میں بھی غمناک حُسن کی ایک ایسی مورت بنے ہو جسے اگر کوئی پہچاننے والا ملے تو میں سچ کہہ رہا ہوں، بہت پیار کریگا۔

آج تمہاری چال بہت دھیمی ہے۔ آج تمہارا دل اُداس ہے۔ تمہاری گھایل رُوح آج کس بے دردی سے تمہاری آنکھوں سے بول رہی ہے۔ یہ مال روڈ بھی کتنی سُونی سُونی سی ہے۔ آج تمہاری ٹانگوں میں بھاری پن سا آچکا ہے۔ تم دراصل ملنا نہیں چاہتے۔ مگر تب بھی چلے ہی جا رہے ہو۔ یہ لمبی سڑک تمہیں جس جگہ لے جا رہی ہے اور جس کے لئے لے جا رہی ہے مجھے سب معلوم ہے۔ تم نے بڑی دیر کے بعد اس سڑک پر قدم دھرے ... ... دِل کُشا پُرانے زمانے میں ایک محل تھا۔ آج اس کے کھنڈر بھی نہیں رہے ہیں۔ کچھ ہیں اور اُن ہی پر وہ بنگلہ کھڑا کیا گیا ہے، جو آج تمہارے اس شام کی سفر کی منزل ہے ... ... خیر چھوڑ دو مجھے تمہارا راز اس طرح کھلے بندوں کہنے کا کیا حق ـــــ لکھنؤ میں اتنی دیر رہ کر تم نے اس بات کو کس طرح چھپائے رکھا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔

تم چلے جا رہے ہو، نہیں تم بہے جا رہے ہو، کیونکہ آج تم نے اپنا سب کچھ کھو ساڈالا ہے اپنے کو آپ میں نہ رکھ سکنے کی وجہ سے تم ایک لہر کے ساتھ بھٹک گئے اور یہ لہر تمہیں کسی کنارے نہیں پہنچائیگی۔ بلکہ اپنے ساتھ بہاکر تجھے سمندر میں ڈبو دیگی۔ تم بھی کتنے پاگل ہو جو ایک لہر کے گلے ملے!

تم شاید تعجب کرتے ہو گے کہ یہ کون ہے۔ مجھ ہی سے میرے دل کی باتیں کر رہا ہے صاحب آپ نے پیچھے دیکھو، ذرا غور سے دیکھو تو مجھے پہچانو گے۔ خیر نہ دیکھو۔ اچھا ہوا۔ نہیں تو تم مجھ سے ایسی دوستی گانٹھو گے کہ بہت دیر تک چھوڑو گے نہیں۔ مجھے اُتنی فرصت بھی نہیں اور پھر آج تم ایک دوست کی کھوج میں ہو ہی۔ تمہیں آج کسی کی بھی ضرورت ہے آج کوئی بھی پہلا آدمی تمہارا دوست بن سکتا ہے۔ تم جی ہلکا کرنے کے لئے ایک مسکراہٹ خریدنے پر بھی اُتر آئے ہو۔ کوئی تمہیں یہ کہدے کہ تم آج بھی جی رہے ہو۔

تمہیں اپنے بدن میں کچھ ہلکاپن سا محسوس ہو رہا ہے۔ تمہیں اپنی ساری ہستی ہلکی معلوم ہو رہی ہے۔ کہاں وہ زمانہ جب تم اپنے بھاری جوتے پہن کر حضرت گنج کی سیر کو نکلتے اور لوٹتے وقت اپنی کھلی چھاتی کی دھڑکن میں کسی نئے ہی ولولے کا احساس کرتے۔ ہر چاپ تجھ میں ایک نیا ارادہ، ایک نیا بھروسہ پھونکتی۔ اور کہاں آج تمہاری یہ ہلکی چپل۔ تمہارے قدموں میں دھیمی سی چاپ بھی نہیں اب، کچھ بھی نہیں۔ تم نے جان بوجھ کر بابو لال موچی سے اتنی ہلکی چپل بنوائی۔ تم نے اپنی چاپ اپنے کانوں سے بھی سننا نہیں چاہتے۔ تمہارا دل اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ تمہاری چاپ تک نہیں کھلتی ہے۔ تم چپکے سے نکل جانا چاہتے ہو کہ کوئی تمہیں دیکھے نہ یہاں تک کہ تمہاری رنگوں کی پسند میں بھی ہلکے پن کا جھکاؤ بڑھتا جا رہا ہے اب تمہاری پسند وہ شوخ اور شاداب رنگ نہیں۔ بلکہ ہلکا نیلا، آسمانی، سفید اور ایسے ہی سادے سے رنگ اب تمہیں بھاتے ہیں۔ یہ ہلکاپن تمہاری ریڑھ کی ہڈی میں اُتر چکا ہے تم دِل کُشا محل میں رہنے والی راجکماری سے نفرت سی کرنے لگے ہو۔ کیونکہ آج وہ تمہارے موڈ کے خلاف اپنے بھاری ڈھنگ سے تمہارے سامنے آئے گی۔ تم کتنا چاہتے ہو کہ آج اُس کی بھاری چال میں ہلکاپن آجائے۔ اُس کی تیکھی آواز کو تم آج کس قدر مدھم پانا

چاہتے ہو۔ اُس کی کھلی مسکراہٹ کے بدلے تم آج اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو دھیمے سے ناچتے ہوئے دیکھنے کی کتنی چاہت کرتے ہو۔ تب وہ کتنی سندر دکھائی دیگی اور پھر تم اُسے کسی دُکھ کے مجبور حسن کا پرتو سمجھ کر کتنا پیار کرو گے۔

تمہارے اُلجھے سوکھے بالوں کی قسم تمہارا دِل جو کہتا ہے، سچ کہتا ہے۔ مگر ایسا ہوگا نہیں، تمہیں یہ سڑک تمہاری منزل سے کہیں دُور لے جائے گی۔ تم اُس کے بنگلے کی باڑھ کو چھو کر بھی اُس کے پاس نہیں جاؤ گے۔ جاؤ دیکھو کہہ جو دیا۔

تمہاری پھٹی پھٹی نگاہیں کس بے چارگی سے دائیں بائیں دیکھ رہی ہیں۔ آج شام اودھ اتنی سہانی کیوں نہیں جتنی ہوا کرتی تھی۔ آج تیری آنکھوں سے وہ سبزہ، وہ ہریالی کہاں گئی جو آس پاس کے درختوں کا رنگ تھا۔ اور جس سے پت جھڑ کی گھاس بہار کا رنگ لیتی۔ ساری زندگی تیری نگاہوں میں کتنی مُرجھائی سی ہے۔ یہ اُڑتے پنچھی بھی کس قدر دِھنگی سے پر ہلا رہے ہیں جیسے اُڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ پر کیا کریں باز جو پیچھا کر رہا ہے اس حسین شام کی دھیرے سے جاتی ہوئی ہوا آج اِن پتوں سے اُلجھ اُلجھ کر قدرت کی سارنگی کے سروں میں تبدیل نہیں ہوتی۔ آج گھٹن بہت بڑھ گئی ہے۔ زندگی کتنی بے چین ہے!

تمہاری یہ اُداسی تم پر اتنا گہرا اثر ڈال رہی ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں تو اِسی لئے تو پیدا نہیں ہوئے تھے کہ تیری چھوٹی زندگی ایسے ہی کسی بھنور میں گھوم گھوم کر اسی میں دفن ہو جائے پر یہ بھی سوچ رہا ہوں: بچپنے سے آج تک تمہیں ایسے کتنے ہی اُداس اُداس لمحوں سے سائے میں بیٹھنا پڑا تو کیا یہ اُن سب لمحوں سے بڑا ہے۔ جو تجھ سے تیری کل کی اُمید تک چھین لی؟

بیچ بیچ میں جس کے لئے تم ترس اُٹھتے ہو وہ تمہارا گھر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا گھر دور بہت دُور ایک سُندر گھاٹی میں ہے۔ جہاں کی ہوا جہاں کا پانی یہاں کے چہرے تیری رُوح میں رسے بسے ہیں۔ تم کتنی بار اچانک ہی برف سے ڈھکی چوٹیوں کو دیکھنے کی چاہت کرتے ہو۔ تمہارا دل کتنی ہی بار اپنی گھاٹی کی نیلی نیلی جھیلوں میں تیرنے کی تمنا کرتا ہے۔ تمہارا من کرتا ہے کہ بار بار اپنی گھاٹی میں کھلے ہوئے ہی پوش کے شگوفے دیکھے

تمہارے کانوں میں کتنی ہی بار یوں ہی اپنی گھاٹی کے مدھر گیتوں کی گونج سنائی دیتی ہے تمہیں اپنی گھاٹی کی بھولی بھالی روحوں سے کتنا پیار ہے۔ کتنی ہی بار تم اُڑ کر اُدھر جانا چاہتے ہو۔

تمہیں کیا کہیں کہ تم ہو کیسے؟ تم ایک بہت عجیب آدمی ہو، اسمیں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے بالکل ہی ڈر نہیں کہ تم مجھ سے خفا ہو جاؤ گے۔ تم ویسے آدمی بھی نہیں مگر تم ضرور ہی کچھ عجیب سے آدمی ہو۔ کہو کیا یہ عجیب نہیں کہ تم ایک الگ سمت کے ہو۔ ایک الگ زاویے سے دیکھنے والے ہو۔ ایک الگ خیال کے آدمی ہو میں نے کتنے دیکھے۔ روز بیسیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مگر تم سا کوئی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ تمہاری ایک الگ راہ رہی اور تمہاری الگ راہ جاتے جاتے آخر تمہیں ایک وسیع میدان میں چھوڑ دیتی ہے۔ جہاں بہت دیر تم دیکھتے رہنے کے بعد کسی ایک طرف نہ جا سکنے کی وجہ سے کھو جاتے ہو۔ تم کبھی گھبرائے نہیں۔ ہر اونچی نیچی ڈگر پر بڑی شانتی سے پاؤں دھرے۔ کبھی جیتے کبھی ہارے۔ مگر عموماً ہارتے ہی رہے۔ تم نے ہار اور جیت دونوں میں یکساں مزا لیا۔ تمہاری مسکراہٹ کبھی پھیکی نہ ہوئی۔ اُس میں برابر ہی مدھرا کی ہلکی چاشنی رہی۔ تم نے چاہا کہ تیری فضا اتنی خوب صورت ہو جس کی مہک نتھنوں میں گھستے ہی آدمی زندہ رہنے کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی تمنا کرے۔

اپنی عمر میں تم نے کتنی کوششیں کیں اور تم ناکام رہے۔ یہ تیری ناکامی تیری زندگی میں نئے دروازے کھولتی گئی۔ جن سے جھانک کر تم نے میلوں تک نئے راستوں کا پتہ چلایا۔ تم نے کبھی چھوٹا پن محسوس نہیں کیا۔ پھر یہ کیا عجیب بات نہیں کہ تم کو اتنی چھوٹی سی بات اتنا اُلجھا رہی ہے۔ کوئی سُنے تو کیا کہے۔

اب تم پہنچ رہے ہو، تم پہنچ رہے ہو اپنی منزل کے قریب، وہ دیکھو دِل کشا محل جس کی دیواروں کے ساتھ ہری ہری، گھنی گھنی بیلیں چپکی ہیں۔ دُور سے کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ دِلکشا پرانے زمانے میں ایک محل تھا۔ اور اسی محل کے کھنڈروں پر یہ بنگلہ بنا ہے۔ اِسی محل کی کہانی تیری زندگی سے کتنا پاٹ کھا رہی ہے۔......

دُور ایک گھاٹی میں تمہاری زندگی کے ماضی میں تُم نے اپنے نازک جذبات سے ایک محل بنایا تھا .... اس محل کی نیو بھی وقت کی بہتی لہروں پر ڈالی گئی تھی۔ ایک بار بھونچال آیا۔ تُم جلدی سنبھلے، دوسری بار آیا، اور اس طرح کتنی ہی بار، اور آخر کار ایک دھماکے سے اس طرح دکھائی دیا جیسے محل دب گیا ہو۔ تم گھبرائے اور اپنی گھاٹی سے بھاگے۔ دوڑے اور اِدھر آئے۔ اِدھر دلاسا پانے کی کھوج میں تُم آئے۔ تم کچھ دیر یہ سمجھتے رہے کہ تمہارا محل پُوری طرح دب گیا ہے۔ تُم نے اپنے محل کو کبھی بھی کھنڈر نہیں دیکھنا چاہا۔ سو تُم نے اپنے تصور میں اُس محل کو جلائے رکھا۔ مگر یہ بھی تجھے یقین تھا کہ تیرے محل کی نیو اتنی گہری ہے کہ کھنڈر اس کے کبھی ہونگے نہیں۔ پر یہ بات تیرے ذہن کے سوئے حصے میں تھی۔ دیکھنے میں تو تیرا محل اُجڑ گیا تھا۔ تجھے افسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اُجڑ جانے پر، اور اتنی جلدی اُجڑ جانے پر۔ تُم نے پھر دل کی مسلتی کلیوں کو تسلی دینا چاہا ------ تُم کچھ دیر سوچا کئے ------ دماغ تھک گیا۔ تھک کے تُم بیٹھ گئے۔ اکیلے تھے اوب گئے۔ تیری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوا خلا بڑھتا بڑھتا ایک کھاڑی بنا، اور اس کو پُر کرنے کا بھرنے کا کوئی ذریعہ نہ پا کر تم نے کسی مجبوری سے سگرٹ کا سہارا لیا .... تُم پیتے گئے بہت پیتے گئے اور ایک دِن لکھنؤ کی ایک بھیگی شام کو تیری سگرٹ کے دھوئیں سے بنتے ہوئے ایک ہالے میں تم نے اپنی اَدھ کھلی آنکھوں سے ایک حسین چہرے کے ہونٹوں کے کونوں پر ایک مُسکان دیکھی۔ مُسکان ایسی لگی جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ کُچھ جانی سی کچھ پہچانی سی۔ جیسے تیری یاد میں ٹھیاں سے جمے ہوئے کسی کے گلابی ہونٹوں کی مٹھاس کا چٹخارا۔ تم پھر ایک بار اُٹھے اور تیری آنکھوں کے چراغوں کی لو تھوڑی سی تھرک اُٹھی۔ اور تیرے سوکھے ہونٹوں پر تیری زبان پھر گئی۔ اور اُن پر آن کی آن میں گھاٹی کا رنگ آ گیا۔ اور تم لپکے۔ لپک کر اُچکے۔ اور اُچکتے اُچکتے دل کش محل کے اندر گئے ——— اُس وقت رات تھی تجھے اُدھر کی ہر چیز چمکتے ہوئے فانوسوں کی جگمگاہٹ میں بہت خوب صورت نظر آئی۔ تم گئے اور جاتے ہی رہے، ہر شام تُم دِل کش کی دہلیز پار کرتے ہی اپنی گھاٹی میں دبے محل کے کھنڈروں میں چلے

جاتے اور اُدھر چاند کی ٹھنڈی چھاؤں میں چھپکے سے آنسو بہاتے۔ تم دِل کُشا اس لئے گئے تھے کہ تیری چھینی ہوئی ہنسی لوٹ آئے۔

مگر میں نے اکثر دیکھا کہ تیری ہنسی بھیگی تھی اور اُس میں کہیں سے کھارا پن گھُل گیا تھا۔ تم اپنے سے کتنا دھوکا کرتے رہے۔ تم سے کتنی بار تیرے دِل نے دھیرے سے یہ سوال بھی کیا، بول رے بول اُدھر کیا دھرا ہے۔ جسم تجھے اُس کا چاہئے نہیں۔ مُسکراہٹ اُس کی چھلاوا ہے۔ رُوح میں اُسکی گہرائی نہیں۔ تو پھر کیوں آتا ہے ــــ؟ تم پہلے کچھ جواب نہ دے سکے۔ پر پھر تم نے زور سے بھینچتے ہوئے کہا مجھے اتنا قریب آنے دو کہ میں اُس سے نفرت کروں۔ اور دِل کچھ کہہ نہ پایا۔

یہ تو تمہارے ہاتھ اب تمہاری منزل کو چھُونے لگے۔ تم اندر جانا چاہتے ہو۔ تم نہیں بھی جانا چاہتے ہو۔ تم اسی تذبذب میں ہو کہ تم جاؤ گے کہ نہیں جاؤ گے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ تم نہیں جاؤ گے۔ تم جاکر کیا کرو گے۔ تمہارے لئے ادھر کیا دھرا ہے۔ تم جس کو "کسی" کا عکس جمیل سمجھ رہے ہو وہ اوروں کے لیے کچھ اور معنی رکھتی ہے۔ اور یہ تم نے کل رات دیکھا بھی کہ تیرے پرتو کی مُسکراہٹ کتنی کھوکھلی تھی۔ تمہیں اُس کی مُسکراہٹ میں کسی لالچ کی بُو آرہی تھی۔ اور تم نے جب اس کی اصلیت پہچانی تو اُدھر بناوٹ کے سوا کچھ تھا نہیں۔ کل رات اُس میں نوچ تھا نہ رس۔ ایک کڑواہٹ تھی۔ جو تم نے اُس کے بے رنگ لبوں سے چُوس لی ــــ کہو تم ابھی جانا چاہتے ہو۔ نہیں تم نہیں جاؤ گے لیکن تم ٹھٹھک کیوں گئے۔ .... چلے چلو اب تم اپنی منزل سے بہت دور نکل چکے ہو۔

دِل کشا پرانے زمانے میں ایک محل تھا۔ اسے ایک نواب نے بنوایا تھا۔ ادھر حرم سرا تھی جہاں باندیاں رہتی تھیں۔ یہاں کتنی ہی معصوم جانوں کی مانگیں، بڑے شان و جلال کے ساتھ دودھ سے دھل گئیں۔ یہ محل تھا تاریخ اس کی شاہد ہے اور یہ اُسی زمانے کی تڑپتی ہوئی یادگار ہے۔ یہ مسکراہٹ جسے تو غلطی سے کسی کا پرتو سمجھ بیٹھے تھے تب بھی جھوٹی تھی۔ آج بھی جھوٹی ہے۔ ہمیشہ جھوٹی رہے گی۔ میں نے تجھ سے پہلے ہی کہنا چاہا۔

پر نہ کہہ سکا۔ سوچا تیرے دِل کو ٹھیس پہنچے گی۔

لوٹ آؤ۔ اب تم بہت دُور نکل گئے ہو۔ اِدھر شہر ختم ہوتا ہے، اور سامنے کے یہ کھیت گاؤں کے نزدیک آنے کا پتہ دے رہے ہیں۔ شام کے سائے بھی دھندلے ہونے لگے ہیں۔ رات دھیرے دھیرے چھا رہی ہے جب تک کہ تو اپنے رین بسیرے پر پہنچ گے ہو گے رات آدھی سے زیادہ نکل بھی چکی ہو گی۔ لوٹ آؤ اب ——

گر بُرا نہ مانو تو دِل لوٹتے لوٹتے یہ بات پُوچھوں کیا تم اپنی زندگی کو اتنا تھکا دینا چاہتے ہو کہ کچھ دیر کے بعد اسمیں بالکل ہی قوت نہ رہے، تم آخر اسے کبھی آرام بھی دو گے ——؟

دیکھو اگر تم اپنی زندگی پر ایک چھلکتی سی نگاہ ہی دوڑاؤ تو تمہیں پتہ لگے گا کہ لڑکپن سے آجتک برابر ہی بے چین رہے۔ بے قرار رہے۔ تھکن سے چور چور اپنے دِل کا لہو پیتے رہے کبھی کبھی تمہاری رُوح بھی درد کرتی ہو گی۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ارے آدمی تو تم اچھے ہو، اس میں شک نہیں۔ تمہیں کسی سے مطلب بھی نہیں۔ ایک مُسکراہٹ تمہارے پاس ہے جو تم ہر جانے اَن جانے کے سواگت کے لئے جھٹ سے بکھیر دیتے ہو۔۔۔۔ خیر جانے دو۔

سنو تو تم اِس قدر جلدی سے کیوں جا رہے ہو، ساتھ چلتے ہیں۔ مجھے بھی گنج تک جانا ہے۔ آج ایک تو جلدی ہوٹل جانے کا موڈ بھی نہیں۔ دوسرے تم جو ساتھ ہو۔ بیچ راستے میں تمہیں چھوڑ دینا نہیں چاہتا۔

اوہو! دیکھا تم نے، یہ جو ابھی ابھی سائیکل پر ایک بال کٹی ننگی باہوں والی نوجوان لڑکی جا رہی تھی۔ کس عجیب ڈھنگ سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ جانے تمہارا رنگ رُوپ اُسے اتنا کیوں بھا گیا۔ جو مُڑ مُڑ کر دیکھتی ہی جاتی ہے بجلی کی روشنی میں یہ دھیرے سے جاتی ہوئی لڑکی بڑی مست نظر آ رہی ہے۔ اسے تمہاری توجہ کی اس وقت کتنی ضرورت ہے کاش تم اپنی بجھی بجھی سی نگاہوں سے ایک بار اس کی سراہنا کرتے۔ اِس کے جُھوم جُھوم کر سائیکل چلانے کی سراہنا کرتے۔ اسکی مست چال کی سراہنا کرتے۔ تو یہ نوجوان لڑکی کتنی خوش ہوتی شاید کل کو جب وہ کیپٹال میں مَیٹنی شو دیکھنے جاتی۔ اور شاید تجھے دیکھ کر تمہارے ساتھ بیٹھتی۔

تم اُس کے دوست ہوتے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے اپنے بوائے فرینڈ کے بارے میں گپیں ہانکتی اور تم اپنی گرل فرینڈ کو اپنے دوستوں میں لئے ایک راز بنائے پھرتے، اور اُن کے لئے تم اور تمہاری بال کٹی دوست ایک ابدی تجسّس رہتے۔ مگر آج تیری توجہ ان چیزوں سے کتنی ڈھل چکی ہے۔ میں نے اس لڑکی کی آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ بھی دیا کہ میرے دوست کو تجھ سے نفرت نہیں۔ اُسے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔ پر وہ تمہارے پاس نہیں آنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اُسے ایک نامعلوم سا ڈر ہے کہ کہیں تم بھی اُس کے لئے ایک سوال نہ بن جاؤ۔ پھر میں نے اُسے صاف طور سے کہہ دیا۔ کہ اگر تمہاری زندگی میں اس ستی تلے کچھ بھی درد چھپا ہے۔ وہ اس کے دامن میں ڈال دو۔ اور چلتی بنو۔ وہ کچھ نہ بولی الٹا سے مارے بدن کو ایک لچک دیکر بھاگ گئی۔

میرے خیال میں اب ہم بہت فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ یہ ریلوے کراسنگ بھی تو سامنے ہے۔ لال بتی جل رہی ہے۔ ریل آتی ہی ہوگی۔ پھاٹک بھی بند ہے۔ وہ دیکھو ریل آرہی ہے۔ اس کی تیز تیز روشنی بہت دور تک اُجالا کر رہی ہے۔ مگر تم کہاں جا رہے ہو۔ رُکو مجھے کے جنگلے کے قریب جب تک کہ ریل گذر جاتی ہے۔ لیکن تم جنگلہ پھاندنے لگے۔ کہاں جا رہے ہو مرنے کا ارادہ ہے۔ کیا سُنتے نہیں گارڈ چیخ رہا ہے۔ ٹھہرو ٹھہرو ......

او میرے دوست تم کتنے خطرناک آدمی ہو۔ ذرا ایک جھپکنے کی دیر تھی کہ تیری ہڈی پسلی سب چکی ہوتی۔ یہ گاڑی بہت لمبی ہے۔ دیکھو اس کے پہیوں کی طرف، موت کے کھُلے ہوئے جبڑے ہیں۔ ان ہی لوہے کے دانتوں میں تمہارا سر مربن جاتا۔ ابھی ابھی تم کتنے خطرناک آدمی ہو۔ ساتھ مجھے بھی گھسیٹ رہے تھے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا مر بھی نہیں سکتا کیونکہ میں اپنے باپ کا بڑا لڑکا ہوں اور میرے بہت سے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن بھی تو ہیں۔ مجھے اُن کیلئے بھی تو جینا ہے تم مرنا چاہتے تھے تو خود ہی مرتے۔ مجھے کیوں لئے پھار ہے تھے۔ مان لو ایک منٹ کے لئے تیرا پیر پٹڑی میں پھنس جاتا اور جب تک کہ تو اُسے چھڑانے کی کوشش کرتا تیرا دن نکل چکا ہوتا۔ نہیں ہوتا کیا۔ تم ہی کہو پاگل کہیں کے۔ میں تم سے بات تک نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا غصہ آرہا ہے نہیں آئیگا کیا۔ تم ہی تو ایسا کرتے ہو۔ چلو خیر اب اتنا غصہ نہیں، ابلے

میں ایسا ہوتا ہے۔ تمہاری سمجھ آج کام نہیں کر رہی ہے تم آج کچھ بھی نہیں سمجھو گے۔ یہ لو گنج بھی آ گیا۔ اب فٹ پاتھ سے ہوتے ہوئے جانا، بیچ سڑک سے نہ گزرنا ورنہ کیسے بچو گے۔

اللہ رے تمہیں کیا ہو گیا ہے آج! کچھ کہو بھی تو، یہ گنج ہے۔ ادھر کی شامیں کتنی حسین ہوتی ہیں۔ لیکن آج یہاں کی نیلی نیلی سفید، لال لال اور دودھیا روشنیاں اتنی رنگین کیوں نہیں تم آج گنج کی حقیقت پر کیا سوچ رہے ہو، کیا یہ سب کچھ سطحی ہے۔ کھوکھلا ہے۔ چاندی کس طرح ان بازوؤں میں سجی ہے۔ دائیں طرف کے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی یہ مسکراتی رنگین تصویریں کس قدر پھیکی لگ رہی ہیں۔ ان کے لپ سٹک پتے ہوئے ہونٹوں کے نیچے تم آج ایک نئی چیز پا رہے ہو۔ جیسے اُن کے اپنے ہونٹوں میں اپنے خون کی لالی نہ رہی ہو۔ عورتوں کی کمریں بازو ڈالے یہ مرد جیسے بھی انہیں باندھے ہیں۔ تم ان سبوں پر ہنس رہے ہو اور یہ اس بات کو سمجھ کر اپنے کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش کر رہے اور اس میں کامیاب نہ ہو کر بُری طرح کھسیا جاتے ہیں۔

بیچ سڑک میں سے ڈولتی ہوئی یہ موٹر کتنی بھلی ہے۔ تمہاری چپل کی طرح اور تم بھی ایسی ہی سڑک پر ایک ایسی ہی کار چاہتے ہو۔ جس کی رفتار اتنی تیز ہو کہ گنج کا سارا منظر ہی پکاسو کی ایک تصویر بن جائے۔ تم کتنا چاہتے ہو کہ آج کی رات گنج کی یہ روشنیاں اتنی چمک اُٹھیں کہ آپ اپنی موت بن جائیں۔

چلو اب بہت دیر ہو رہی۔ تم اب بہت تھکے ہو۔ ایک رکشہ لے لیتے ہیں کیا خیال ہے تمہارا، او رکشے والے، یونیورسٹی چلو گے .... تو چلو .... اچھا بھئی اب تو ہمیں جانا چاہئے۔ تم چڑھو رکشے پر .... چڑھو نا .... ارے تم تو مجھے کیا پکڑے ہو .... کیا میں نہیں جاؤں گا .... کیوں .... ہونہہ .... اچھا جی، نہ سہی، تو چلو آج کی رات تمہارے ساتھ ہی کاٹتے ہیں۔ اور پھر تمہارا پارٹنر بھی نہیں ہے۔ آج تو دوسری کھٹیا خالی ہی پڑی ہو گی۔ پھر رات مزے سے کٹ جائے گی۔ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ خواہ مخواہ تجھ سے ہمدردی سی ہونے لگی۔ ورنہ کیا تھا

اور میں کون ——

سنو بھیا، بات تو کرو۔ یہ خاموشی بہت بھونڈی لگ رہی ہے اب، مجھے بالکل پسند نہیں۔ سنو یہ رکشا والا کیا کیا کہہ رہا ہے۔ دیکھو کس انداز سے کہہ رہا ہے۔ صاحب لکھنؤ لکھنؤ کہاں رہا۔ اسے لکھنؤ کی پرانی ٹھاٹھ کے گزر جانے پر کتنا افسوس ہے۔ تمہیں تو اس کی باتوں پر پیار آتا تھا کبھی۔ یہ رکشا والا آج بھی لکھنؤ کا ہی ہے۔ مگر تم اس کی بات سُن کیوں نہیں رہے ہو۔ کیا تم اس کی پتلی پتلی ننگی ٹانگوں کی طرف دیکھ رہے ہو۔ اس کے پیر سائیکل کے پائدانوں پر ٹھہرے ٹھہرے سائیکل کی مشین کا ایک حصّہ بن گئے ہیں۔ دیکھ کتنی تیزی سے چلا رہا ہے۔ تم اسے کہدو کہ اُتنی کوئی جلدی نہیں۔ پر یہ تمہیں خوش کرنا چاہتا ہے۔

تو یہ تمہارا ہوسٹل آگیا۔ اُترو۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات بہت ہو چکی ہے۔ کون کمرہ ہے —— اٹھارہ —— ہے نا —— چلو ——

ارے اِدھر تو تالا ہے۔ چابی ہے تمہارے پاس —— کیا کھوج رہے ہو۔ سمجھا —— کھو گئی ہوگی —— مارو گولی —— لاؤ بیٹا میں توڑ دیتا ہوں تالا ہی —— یہ لو توڑ دیا —— جاؤ اندر ——

ارے! یہ کیا ہے ——؟ اِدھر تو خاصا ویرانہ بن چکا ہے۔ میں نے کہا تھا نئے آپ آدمی ہیں یا جانور ——! تم اِدھر کیا رہتے ہو گے —— یہ تمہاری میز —— یہ چارپائی —— یہ شیلف، یہ الماری —— یہ سب ہی کچھ اُجڑ کیوں گیا ہے ——؟ یہ بے ترتیبی کیوں ہے؟

او تم لیٹ گئے —— سو گے کیا ——؟ نہیں تُم تو تھک کر آئے ہو۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ کھانا کھالو —— خالی پیٹ سونا اچھا نہیں۔ کھالو تھوڑا سا، اتنی ضد نہ کیا کرو —— اچّھا نہیں لگتا۔ دیکھو یہ تُم کو کھانا لے کر آیا ہے۔ کھاؤ نا۔ اچھا نہ کھاؤ —— جیسے تمہاری مرضی۔ مگر بستر کیے دیتا ہوں۔ ہاں اِدھر ماں باپ نہیں ہیں، نہیں ہیں۔ جو تمہارے ناز اُٹھاتے پھریں۔ سمجھے —— گھربار

ایسے ہی لیٹنے کا کیا مطلب ——— ؟ کپڑے بدل دو۔ چپل نکال دو۔ اطمینان سے سو جاؤ
غریبے کو آواز دو وہ تمہارا بستر جھاڑ دیگا۔ اس طرح سو جانا ٹھیک نہیں۔ اچھا پھر بھی بستر
سے یہ چادر ہٹا دو ——— میں نے کہا تم کچھ سنتے بھی ہو یا نہیں ——— عجیب قسم کے
جانور ہو ——— اچھا، اب کیا کہیں .... لیکن کیا میں بھی اس خالی کھٹیا پر
رات بھر پڑا رہونگا ——— کیا یہی مہمان نوازی ہے تمہاری ——— ؟
اچھا تو دروازہ بند کریں ——— نہ کریں ——— تو نہ سہی ——— کہیں
کچھ ڈر تو نہیں ہے ——— تو رہنے دوں کھُلا ہی ——— جیسے تمہاری مرضی
——— بجلی بند کروں ——— دیکھو تمہارا یہ ٹیبل لیمپ جس کی دھیمی ہری
روشنی۔ آج ایک بھی رمق رومینٹک نہیں خواہ مخواہ مجھ کو رُلا رہا ہے۔ بجھا دوں
اسے .... نہیں تو نہ سہی۔ جیسے تمہاری مرضی

اب رات بہت آ چکی ہے۔ تمہیں نیند نہیں آتی۔ مگر تم کچھ سوچ رہے
ہو ——— کیا سوچ رہے ہو۔ تم یہ کیا کرید کرید کر کھود رہے ہو۔ یہ کیا ہے جسے
تم اُکسانا چاہتے ہو .... او سمجھا، تمہارا ماضی۔ ارے میرے پاگل دوست
تمہارا ماضی صرف ماضی ہے۔ اسے اپنا حال بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا مستقبل کتنی
اور کہانیاں لئے تمہارے انتظار کو کھڑا ہے۔ وہ اس سے کہیں میٹھی ہونگی، کہیں تلخ ہونگی تم
نے ابھی سے اتنی سنجیدگی سے چند ایک کہانیوں پر ہی اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ تم ابھی
جوان ہو۔ تمہارے ماضی کے حوادث کی تعداد اور بڑھے گی۔ اُن کے پھیلاؤ کو نہ روکو
میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنے ماضی کی کہانیوں کو یاد کرنے میں کسی گنجے کی کھجلی کا سا
مزہ آتا ہے۔ مگر نہیں جانتے کہ اُس سے مرض بڑھتا اور خون آتا ہے۔ تم نے میری
نیند تک اچاٹ کر دی۔ اب مُجھ سے تمہاری یہ پریشانی کی حالت نہیں دیکھی جاتی مجھے
کل سویرے کام پر جانا ہے۔ میں صبح سویرے کیا اُٹھوں مجھے ایسی
دوستی بالکل پسند نہیں۔ تمہاری زندگی میں حرکت نہیں۔ کوئی رفتار نہیں۔ کوئی

اُبال نہیں۔ تم سوچ رہے ہو ـــــــ صرف سوچ رہے ہو۔ تم پاگل ہوجاؤگے۔ تمہاری دوستی مجھ پر بھی تمہارے زہر کا اثر ڈالے گی۔ اگر میں تمہارے ساتھ کچھ دیر اور ٹھہروں تو میں ٹھہر سکتا۔ میں گھبرا رہا ہوں ـــــــ ادھر ہوا نہیں چلتی۔ اِدھر گھٹن ہے۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گا۔ -------- نہیں نہیں میں چلا ـــــــ میں چلا ـــــــ میں دوڑا ـــــــ میں بھاگا ـــــــ کوئی اُمید نہ رکھنا کہ کبھی اور تجھے ملوں گا۔

پُشکر ناتھ

اُبال

کئی دِنوں سے آسمان کی ہنڈیاں پک رہی تھی۔ مٹیالے سے گدلے رنگ کی، دھواں دھواں سی آنچ پر، اور صُبح اچانک اُسی میں اُبال آ گیا۔ سویرے سے ہی چند آوارہ چیلیں بہت اُوپر مٹیالی فضا پر منڈلا رہی تھیں۔ جانے کب کسی آوارہ چیل نے چونچ کا ٹھونکا مار کر ڈھکن گرا دیا اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی ساری بھاپ باہر اُمڈ آئی۔

بڑا ہنگامہ ہوا۔ ہاتھیوں کی دھکم پیل۔ شیروں کی گرج۔ غضب ناک شعلے لپکے۔ بلند ہوئے۔ اور پھر چاروں طرف جل تھل۔ چند ایک پھواریں میرے تپتے چہرے سے ٹکرائیں۔ ایسے لگا جیسے کسی شریر بچے نے گرم توے پر چھینٹے دئے ہوں ایک جھُر جھُری سی سارے بدن میں آئی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جانے کس خوبصورت گلی سے آیا اور کمرے میں لٹکے ہوئے جھیل کی تصویر والے کیلنڈر کو گد گدایا — صرف ایک جھونکا —— صرف ایک لمحہ —— اُس کے بعد میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہنڈیا پر ڈھکن بدستور رکھا ہوا تھا اور ہنڈیا اندر ہی اندر پک رہی تھی۔ دھواں دھواں سی آنچ پر —— اُف نظر کا یہ دھوکہ

اے شانتی —— ! دیکھا تُم نے؟ دو چھینٹے برسائے اور بس کی۔ یہ دو چھینٹوں کی بارش آگ لگا دیتی ہے...... گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ نکال کر ایک عورت نے فریاد کی۔

ٹھیک ہی کہا سوہجا گیہ وتی نے - واقعی یہ دو چھینٹوں کی بارش آگ لگا دیتی ہے۔ آدمی کا دِل چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ دے اور دیوانوں کی طرح سر پر خاک ڈال کر بازاروں اور گلیوں سے پہنچتا ہوا گزر جائے۔ پر جس نے زندگی کی قسمت میں یہ بچھوار کی یہ دو چھینٹیں بھی نہ لکھی ہوں ـــــ اُس زندگی کی آگ اور جلن اور تپش کتنی شدید ہوگی۔

اُف! دم گھٹ رہا ہے، میرے معبود! ایک صرف ایک سرد ہوا کا جھونکا اِدھر بھیجدے۔ تاکہ یہ آگ اک ذرا قابل برداشت بن جائے۔

مگر بات آوارہ چیلوں کی ہو رہی تھی۔ گدلی گدلی، مٹیالی سی فضا میں اُڑتی ہوئی یہ آوارہ چیلیں آنکھوں میں حرص کی چمک لئے گھومتی رہتی ہیں۔ ایک جھپٹا مارا تو ونا سپتی کا کال پڑ گیا۔

"سیٹھ جی آپ کا ٹرنک کال"

"بول رہا ہوں جی۔ ہاں جی ہزار ایک ٹین تو ہو گا جی۔"

"اچھا ابھی کرتا ہوں جی۔ ارے بانکے چھوڑ یہ کھاتہ اور گودام میں چلا جا۔ مُراری تم دو ٹرک لے کے آجانا ـــــ"

اِدھر بانکے اور مُراری گودام میں پہونچ گئے۔ چیل پھر مٹیالی فضا میں اُڑ گئی۔ اسے اُڑان میں کتنا اطمینان ہے۔ کتنا لاؤبالی پن ہے۔ اِن پروں میں کتنا توازن ہے۔ تھوڑی موسیقی بھی ہے۔ کتھا کلی نہ سہی۔ دھما چوکڑی ہی سہی۔ گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت نے ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر آواز دی

"اے شانتی ـــــ اُنا تُم نے۔ اب تو ونا سپتی گھی بھی نہیں مل رہا ہے۔ آج سبزی تیل میں پکائی ہے ـــــ" مجھے یاد آرہا ہے صرف تین سال پہلے جب اس شہر میں گھی نیا نیا داخل ہوا تھا کمپنی کی مشتہری کے لئے بازار میں ونا سپتی کے پکوان تیار کئے گئے تھے اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کے چکھائے گئے تھے۔

اور پھر لارڈ کلایو کی کمپنی کی طرح وناسپتی کمپنی نے شہر کو اپنا غلام بنا دیا —— اب اس غلام زادے کو ایک بار پھر نیلام پر چڑھایا گیا تھا۔ لعنت بھیجو! بات اصل میں ہنڈیاں کی ہو رہی تھی۔ جو دھیمی دھیمی آنچ پر پک رہی تھی۔ جانے اس ہنڈیا میں اُبال کیوں نہیں آ رہا ہے۔ گرمی بہت تیز ہو گئی ہے۔ دیواروں کو پسینہ آ رہا ہے۔

اے کاکا بہ پنجی لے کر ایک کلو برف تو پکڑا دے۔ حلق سوکھ رہا ہے پیاس کے مارے۔

ایک کلو برف —— ؟ پانچ پیسے میں۔ خود ہی جا کے لے آؤ بابو۔ ہمیں تو بیس پیسے میں ملتی ہے۔

کیا بکواس کر رہے ہو —— ! ابھی صبح ہی تو میں پانچ پیسے میں ایک کلو لے آیا تھا۔

اس ٹیم دوپہر ہے بابو —— صبح سے دوپہر تک تو آدمی منسٹر بن جاتا ہے۔

بابو افلاطونی ہے۔ کاکے کی بات اُس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آ رہی ہے سمجھ سمجھ کا پھیر ہے یا ہیر پھیر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور گرمی ہے کہ الاماں۔

اونٹوں کے کوہان سوکھ گئے ہیں اور اُوپر مٹیالا سا۔ یرقان کے مریض کے چہرے جیسا آسمان اور آوارہ چیلیں —— تیز عقابی نظریں مٹیالی فضا کو چیر کر برتوں کو چیر کر کھوج رہی ہیں۔ ٹٹول رہی ہیں۔ تلاش کر رہی ہیں۔ کہیں کوئی چڑیا کا بچہ تو نہیں ہمکتا کہیں کسی انڈے سے کوئی چوزہ تو نہیں باہر آیا۔ کہیں کسی بل سے کوئی چوہا تو نہیں جھانک رہا ہے۔

ہائے جانے کس جادوگر نے زندگی کو انڈے کے خول میں بند کر کے اُبالنے کے لئے آنچ پر رکھ دیا ہے۔

وہ اُدھر کوئی دروازہ چرچرایا۔ سیڑھیوں پر سیتا کھڑی رام کو جاتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں۔ بابوں کے ڈھیلے ڈھالے جوڑے

میں پاکیزگی کی خوشبو مچل رہی ہے۔ ماتھے پر سہاگ کی نشانی ایک لال رنگ کے چھوٹے پیسے کی طرح دمک اس چھوٹے پیسے کی دقعت کیا ہے۔ معمولی سی ساڑی تو دو سال کی کفایت شعاری سے حاصل ہوتی ہے۔ جانے ایک آٹھ گرہ کپڑے کا بلاؤز خریدنے کے لئے کتنے سو ارمانوں کا، کتنی ہزار خواہشوں کا، کتنی لاکھ تمناؤں کا خون کرنا پڑتا ہے

یہ کس جلد ساز سے بنوائی ہیں ——؟ رام کی چپلیں دیکھ کر اس کا ساتھی لچھمن اس سے پُوچھ رہا ہے اور رام ایک آہ بھر کر آکاش کی گدلی گدلی فضاؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی یخ بستہ بارش کی دو بوندیں تلاش کر رہا ہے۔ مگر آسمان تو چیلوں کی اُڑان سے بھنبھنا رہا ہے۔ کالی چیلیں گوری چیلیں جن کے قبضے میں دائیں ہیں۔ جن کے پنجوں میں ملک بھر کی تمام کپاس اُلجھ گئی ہے۔

اس راج پاٹ سے تو بن باس ہی اچھا تھا۔

'یاسی گفت گو کرنا منع ہے' بس کی اندرونی دیوار پر لکھا ہے۔ جانے یہ کنڈکٹر وِسل کیوں نہیں دیتا۔ بنکم بابو ایٹم بم بنانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ایک نہیں ہمیں سو ایٹم بم بنانے چاہئیں۔ اِس کے لئے چاہے ہم سب کو ایک ایک ٹائم کا کھانا کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔

میں کہاں جاؤں ——؟ کیا کروں؟ میں اور میری گھروالی اور ہمارے تین بچے تو پچھلے نو برسوں سے صرف ایک ہی ٹائم کھانا کھاتے ہیں۔ گیا گودی مزدور اپنا سر کھجا کھجا کر سوچ رہا ہے۔

ہاں تو بنکم بابو! ہماری تمام سمیاؤں کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ ہے ایٹم بم۔ میں کہتا ہوں میری آدھی تنخواہ لے جاؤ۔ مگر مجھے ایٹم بم دیدو۔

مگر بنکم بابو پریشان ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے کان میں کہتا ہے' یار کہیں سے ایک بوتل گھاسلیٹ کا تو انتظام کرو۔ ایٹم بم یا مٹی کا تیل ——؟ ایک کہاں یہ دو دو سمسیائیں ہیں۔

گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت اپنی

ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملتی ہوئی کہہ رہی ہے۔ اے شانتی —— ! دیکھا تم نے یہ اُپلے موے جلنے کا نام نہیں لیتے۔ آنکھوں کی روشنی کھا جاتے ہیں۔

جانے یہ عورت ہر سمسیا کے بعد بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے شانتی کو کیوں پکارتی ہے۔ جانے اس عورت کا چہرہ صاف کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ کسی پی۔ ڈبلیو۔ ڈی اوورسیر کی بیوی تو نہیں لگتی جس کی تنخواہ دو سو روپے ہوتی ہے اور جو ایک شام کو سو روپے کی شراب پیتا اور پلاتا ہے۔ کسی بنئے کی دھرم پتنی بھی نہیں لگتی۔ جو کھدر کا کرتا اور پاجامہ پہن کر اپنی ہٹی پر بیٹھتا ہے اور ہر دیہاتی سے، ہر مزدور سے روپیہ کی جگہ ڈیڑھ لے کر کلو کے بدلے آٹھ سو گرام تول دیتا ہے۔ کسی سمگلر کی مسز بھی نہیں لگتی جو دو لاکھ کا مندر بنوا دیتا ہے اور مورتی کے نیچے اسی لاکھ کا سونا چھپا دیتا ہے۔ کسی سول سروس آفیسر کی وائف بھی نہیں لگتی جو بیوی کے نام پر ولایتی فرموں میں شیرز خریدتا ہے اور اپنے نام ان فرموں کو سرکار سے قرضے دیتا ہے۔ کسی مِل مالک کی للائن بھی نہیں لگتی جو سرکار سے اسٹیل کا کوٹہ حاصل کر کے اسے چور بازار میں فروخت کر دیتا ہے۔

آخر یہ عورت کون ہے ؟

آج ہوا اس قدر بند کیوں ہے ؟

ہر چیز اُبل رہی ہے۔ دھیمی دھیمی آنچ پر۔ اور چیلیں سروں پر منڈلا رہی ہیں اے لو چیل نے جھپٹا مارا اور پانی کی سطح پر ایک چھوٹی سی مچھلی کو اُٹھا کر لے گئی۔

مورخوں کا کہنا ہے کہ جب سومناتھ کے مندر پر محمود غزنوی نے دھاوا بولا تو مندر کے بے بس پجاری صرف ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔ محمود کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔

سکندر بھی چلا گیا۔ اور غزنی کا وہ جیالا بھی چلا گیا مگر ڈاکٹر دھرم داس ورما ابھی تک گلی کے ناکے پر اپنی دکان سجائے بیٹھا ہے۔ مورخوں کا یہ کہنا ہے کہ دھرم داس فسادات سے ایک سال اُدھر تک گلگت میں محکمہ مال میں پٹواری تھا اور فسادات کے دوران

ایک کلکتی عورت کے ساتھ دل لگی کرنے کے جرم میں برطرف کیا گیا تھا اور وہ بگولے کی طرح وہاں سے چلا آیا تھا۔ آج کل یہ گلی کے ناکے پر اپنی دکان میں بیٹھا تمام لوگوں سے دل لگی کرتا ہے۔ اور ڈاکٹر بن کر جنتا کی سیوا کر رہا ہے۔ نتیجہ تین مکان، دو دکانیں، ایک موٹر کار۔ اور سات عورتوں، نو بچوں اور دو مردوں کی بے وقت موت بلکہ طبی موت ——
اور آگے چل کر مؤرخ لکھتے ہیں کہ سومناتھ کا لٹیرا۔ مگر جانے ڈاکٹر دھرم داس زمانے کے بارے میں مؤرخ کیا کچھ لکھیں۔

اُف اِس دکان میں کتنا حبس ہے۔ جیسے ایک ساتھ کئی یم دوت گلا گھونٹ رہے ہوں۔

بے بس پجاریوں کی سنتان صرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔

سرکار مائی باپ میرا نام تو شام ناتھ ہے۔ میں پنڈت منا رام کا ایک معمولی دکاندار ہوں۔ قتل سنا ہے کہ سویل دور مندر ٹھاکران میں ہوا تھا۔ پولیس خونی کی تلاش میں تھی۔ میں شہر دکان کے لئے سودا سلف لانے آیا تھا۔ تو مجھے پکڑ کے یہاں لایا گیا ہے۔

میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے مائی باپ

اے بڈھے! چپ رہ۔ بھگوان کے گھر میں کھپ ڈالتا ہے۔ یہاں دیر ہو تو ہو اندھیر نہیں ہے۔

مگر حضور مائی باپ ——

دیکھو قتل ہوا ہے۔ قتل کا مقدمہ بھی پیش ہوا ہے۔ پھانسی تو کسی نہ کسی کو ملنی ہی چاہئے۔

مگر سرکار مائی باپ۔ میں شام ناتھ ہوں میں پنڈت منا رام کا پنساری ہوں۔

مٹیالا گدلا گدلا سا جال جو آسمان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تن گیا ہے۔ کتنی گھٹن ہے ہوا کا ایک جھونکا نہیں۔ پانی کی ایک بوند نہیں، روٹی کا ایک نوالا نہیں۔ کپڑے کا ایک چیتھڑا نہیں۔

سنا ہے آج بادشاہ سلامت کی تاجپوشی ہے۔ اسکولوں کے بچے بچوں میں

مٹھائی تقسیم ہوئی ہے۔ نانکو سنیارے کا کہنا ہے کہ اُس نے خود دیو جلوائی اور سرکاری کرمچاری کی باتیں سُنی ہیں۔ دیو کہہ رہا تھا: آٹھ سو دوں گا۔ کرمچاری کہہ رہا تھا: ہزار دوں گا۔ نہیں ننانوے اور سو کا پھیر۔

چپ رہ نانکو سنیارے۔ تیرے ایک جوان بیٹے نے تو پہلے ہی خودکشی کی ہے۔ بڈھا کھوسٹ۔ ستر برس کا ہوگیا۔ پر عقل ابھی تک نہیں آئی۔ یہ سرکاری باتیں کیا سمجھے؟

گلی کے پار ایک مکان کی بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے ایک عورت روپے کا نوٹ ہاتھ میں لے کر حیرت سے پکار رہی ہے۔

اے شانتی ——— ! سُنا تم نے اب تو اِس نوٹ کی قیمت صرف چالیس اور تین پیسے رہ گئی ہے۔ کل تک تو سو پیسے تھی۔

اُف یہ عورت تو مجھے پاگل کر دے گی۔ جانے کون ہے۔ کس کی بیوی ہے چڑیل لگتی ہے۔ ابھی چھ مہینے تک کتنی سُندر لگتی تھی۔ بال سنوارے۔ ہونٹ اخروٹ کے چھلکوں سے لال کئے۔ آنکھوں میں کجرے کی ہلکی سی تحریریں ڈالے۔ جوڑے میں موتیوں کا ہار سجائے۔ تب تو یہ بالکنی سے آدھا دھڑ باہر نکالے شاذو نادر ہی شانتی کو پکارتی تھی۔ اب کیا جانے کیا ہوگیا ہے۔ بال اُلجھے ہوئے۔ ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ آنکھیں لال۔ چہرے کی ھڈیاں اُبھری ہوئیں۔ جسم میں جیسے ایک بوند لہو بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔ بہت بجھی بجھی نڈھال سی۔ پژمُردہ سی چال میں آکر بالکنی پر کھڑی ہو جاتی ہے اور حسرت کی ایک نظر اردگرد ڈال کر آہ بھرتی ہے۔

یہ عورت صرف کوئی جادوگرنی ہے۔ میں کھڑکی بند کر لیتا ہوں —— نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

دیوار پر لگا ہوا جھیل کی تصویر والا کلینڈر ساکت ہے۔ جب میں پانچ سال کا تھا تو اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر میں اِس جھیل پر کنارے سیر کرنے جایا کرتا

تھا — آج کل اِس جھیل پر صرف پونڈ سٹرلنگ اور ڈالر سینٹ نامی لوگ جاتے ہیں۔ دیش واسیوں اور کتوں کا داخلہ بند ہے۔

"ماسٹر جی جنتا کسے کہتے ہیں؟" کوئی نادان بچہ اپنے اُستاد سے پُوچھ رہا ہے۔

جنتا —؟ ابے تجھے جنتا کے معنی نہیں آتے۔ جنتا اس طاقت کو کہتے ہیں جس سے ریل کا انجن چلتا ہے۔ ہوائی جہاز کا پروپیلر گھومتا ہے۔ راکٹ کا بدن کانپتا ہے۔ چاند کی دھرتی ناچتی ہے۔ دُنیا کا نظام قائم رہتا ہے۔ مگر میرے نادان بچے! جنتا کے یہ معنی دس ہزار برس پہلے کے لکھے ہوئے قلمی نسخوں میں درج ہیں۔ بعد میں بڑے بڑے ودوانوں نے کھوج کر کے پتہ چلایا ہے کہ سرخاب کی طرح جنتا نام کا بھی کوئی جانور حقیقی نہیں ہے۔ کبھی ہوا کرتا تھا۔ مگر بعد میں اِس جانور کی بے پناہ طاقت سے گھبرا کر اسے بوتل میں بند کر دیا گیا تھا اور ہمالیہ کی ترائی میں یا خلیج بنگال کی تہہ میں پھینکا گیا تھا۔

نور شاہ

رات اِک سمٹی ہوئی

رات کے آنچل سے بیٹی ہوئی بھیگی بھیگی سی خاموشی میں سُرخ رنگ کے ٹھرے کی ایک بوتل انڈیلنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا ہوں۔ سارا کمرہ دھواں دھواں ہے اور میں اس دھوئیں میں اُس روشنی کو تلاش کر رہا ہوں جو کہیں کھو گئی ہے ——— ابھی کچھ دیر پہلے پُرشکوہ تابناک دِن ایک روز گلاب کی طرح مرجھا گیا اور آسمان کی وسعتوں میں جلتا ہوا گول گول انگارہ غروب ہو گیا۔ جیسے شرما کر پہاڑوں کی اوٹ میں نہانے چلا گیا ہو ——— اور میں چاہتا ہوں کہ اِن خضب ناک اندھیاروں میں میرا یہ کمرہ ایک بلوری ناؤ کا رُوپ اپنا لے اور اس بستی کی ساری خوبصورت لڑکیاں جل پریوں کا لبادہ اوڑھ کر پناہ کی تلاش میں یہاں چلی آئیں اور میں ان کے تہہ دار موجوں کی طرح پھیلتے ہوئے جسموں سے لپٹ لپٹ کر سمٹ جاؤں اور سمٹ سمٹ کر ایک نقطہ بن جاؤں لیکن میرا دِل تھکا ہوا ہے۔ رُوح بھٹکی ہوئی ہے اور جسم نڈھال ہے۔

باہر بلیک آؤٹ ہے !!

کوئی آواز نہیں، قدموں کی چاپ نہیں۔ دھڑکنوں کی سرگوشی نہیں اور سامنے تپائی پر سُرخ رنگ کے ٹھرے کی خالی خالی بوتل میری پیاس بڑھا رہی ہے!

میں نے آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا ہے اور اس پر لٹکا ہوا کالے رنگ کا ریشمی پردہ ذرا سا سرکا دیا ہے۔ اب میں باہر دیکھ رہا ہوں۔ ہر سمت تاریکی

ہے اور اس تاریکی میں اس بستی کے سارے مکان چُپ چاپ ایسے کھڑے ہیں جیسے ان کے مکینوں نے بھی پتھروں کا رُوپ اپنا لیا ہوں، بے حس اور بے جاں پتھر۔ میرا من کر رہا ہے کہ میں اس تاریکی کو چیر کر ان مکانوں کے در و دیواروں پر زور زور سے پتھر ماروں تاکہ ان میں بے شمار شگاف پیدا ہوں اور میں ان شگافوں میں سے اُتر کر ان بے حس اور بے جان پتھروں میں جان ڈالوں۔ ------ پر میں ایسا نہیں کر سکتا میرے ایک پتھر مارنے سے اس بستی کے ویران سناٹوں میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوگا اور پھر جانے کتنی بندوقیں ایک ساتھ گنگنا اُٹھیں گی۔ آسمان کی گہری کالی وسعتوں میں کتنے جہاز حرکت میں آ کر تھر تھرا اُٹھیں گے۔ اور شاید ------ میں رک بھی نہیں سکتا۔

میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا ہوں اور اب ان مکانوں میں جھانک رہا ہوں۔

میری نظروں کے سامنے جو خواب گاہ ہے، یہاں تین مرد اور ایک لڑکی ہے مردوں کے چہرے ایک جیسے ہیں، ہونٹوں پر ایک جیسی مُسکراہٹ ہے۔------ آنکھوں کی چمک بھی ایک جیسی ہے مگر یہ چمک جنگ کے بے پناہ خوف و ہراس سے بُجھ چکی ہے لیکن اس بجھی بجھی سی چمک میں بھی ہوس کے سُوتے پھوٹتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اُن کے سامنے وہ لڑکی موم بتی کی دھیمی دھیمی سی لو میں ایک ایسے درخت کی طرح کھڑی ہے جس کی شاخیں بے حد عریاں اور ننگی ہوں۔ اس لڑکی پر واقعی پت جھڑ آ چکا ہے۔ تب ہی تو اتنی عُریاں ہے۔ اور صمٌ بکمٌ کھڑی ہے۔ وہ تینوں مرد ایک ساتھ اُس پر ایک بھوکے گدھ کی طرح جھپٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن ------ شاید موم بتی کی دھیمی دھیمی روشنی انہیں ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔

اچانک آسمان پر کسی جیٹ جہاز کی آواز گونجتی ہے اور اس کے ساتھ ہی چاروں سمت انٹی ایر کرافٹ گنز کا شور اُمڈ پڑتا ہے۔ وہ تینوں مرد ایک دوسرے بازی لیتے ہوئے کمرہ سے باہر آ گئے ہیں۔ میں ایک گوشے میں اپنے آپ کو چھپانے کی

کوشش کر رہا ہوں۔ اب وہ تینوں ٹرینچ میں اُتر کر نظر نہیں آ رہے ہیں۔ میں صرف سہمی سہمی لڑکی کو دیکھ رہا ہوں۔ جو برآمدے میں بُت بنی کھڑی ہے۔ ایک پرچھائیں سی نظر آ رہی ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں شور بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ تینوں مرد ایک ساتھ اپنے ٹرینچ سے باہر نکل آئے ہیں اور ——— اور اس لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ وہ ٹرینچ میں اُتر چکے ہیں۔ اب ان میں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ اُن کے چہرے، آنکھیں اور نہ ہی ہونٹوں پر بکھرتی ہوئی گناہ آلود مسکراہٹ ——— جہاز جانے کس سمت نکل گیا۔ کن وسعتوں میں سُرخ سُرخ گولے برساتا ہوا گم ہو گیا۔ اینٹی ایئر کرافٹ گنز کی دندناہٹ ختم ہو چکی ہے۔ صرف ہلکی ہلکی سی چیخیں دھرتی کی گہرائیوں سے اُبھر رہی ہیں۔ اور میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں ——— میں اس اندھیرے میں بھی اپنی آنکھیں بند کر کے آگے بڑھ رہا ہوں۔

اب میں جہاں کھڑا ہوں یہ مکان اِس آبادی میں ایک ویرانہ ہے۔ یہاں سب کچھ ہے جو ایک گھر میں ہونا چاہئے۔ رسوئی سے خواب گاہ تک کے لئے ہر چیز موجود ہے لیکن ان چیزوں کو چھونے کے لئے جس نرم و نازک لمس کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہیں ہے۔ اِس ویرانے میں جو قدم پھول کھلا سکتے ہیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں ——— یہ گھر پروفیسر رضی کا ہے جو اِس کا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مالک نہیں ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کچھ لوگ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مالک نہیں ہوتے۔ اس بلیک آوٹ میں گرتے ہوئے سُرخ انگاروں میں بھی اسے ریشمی کا انتظار ہے۔ ریشمی ——— پگھلے ہوئے سونے کی طرح دمکتا ہوا جسم، کشتواڑی نگینوں کی طرح چمکتے ہونٹ۔ سانچے میں ڈھلا ہوا گرم گرم جسم ——— میں چاہوں تو اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر بھی جا سکتا ہوں۔ پروفیسر رضی کی دُکھ سُکھ کی باتیں سُن سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں پروفیسر کو یہ تنہائیاں بے حد محبوب ہیں۔ ان تنہائیوں میں وہ ریشمی سے باتیں کرتا ہے۔ کچھ اُس کی سُنتا ہے کچھ اپنی سُناتا ہے اور یہ تنہائیاں بے دائرہ لفظوں کو اپنی دیواروں میں قید کرتی ہیں ——— میری ذرا سی آہٹ

پر اُس کی ساری تنہائیاں جل جائیں گی۔ رشمی کا پیکر اِن سُرخ سُرخ انگاروں کی نذر ہو جائیگا۔ اِنتظار کا آئینہ ٹوٹ جائیگا۔ یہ ظلم میں نہیں کرنا چاہتا۔ مجھ سے نہیں ہوگا —— مجھے یاد آرہا ہے گذشتہ سال اِن ہی دِنوں میں جب وہ یہاں آیا تھا۔ رشمی کے ساتھ تو اِس بستی کے دِل دھڑکے تھے۔ روش روش پر مسرّت کے پھُول کھِلے تھے۔ وعدوں کے جام کھنکے تھے۔ محبّت کی شبنم چھِڑک گئی تھی ——
رشمی واقعی بے حد سُندر تھی۔ لیکن اب وہ نہیں ہے۔ وہ پروفیسر رضی کو چھوڑ کر چلی گئی ہے شاید رشمی کے دِل میں پیار کی ندی سوکھ چکی تھی اور آس کے بادل روٹھ چکے تھے۔ تب ہی تو وہ چلی گئی اور اِس گھر کے بے شمار اَن گنت لمحے تنہائیوں کی آغوش میں پل کر مُسکرا کر گنگنا کر وقت کی صلیب پر چڑھ گئے اور اب اِس صلیب پر جو زندہ لاش لٹکی ہوئی نظر آتی ہے، یہ پروفیسر رضی کی ہے۔

میں اِس صلیب پر لٹکی ہوئی لاش کو اپنے ذہن کے ایک گوشے میں چھُپا کر دبے دبے قدموں لوٹ آتا ہوں —— میرے سامنے ایک چھوٹی سی گلی ہے اور میں اِس گلی کو پار کر کے بجلی کے اُونچے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا ہوں۔ روشنی نہیں ہے لیکن میں جس مکان میں جھانک رہا ہوں ابھی چند دِن پہلے وہ رنگ رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ قمقموں کی روشنی میں نکھرا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے ملگجی آسمان سے ستارے اُتر آئے ہوں اور یہاں اپنی کھُلی کھُلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ روشنی بکھیر رہے ہوں لیکن اب ستاروں کی آنکھیں ٹمٹما کر بند ہو گئی ہیں اور روشنی تپتی ریت کے ذرّوں تلے گم ہو چکی ہے —— ابھی چند دِن پہلے سدھا یہاں دلہن بن کر آئی تھی۔ ابھی اُس کے ہاتھوں کی مہندی سوکھنے بھی نہ پائی تھی۔ ابھی اپنے اُس کو دیکھا بھی نہ تھا کہ جنگ چھِڑ گئی اور اُسے جانا پڑا۔ دُور بہت دور.... اِنسانی قدروں کی رکشا کے لئے جمہوریت کی بقا کے لئے —— فوجی حکمرانوں کی دست درازیوں، جابروں کے ظلم وستم اور اقتدار کے بھوکے آمروں سے لڑنے کے لئے .... اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لئے —— جنگ بند ہو گئی،

ضرور بند ہو گی۔ سچائی کی جیت ہو گی۔۔۔۔۔ لیکن کوئی مجھے سمجھا دے۔ اس ننھی منی دُلہن کی تمناؤں، آرزوؤں کے خون کا ذمہ دار کون ہے۔ جانے یہ جنگ کب بند ہو گی۔ یہ بلیک آوٹ کب تک جاری رہے گا۔۔۔۔۔ اُسی سمے تک ——— میں کھڑکی کے قریب آ گیا ہوں۔ سدھا اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ اس نے سُرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا ہے۔ اس پر کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کے جسم پر کونپلیں پھوٹ آئی ہوں اور چمپئی سا سایہ لئے لرزاں لرزاں اُس کا دودھیا بدن ایسے نظر آ رہا ہے جیسے سپید سپید ٹھنڈی ٹھنڈی برف میں بادام کے شگوفوں کا کھلا ہوا رنگ تھرک رہا ہو ——— آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائیاں ہیں۔ لیکن یہ گہرائیاں اُس کی نیم شبی کی داستان کو دہرا رہی ہیں ——— میرے من میں ایک طوفان اُٹھ رہا ہے۔ جانے یہ کیا طوفان ہے اور طوفان کا یہ ہچکولہ مجھے کہاں لے جائے گا ——— کہاں ——— خیالوں کی یہ لہریں کس کنارے پر پھینک دیں گی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانپ لیا ہے ——— میں اُس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں وحشی بن کر۔ میں کوئی خدا نہیں ہوں ——— اگر میں نے اُس کی جانب ایک بار دیکھنے کی کوشش کی تو ——— تو شاید ——— میری پیاس بڑھ رہی ہے ——— میری تشنگی بڑھ رہی ہے۔ میں اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی زبان پھیر رہا ہوں ——— شراب ——— صرف دو گھونٹ شراب خدا کے نام پر ——— نہیں وہ عظیم ہے ——— میرے نام پر ——— رتیمی کے نام پر (سُرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی دُلہن کے نام پر) شاید میرے جسم کی آگ بجھ جائے۔ بجھ کر راکھ ہو جائے اور دھواں ——— مجھے اپنی ہر سمت دھواں نظر آ رہا ہے اور میں دھوئیں کے مرغولوں میں پھلانگتا ہوا بھاگا جا رہا ہوں!

اب میں رُک گیا ہوں

میں رُکنا نہیں چاہتا۔ پر میرے کانوں سے ایک شیریں آواز ٹکرا رہی ہے۔

"جمالیاتی پیاس ——" ایک لطیف قہقہہ سنائی دیتا ہے۔

میں آگے بڑھتا ہوں —— اب میری نظروں کے سامنے اندھیرا ہے، بالکل اندھیرا —— اور بہ ترنم آواز اِس پُر اسرار اندھیرے میں اور بھی اضافہ کر رہی ہے آواز کی مٹھاس ظاہر کر رہی ہے کہ سراپا بھی خوبصورت ہوگا۔ جسامت اور قدامت بھی سُندر ہوگی ——

"جمالیاتی پیاس ——" ایک بوڑھی کھُردری آواز اُبھرتی ہے —— جمالیاتی پیاس سے مطلب یہ ہے کہ میں ازل ازل حُسن کا شیدائی ہوں اور میری حُسن کو دیکھنے، چھُونے اور پانے کی پیاس اَن مِٹ ہے ——"

"اَن مِٹ اور یہ تاریکی —— خُوب ——" وہ جواب دیتی ہے "حُسن دیکھنے اور پرکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت نہیں اور میں تو اندھیاروں کا باسی ہوں۔ روشنی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں ——؟"

"یہ میں خود بھی نہیں جانتا ——"

"لیکن میں جانتی ہوں۔ ابھی ابھی جان گئی۔"

"کیا ——؟"

"جانے بھی دیجئے۔ بندو ابھی تک کافی نہیں لائی ہے۔ میں اندر جا کر اُس کی مدد کرتی ہوں —— تب تک شاید میرا بھائی بھی آجائے گا مجھے لینے کے لئے"

"رُک بھی جاؤ ——" وہیں آواز سُنائی دیتی ہے۔

میں نرم و نازک قدموں کی آواز سنتا ہوں —— وہ کمرے سے اُٹھ کر جا رہی ہے۔ سُبک روی کے ساتھ جیسے جھیل کی سطح پر بطخ تیرتی ہوئی جا رہی ہو۔ ایک دروازہ نیم وا ہوتا ہے اور پھر بند ہوتا ہے —— خاموشی ...... طویل خاموشی !!

"سالی ڈھی کھُردری آواز پھر کانوں سے ٹکراتی ہے —— "مجھے بوڑھا

سمجھتی ہے ــــ کیا ہوا میں اُس کے باپ کی عُمر کا ہوں ــــ کیا ہوا وہ میری بیٹی کی دوست ہے، ہم جماعت ہے۔ پڑھنے کے لئے یہاں آتی ہے ــــ میں تو حُسن کا پرستار ہوں ــــ ہر عُمر کا شیدائی ہوں ــــ میری بھُوک اَن مِٹ ہے ــــ ہیں ــــ ہیں ــــ"

کوئی آواز نہیں۔ صرف قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ دروازہ ایک بار اور نیم وا ہو جاتا ہے اور پھر زور سے بند ہو جاتا ہے ــــ اب یہاں کوئی نہیں ــــ کوئی نہیں!!

دُور کالی کالی فضاؤں میں کسی فوجی ٹھکانے سے سرچ لائٹ چھوڑی گئی ہے اور اچانک اِن کالی فضاؤں میں ایک لمحے کے لئے قوسِ قزح کا رنگ نکھر گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی گولے برسانے کی آواز ساری بستی میں اتھل پتھل مچا رہی ہے ــــ ایک سایہ میری جانب بڑھ رہا ہے ــــ

"کون ــــ ؟" سایہ قریب آکر پوچھتا ہے۔

"میں ہوں"

"آپ ہیں صاحب"

"اصغر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"اندر ڈر لگ رہا ہے۔ اندھیرا ہے نا صاحب"

"بھائی اندھیرا تو باہر بھی ہے ــــ" میں کہتا ہوں

"وہ تو ہے صاحب ــــ لیکن ــــ اندر کوئی بم پڑا تو کیسے بھاگ سکوں گا۔"

"پڑنے کو تو بم یہاں بھی پڑ سکتا ہے۔ ویسے اندر کون ہے ــــ ؟"

"کوئی بھی نہیں ــــ"

"کریم صاحب، اُن کی مسز اور بچے۔"

"کریم صاحب تو ساتھ والے کوارٹر میں تاش کھیل رہے ہیں۔ بی بی جی بچوں کو لیکر مہری نگر چلی گئی ہیں۔

کریم صاحب کو تاش کھیلنے کی کس قدر ہوس ہے۔ سامنے سرحدوں پر گولے برس رہے ہیں۔ ساتویں بحری بیڑے کی آمد آمد ہے اور اپنے کریم صاحب تاش کے پتوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ اور وہ بھی ساتھ والے کوارٹر میں۔ مسز گوتم سنگھ کے ساتھ تاش کھیل رہے ہوں گے۔ سنگھ جی تو شام کو دو ایک پیگ پی کر بہک جاتے ہیں۔ اور بہک کر سو جاتے ہیں۔ پھر کریم صاحب اور مسز گوتم سنگھ پتوں میں جانے کیا تلاش کرتے رہتے ہیں۔ یہ اکثر ہوتا ہے۔ اکثر کیا ہر رات گئے تک یہ بازی چلتی رہتی ہے۔ اور اُدھر کریم صاحب کے ہاں ——— اُنھیں یہ معلوم نہیں رہتا کہ اُن کی اپنی دھرتی پھیل گئی ہے یا سکڑ گئی ہے۔

میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹ رہا ہے۔

"سرینگر کیوں ———" میں پھر کریم صاحب کے ذکر اصغر سے پوچھتا ہوں۔

"صاحب وہاں مسلمان رہتے ہیں نا۔ وہاں بمباری نہیں ہوگی۔ اِس لئے وہاں کوئی ڈر نہیں۔"

"کتنے بھولے ہو اصغر۔ تُم نے سُنا نہیں آج پاکستانی جہازوں نے سرینگر کے ہوائی اڈے پر کئی بار حملے کئے کئی آدمیوں کے مرنے کی خبر بھی آئی ہے۔"

"یہ جھُوٹ ہے صاحب۔ بھلا مسلمان مسلمان کو مار سکتا ہے۔"

"اور جو مشرقی بنگال میں ہو رہا ہے، وہ کیا ———؟"

اصغر میری بات کاٹتے ہوئے کہتا ہے ——— "صاحب بی بی جی کہتی تھی وہ مسلمان نہیں بنگالی ہیں۔"

"اور تمہارے کریم صاحب ——— وہ کیا ہیں ———؟"

"توبہ توبہ ———" آپ کیا کہتے ہیں صاحب۔ وہ تو پکے مسلمان ہیں، نماز و نوافل پڑھتے ہیں۔ ہر روز صبح سویرے ——— ہاں صاحب ذرا شام کو.....

بیگم، غلام، بادشاہ .... یکہ .... ہاں صاحب میں آپ کی بات سمجھ گیا
.... رشوت کی بات کہہ رہے ہیں آپ ——— سب سمجھ رہا ہوں صاحب
.... ذرا بات سمجھنے میں دیر لگتی ہے۔ اَن پڑھ ہوں نا صاحب ———
بی بی اُن کو یہاں چھوڑ کر چلی گئی ——— اور ——— وہ ———"
میں سُنی کو اَن سُنی کرتے ہوئے پیش قدمی کر رہا ہوں۔
اصغر پیچھے رہ گیا ہے

درمیان میں ایک چھوٹی سی تپائی ہے ——— اس کے اردگرد چار کُرسیاں ہیں ——— تپائی پر تاش کے باون پتے بکھرے پڑے ہیں۔ دو کُرسیاں خالی ہیں اور دو کرسیوں کے پس منظر سے دو لٹکے ہوئے چہرے اُبھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ ایک چہرہ کریم صاحب کا ہے اور دوسرا چہرہ مسز سنگھ کا ہے۔ اس ماحول میں ایک اور وجود نظر آرہا ہے۔ یہ گوتم سنگھ ہیں جو ایک گوشے میں صوفہ پر دبکے پڑے ہیں۔ جی۔ سنگھ ——— گورنمنٹ کنٹریکٹر اینڈ سپلائر ——— لگتا ہے۔ دو ایک پیگ پینے کے بعد وہ بہک گئے ہیں، اور بہک کر سو گئے ہیں

"ایک اور چال" مسز سنگھ کہتی ہے۔
اُس کی شرابی آنکھیں کریم صاحب کے چہرے پر مرکوز ہوتی جا رہی ہیں۔
"بس اب بند بھی کیجئے۔ کافی دیر ہو گئی۔"
"اجی آپ کمال کرتے ہیں۔ ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے۔"
"چلئے میری بھی ایک چال۔"
"میں اپنی چال ڈبل کرتی ہوں۔"
"میں پتے دیکھے بغیر ہی اُوپر ہو جاتا ہوں۔"
کریم صاحب نے بن دیکھے اپنے پتے اُوپر کر لئے ہیں۔
"مسز سنگھ میں چاہتا تو یہ بازی جیت سکتا تھا۔"

"آپ جب بھی چاہیں جیت سکتے ہیں۔ تاش کی بازی ہی نہیں ـــــ بلکہ ـ"

"میں جان بوجھ کر ہارنا چاہتا ہوں۔"

"آپ بھی عجیب ہیں جیتی ہوئی بازی کو بھی ہارنا چاہتے ہیں۔"

آنکھیں ایک دوسرے کے اور قریب آ گئی ہیں اور قریب کر کے شعلے برسا رہی ہیں۔ صوفے پر لیٹے ہوئے گوتم سنگھ جی اچانک اُٹھ بیٹھے ہیں۔

"ڈارلنگ آج کی شب بھی کریم صاحب نے دستخط نہ کئے تو جانتی ہو اپنا کتنا نقصان ہوگا۔ دو لاکھ کی بات ہے ـــــ آج تو آخری رات ہے۔"

میرا وجود تھرتھرا رہا ہے۔ میرا انگ انگ کانپ رہا ہے۔ میں جان گیا ہوں کہ دو ایک پیگ پینے کے بعد جی۔ سنگھ گورنمنٹ کنٹریکٹر اینڈ سپلائر کیوں بہک جاتے ہیں۔ اور بہک کر سو جاتے ہیں۔ اور کریم احمد آنندی ایگزیکیٹو انجنئر یہاں اکثر کیوں آتے ہیں ...... رات گئے تک باون پتوں سے کیوں دل بہلاتے ہیں ـــــ بادشاہ ـ غلام ـ نہلا ـ دہلا ـــــ یکہ اور پھر بیگم ـــــ تاش کی بیگم نہیں، زندہ جاوید بیگم!

"ڈارلنگ فائل اندر کمرے میں پڑی ہے ـــــ آج ـــــ ابھی دستخط ہوں تو ٹھیک ہے ـــــ کل کا کیا بھروسہ ـــــ کل کس نے دیکھا ہے اور پھر جنگ ہے۔ یہ جنگ ـــــ ایسی جنگ روز روز تھوڑی ہوتی ہے۔ کل پو پھٹنے سے پہلے ہی اگر cease fire کا اعلان ہوا تو وہ پُل کیسے بنے گا۔ کس لئے بنے گا۔ ڈارلنگ تم میری بات سمجھتی کیوں نہیں ......"

نظریں ایکبار اور ٹکرا رہی ہیں اور ٹکرا کر ایک اَن کہی داستان کو دہرا رہی ہیں۔

"پُل بنے گا ـــــ ضرور بنے گا۔ جنگ بند ہونے سے پہلے بنے گا۔ قومیں روز روز یا گل کہاں بنتی ہیں ـــــ مسٹر سنگھ ـــــ یہ کریم صاحب بول رہے ہیں

اب وہ دونوں اُٹھ گئے ہیں اور دوسرے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ اب میں صرف گورنمنٹ کنٹریکٹر جی سنگھ کو دیکھ رہا ہوں جو پھر بہک گیا ہے اور بہک کر سو گیا ہے ـــــ تپائی پر تاش کے پتے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ پتے بے جان ہیں ـــــ ایک دستخط اور دو لاکھ کی کمائی ـــــ یہ ہم کس سماج، کس سوسائٹی کی تخلیق کر رہے ہیں ـــــ کیا ہم ایسے ہی سماج کی تخلیق کے لئے جنگ لڑتے ہیں ـــــ؟ ان ہی بے سُر اور بے مقصد آدرشوں کے لئے ـــــ میرے اندر کی اَن دیکھی آگ میری آنکھوں سے اُتر کر دھیرے دھیرے میرے دامن میں سلگ رہی ہے۔

جانے رات کا کون سا پہر ہے۔ اس بستی میں گھومتے پھرتے رات کا بہت سمے گزر چکا ہے۔ جانے سویرا کب ہوگا ـــــ سویرا ـــــ یہ پہلی کوٹھی ہے۔ کئی برسوں سے خالی پڑی ہے۔ کہتے ہیں یہاں آسیب رہتے ہیں..... بھوت..... رات کے اس سناٹے میں مجھے لگتا ہے کہ یہاں پر ہر کوارٹر، ہر مکان، ہر کوٹھی اور ہر گھر میں بھوت رہتے ہیں۔ آسیب جو دن کی روشنی میں مختلف رُوپ اپنا کر نظر آتے ہیں اور رات کی تاریکی کے ساتھ ہی غائب ہو جاتے ہیں ـــــ اور یہ پرنسپل سوری کی کوٹھی ہے ـــــ ان دنوں لندن گئے ہوئے ہیں۔ کوٹھی بالکل خالی ہے۔ اب تو کئی دنوں سے وہ بوڑھا مالی بھی نظر نہیں آتا۔ اپنے پنڈ گیا ہوگا۔ اپنے بال بچوں میں ـــــ اور یہ یونائیٹڈ فرنٹ کے سیکریٹری نتھو رام جی کا گھر ہے۔ یہ گھر اس بستی میں سیاسی اکھاڑے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ الیکشن کا زمانہ قریب ہے اور ان دنوں یہ سیاسی اکھاڑہ سیکولرازم کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے ـــــ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ـــــ

یونائیٹڈ فرنٹ کا سیکریٹری دھیمے لہجے میں چلا رہا ہے!

"ہم سب بھارتی ہیں۔ ہمارے رنگ مختلف سہی مگر غور سے دیکھا جائے تو ان رنگوں کی آمیزش کتنی پیاری ہے ـــــ ہماری ایک تاریخ ہے..... منزل ہے

—— دراصل ہمارا اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ فرسودہ ہوگیا ہے —— یہ کلچر، یہ تہذیب، یہ تمدّن سب بھرے ہوئے پیٹ کا مرہونِ منّت ہے۔ اور —— اور۔"
ڈھیر ساری باتیں بے تسلسل —— کتنے اُونچے آدرش ہیں —— بے عمل!
"الیکشن ہونے والے ہیں —— آپ سب نے مِل جُل کر کام کرنا ہے —— اپنے آدرشوں کے لئے، اپنے مُلک کے لئے —— میرے لئے —— میں ایک بار پھر آپ کے گوشِ گذار کرنا چاہتا ہوں کہ میں اِس حلقے سے اِنتخاب لڑ رہا ہوں —— آپ جانتے ہیں کہ میں ——؟"
جانتا ہوں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اپنے سیاسی اکھاڑے کے یہ دارا سنگھ جی —— بظاہر مساوات، سالمیت، اخوت، جمہوریت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ لیکن اندر سے بے حد متعصّب، فرقہ پرست اور تنگ نظر ہیں۔ اِن کے کئی رُوپ ہیں۔ کئی چہرے ہیں لیکن سب مصنوعی، بناوٹی —— !
اب اِن کی معمول کی نشست برخاست ہوگئی ہے۔ سامعین دھیمی دھیمی سی روشنی میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اسی راستے سے باہر نکل رہے ہیں۔ جہاں میں کھڑا ہوں —— میں بھی اُن میں شامل ہوگیا ہوں
"کیوں جی آپ کا کیا خیال ہے ——" مولوی نذیرالدّین اپنے ساتھی احمد علی سے پُوچھتا ہے
"مولانا بڑے اُونچے وچار ہیں۔"
"یہی تو میں کہتا ہوں —— ایسے ہی لوگوں کی اس ملک کو ضرورت ہے —— اِندرا جی کو ان لوگوں کا ساتھ مِل جائے تو ملک زرعی، صنعتی معاشی، سماجی اور اقتصادی طور پر بہت آگے بڑھ سکتا ہے۔ ایک خاموش انقلاب بپا ہو سکتا ہے۔ غربت، جہالت کے خِلاف........
مِسز اِندرا گاندھی —— وزیرِاعظم ہند !!
میں اِن حضرات سے کہنا چاہتا ہوں کہ اندرا جی کو ایسے سیاسی اکھاڑوں

ہیں پلنے والے دارا سنگھوں، بدری پرشادوں اور مولوی بشیر الدّینوں کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں یہ سب متعصّب، فرقہ پرست اور تنگ نظر ہیں۔ یہ دیمک کی طرح ہماری تہذیبی، سماجی، معاشی اور اقتصادی ترقّی کی راہوں کو چاٹ رہے ہیں ——— لیکن میں خاموش ہوں۔ میں نے اپنے لب سی لئے ہیں۔ مولوی بشیر الدّین اور احمد علی اور کئی دوسرے لوگ اونچی سی دیوار کا سہارا لئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ میں رُک گیا ہوں اور اب پھر اُسی جگہ پر کھڑا ہوں جہاں سے میں ایکبار پھر سکریٹری جی کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایکبار پھر جلال میں آکر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے ہیں ———

"یہ مسلمان فرقہ پرست ہیں متعصّب ہیں ——— سالے پاکستانی ہیں ——— ان پر بھروسہ نہ کرو ——— اور یہ ——— یہ ——— "

یونائیٹڈ فرنٹ کے سکریٹری شری نتھو رام جی اپنے بھاشن میں مصروف ہیں ان کے چہرے پر چڑھا ہوا مصنوعی خول اُتر چکا ہے۔ اور وہ اپنی اصلی شکل و صورت میں سامعین کو اپنے بلند آدرشوں سے مستفید کر رہے ہیں ——— میں آگے سرک رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے ایک بار پھر دو قومی نظریے کو ٹھکرا دیا ہے اور یہ وہی ہیں جنہوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ قومیں صرف مذہب کی بُنیاد پر نہیں بنتی ہیں بلکہ قوموں کی بنیاد ان کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور جغرافیائی حالات پر ہوتی ہے ——— اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے عظیم نقشے میں ایک اور عظیم نام کا اِضافہ ہو رہا ہے ———

"ہمار سُنار بنگلہ دیش"

بنگلہ دیش!!

یہ مکان نمبر ۱۰۸-اے ہے۔ ویسے اِس مکان کے گیٹ پر جو بورڈ آویزاں ہے اُس پر لکھا ہوا ہے INTELLECTUALS DEN لیکن یہ لفظ بذاتِ خود اتنا ثقیل ہے کہ اس بستی میں کسی کی زبان پر چڑھتا نہیں۔ اِس بستی کا ڈرائیور بھی

اِس نام سے بے خبر نظر آتا ہے۔ یہ مکان صرف اپنے نمبر سے جانا جاتا ہے۔ یہاں کون رہتا ہے۔ کس نسل، کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، کیا کرتا ہے، کب آتا جاتا ہے۔ کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ البتہ مکان نمبر ۱۰۸۔ اے ہر ایک کی زبان پر ایسے پھسلتا ہے جیسے مکان نہ ہو ——— تھوک ہو!!

مجھے یہ مکان پسند ہے۔ اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس کی بے ترتیبی میں ایک ترتیب ہے۔ جہاں پھولوں کی کیاریاں ہونی چاہیے تھیں۔ وہاں ڈھیر سارے کنکر ہیں۔ جہاں سبز سبز گھاس کے ڈھیر ہونے چاہیے تھے۔ وہاں ریت کے ٹیلے ہیں ——— اور میں دیکھ رہا ہوں نمبر ۱۰۸۔ اے' اپنے کمرے میں ایک ایسی کرسی میں دھنسا ہوا ہے جس کی صرف تین ٹانگیں ہیں، اور چوتھی ٹانگ کے بدلے اُس نے اپنے ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیا ہے۔ اور اُس کا دوسرا ہاتھ سامنے پڑے ٹرانزسٹر پر یوں چل رہا ہے جیسے وہ گرم گرم مونگ توڑ رہا ہو ——— کبھی ایک سٹیشن اور کبھی دوسرا ———!

"یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ آج ہمارے مجاہدوں نے چھمب سیکٹر میں دُشمن کی تین چوکیوں پر ———!"

"یہ آل انڈیا ریڈیو ہے ——— آج سیالکوٹ سیکٹر میں ہماری بہادر فوجوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے ———"

"چار سیبر جیٹ جہاز گرائے گئے۔"

"مری نگر کے ہوائی اڈہ پر پاکستانی بمباروں نے تین بار بمباری کی لیکن کوئی نقصان نہ ہوا۔"

"ہمارے دلیروں نے کرگل سیکٹر میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے ——— اور پاکستان کی چار اہم چوکیاں ہمارے قبضے میں ہیں۔"

"چینا پاکستان کا ساتھ دیگا۔"

....

"ساتویں بحری بیڑا"

DOWN WITH NIXON

.. ..

.. ..

.. ..

لتا منگیشکر کی آواز میں کتنی مٹھاس ہے ـــــ آواز کی دیوی!

ـــــ سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ـــــ

ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق کی میت سرینگر پہنچ گئی ہے۔

نمبر ۱۰۸-اے نے ایک بار پھر ریڈیو کی سوئی گھما دی ہے اور اب ریڈیو خاموش ہو گیا ہے۔

"HE IS REALLY AN INTELLECTUAL — HAS NO DECISION OF HIS OWN. HE IS CONFUSED WITH DAY TO DAY NEWS!

یہ دو منزلہ مکان نہیں۔ ایسے دو کمرہ مکان کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو اس کے تین کمرے ہیں۔ دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم۔ رسوئی باہر ہی ہے۔ اس کا ڈرائنگ روم ہمیشہ ہی بند رہتا ہے۔ البتہ دونوں خواب گاہوں اور رسوئی میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں ـــــ رسوئی میں لکھن رہتا ہے۔ نوکر ہے نا وہ ـــــ ایک بیڈ روم میں پانڈے صاحب رہتے ہیں۔ اور دوسرے بیڈ روم کی زینت ہیں صبا صاحب ـــــ پانڈے صاحب، حال ہی میں جانے کہاں سے تبدیل ہو کر یہاں آئے ہیں۔ وہ انڈر سکریٹری ہیں اور صبا صاحب کہانی کار ہیں ...... یہ دونوں یہاں کرایہ دار ہیں۔ مالک مکان یہاں نہیں البتہ کرایہ لکھن وصول کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ مکان دراصل لکھن

کا ہی ہے۔ جانے یہ بات کہاں تک درست ہے۔

بابا بڑے صاحب کے کمرے میں فائلوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔ وہ ایک طرف سے فائلیں اُٹھاتے جا رہے ہیں۔ پڑھتے ہیں، سوچتے ہیں۔ اور کچھ لکھ کر دوسری طرف پھینکتے جا رہے ہیں —— یہ سلسلہ طویل ہے، آرزوں کی طرح جن کی کوئی انتہا نہیں —— آرزو کا سلسلہ لا انتہا —— فائلوں کا سلسلہ لا انتہا —— اور دوسرے کمرے میں ہیا صاحب لکھتے جا رہے ہیں، اور بڑبڑاتے جا رہے ہیں شاید کسی نئی کہانی کی تخلیق ہو رہی ہے۔

"ان کے لئے یہ دنیا ایک خوبصورت کوٹھی، ایک نئی نویلی کار، چند نوکر اور دو ایک انگریزی نسل کے کتوں تک محدود ہے۔ چست لباس پہن کر یہ سمجھتی ہیں کہ انہوں نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا ہے۔ ہوٹلوں کے چکنے فرشوں پر اجنبی بانہوں میں جھول کر یہ سوچتی ہیں کہ اُنہوں نے ایک نئے کلچر کی بُنیاد ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک اخلاق موم کی ناک ہے۔ - - - جدھر چاہا گھما لیا.... ؟

نئی کہانی

نیا عنوان !!

اور معاوضہ —— مبلغ چالیس روپے نقد نصف جن کے پُورے بیس روپے ہوتے ہیں !!!

رسوئی گھر میں لکھن نے بھگوان رام کی مورتی پر پھول چڑھائے ہیں اور وہ ابھی ابھی پرارتھنا سے فارغ ہوا ہے۔ اور آنکھیں کھولے اپنے بھگوان سے کہہ رہا ہے !

"میرے بھگوان —— میرے رام ! یہ جنگ تو نے شروع کی تو ختم بھی کرنے والا ہے۔ بس میری ایک بات سن، ایک التجا —— ایک گولہ سیٹھ دھنی رام پر پھینک دے، وہ مر جائے اور میں —— تاکہ میں اس مکان کا مالک بن جاؤں —— شادی کرنا چاہتا ہوں، بھگوان —— اب —— "

ایک اور سرچ لائٹ اِن اندھیاروں میں قوسِ قزح کے رنگ پھینک رہی ہے۔ بکھن کی پرار تھنا یکدم بند ہوگئی ہے۔ ذرا سی روشنی ہے، اور میں اِس روشنی میں آگے جا رہا ہوں۔

یہاں میجر کوہلی رہتا ہے۔ ادھیڑ عمر میجر جو وقت سے پہلے ریٹائر ہو چکا ہے۔ پچھلی جنگ میں وہ راجستھان میں لڑ رہا تھا اور اُس جنگ میں اس کی دونوں ٹانگیں کام آئیں —— اب وہ ایک وِیل چیر کے سہارے چل پھر سکتا ہے۔ اُس کی اس ویران اور اُجاڑ سی زندگی کا ساتھی ہے —— ٹیبا —— اُس کی بے حد خوب صورت کُتیا —— میجر کوہلی وِیل چیر پر بیٹھا ہوا ہے اور ٹیبا اُس کے سامنے کھڑی ہے اور دم ہلا رہی ہے۔

"ٹیبا —— ٹیبا یہ جنگ بہت بُری ہے یہ لوگوں کو گھر سے بے گھر بناتی ہے۔ اُن کے لہلہاتے ہوئے کھیت جلا دیتی ہے۔ اُن کے معلوم اور پیارے پیارے بچوں کو ہلاک کر دیتی ہے —— گلستانوں کو ریگستانوں میں بدل دیتی ہے —— میں نے —— میں نے ——" آنسوؤں کے قطرے اُس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر ٹیبا کے نرم و نازک بالوں کو چھو رہے ہیں۔ ٹیبا اب دُم نہیں ہلا رہی ہے۔ وہ میجر کے اور قریب آ گئی ہے اور اپنی دو ٹانگوں پر کھڑی ہو کر اپنی زبان اُس کے ہاتھوں پر پھیر رہی ہے، شاید اُسے دلاسہ دے رہی ہے!

میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔ وہی تنہائی ہے۔ اکیلے پن کا احساس ہے، بکھرا ہوا دھواں ہے اور سامنے تپائی پر سُرخ رنگ کے ٹھرے کی خالی خالی بوتل ہے —— میں نے بوتل کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا ہے اور مئے ناب کے آخری قطرے اپنے گلاس میں ڈال رہا ہوں —— میں مرنے سے پہلے زندگی کا آخری زہر پینا چاہتا ہوں —— لیکن بوتل بالکل خالی ہے، کوئی قطرہ نہیں کوئی بوند نہیں —— کوئی آس نہیں!!!

مخمور حسین بدخشی

نور اور سائے

سڑک ڈوبتی شام کے دھندلکے میں دُور تک خاموش اور ویران چلی گئی ہے اور سڑک کے اُس پار پہلگام میں آئے ہوئے سیاح بھی اپنے اپنے خیموں میں یوں گھُس آتے ہیں جیسے باہر طوفان کی سردی سے سکڑ کر اور بارش میں بھیگ کر بھیڑیں باڑے میں آجاتی ہیں۔ خاموش گم سم ہانپتی اور کانپتی ہوئی بھیڑیں۔

یکایک پہلگام کی خاموش فضا کو چیرتی ہوئی آواز آئی:

"رحیما ——— ارے او رحیما!"

پاس بہتے ہوئے لیدر کے کنارے پر رحیم چونک اُٹھا۔

"ارے ——— یہ تو ساجی کی آواز ہے"

وہ اُٹھ بیٹھا اور ایک لمحہ بھی سوچے بغیر سڑک پر آگیا۔ دُور تک نظریں دوڑائیں مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو سڑک کے اُس پار لیدر نالے سے بھی پرے بہت اُونچائی سے چیل اور دیودار کے درختوں سے تلاش کرکے لے آیا تھا۔ اِس تلاش میں اُس کا جوتا بھی پھٹ گیا تھا۔ جو اُس نے اُونچائی سے نالے میں پھینک دیا تھا۔ پھر تو اُس کے تلووں میں کانٹے چُبھے۔ اُن میں خراشیں پڑ گئیں، اور خراشوں سے خُون بہنے لگا۔ مگر وہ بھیڑیں باڑ میں چھوڑ آیا تھا ——— اور پھر ندی پر دن بھر کی تھکن دُور کرنے آگیا تھا۔ یہ تو اس کا روز کا

معمول تھا۔ شام کو ندی پر آکر مُنہ ہاتھ دھوتا۔ بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر ندی سے اُٹھتی ہوئی تیز لہروں کو دیکھتا اور پھر ساجی بھی آجاتی۔ وہ ندی کے چاندی ایسے پانی میں مستی سے پاؤں ڈالتی اور پانی چھلکاتی رہتی۔ اُسے خوب چھیڑتی کبھی کبھی اُس کے لئے اخروٹ اور موتیوں کے سے شفاف دانوں والے مکی کے بھٹے لے آتی۔ جنہیں وہ مزے سے ایک دوسرے سے چھین کر کھاتے۔ اور پھر وہ مکئی کے بھٹے کھاتے کھاتے پانی چھلکاتے چھلکاتے ایک دوسرے کے کانوں میں پیار کا امرت رس ڈال لیتے اور رحیم ساجی کو گیت سُنانے لگ جاتا ——

سئے گو و چون محبت زیادہ موکرو عدہ خلافی

گو لاب رویہ تدشمنا دِ مو کرہ عدہ خلافی

ساجی خاموش اُس کے بغل میں بیٹھی اپنی اپنی کالی پیار بھری نگاہوں سے اُسے تکتی رہتی۔ دونوں پر ایک خواب آلود سا نشہ چھا جاتا اور گیت پہلگام کی مسحور کُن خاموشی اور ندی کی گہرائی میں گونجتا رہتا۔

رحیما —— رحیما —— رحیم کُتّا!

اب کی بار اُسے آواز صاف سُنائی دی اور ڈھلان سے ساجی ہی کی آواز آرہی تھی۔ رحیم کُتّا۔ اُسے ہنسی آئی۔ کتنی شریر ہے ساجی بھی۔ مجھے کُتّا کہتی ہے۔ جیسے میں سچ مچ ہی کوئی بھیڑ ہوں۔ اُس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ رحیم کُتّا وہ پھر ہنس پڑا۔ جب ساجی کو غصہ آتا ہے تو مجھے کُتّا کہتی ہے۔ اور جب پیار آتا ہے تو بھی کُتّا ہی کہتی ہے۔ ہی ہی ہی — ہی!

سوچتے سوچتے وہ ڈھلان کی طرف بڑھا۔ لمبے کُرتے کا اوپر والا بٹن بھی بند کر دیا۔ مگر پھر بھی برفیلی چوٹیوں سے آتی ہوئی برفیلی ہواؤں میں اُس کا جسم سکڑتا ہی رہا۔ چلتے چلتے اُس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اُن میں پھونک بھر کر گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پھر ڈھیلے چھوڑ کر اُنہیں ایک دوسرے سے خوب رگڑا۔ تب کہیں جا کر جسم میں ایک عجیب تھرتھری کے بعد گرمی سی پیدا

ہونے لگی۔ ڈھلان پر پہنچکر وہ ساجی کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن وہ تو کہیں نظر ہی نہ آرہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پریشانی کے آثار نمودار تھے۔

کہیں ساجی گر کر مر تو نہیں گئی۔ پھر کہاں چلی گئی۔ ابھی ابھی تو ڈھلان سے ہی پکار رہی تھی مجھے شاید وہ ڈھلان سے دُور نکل گئی ہو۔ اور تاریکی میں کسی جانور نے اُس پر حملہ کیا ہو —— اور وحشت سے وہ کانپنے لگا۔ برفانی ہواؤں کے جھکڑ زور زور سے چلنے لگے۔ تو وہ ایک بار زور سے تھرا اُٹھا۔ پھر جلدی سے دونوں ہاتھوں کو منہ کے پاس لے جا کر چلایا۔ ساجی ..... ساجی ..... ساجی۔ لیکن اس کی آواز رات کے اندھیرے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی غائب ہوگئی اور جواب میں ساجی کی آواز کہیں سے نہ آئی۔ صرف آس پاس کے درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اُس نے کسی کی سسکیوں کی آواز سنی۔ آواز کہیں پاس ہی سے آرہی تھی اُس نے کھڑے کھڑے ہی ڈھلان کے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ لیکن اب بھی کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ صرف کسی کی سسکیاں ہی گونج رہی تھیں۔ وہ گھراٹ کے پیچھے گیا، لکڑی کے بڑے بڑے تختوں کے اُوپر نیچے اچھی طرح سے دیکھا اور پھر اندھیرے میں ایک بڑے سے کالے پتھر کے پاس گزرا تو وہاں ساجی گھٹنوں پر سر ٹیکے سسک رہی تھی۔

وہ اُس کے گھٹنوں کو ہلاتے ہوئے بولا

"ساجی —"

لیکن ساجی جواب میں اور بھی زیادہ رودی۔ پھر اس نے اس کا سر گھٹنوں سے اُٹھاتے ہوئے کہا

"ساجی تو بولتی کیوں نہیں —— کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

اب کی بار ساجی نے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھے اور روندے ہوئے گلے سے بولی۔

"بکری کھو گئی ہے"
کہتے کہتے پھر اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور رحیم کے دِل پر آرے سے چلنے لگ گئے
اُس نے اُس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔
"ارے تو کیوں رو رہی ہے؟ میں ابھی دم کے دم میں تیری بکری ڈھونڈ لاتا ہوں تو رو مت۔"
اور پھر دم کے دم میں ہی ساجی کے چہرے پر مُسکراہٹ کی اُفق کھِل اُٹھی اور رحیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی ــــــ
"اچھا ــــــ لیکن وہ کالی بکری ہے، وہی گھنے گھنے بالوں والی"
"لیکن یہ تو سفید بکری لئے شام کو کہاں چلی جا رہی تھی"۔
میں تو تمہارے ہی پاس آ رہی تھی۔ سوچا شام کو لیدر کے کنارے بیٹھ کر ہی کچھ باتیں کریں۔ یہ وہ سفید بکری آ آ آ کرتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں نے سوچا چلو واپسی پر اُسے بھی اپنے ساتھ لے آؤں گی۔ مگر یہ اُچھلتی کودتی اور پھدکتی ہوئی ڈھلان پر جا پہنچی۔ میں دوڑتے دوڑتے ڈھلان پر آئی لیکن یہاں کہیں نظر ہی نہ آئی۔
رحیم کی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے کے تحت چمک اُٹھیں۔ اس نے پہلے ساجی کے پھرن کے دامن سے ایک مینگنی ہٹائی اور پھر دودھ ایسے بازو میں ایک چٹکی بھر کر کہا۔
"ساجی ــــ! تو میرے ہی لئے یہاں آئی تھی نا؟"
ساجی شرما کر بولی
"ہاں اور پھر کیا کسی ــــــ"
"اچھا تو یہیں ٹھہرنا۔ ڈرنا نہیں"
یہ کہتے کہتے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیز تیز قدموں سے ڈھلان سے دُور

بکری للانے چلا گیا۔

آج ساجی اتنی پریشان نہ ہوتی اور نہ ہی اتنا روتی۔ اگر پہلا موقعہ ہوتا بکری کھو جانے کا —— ابھی دو ہی مہینے پہلے ایک بڑی سی بکری سے اُس کے گھر والے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور وہ بھی ساجی کی ہی بدولت۔

اس روز عجیب سی بات ہوئی تھی۔ وہ بکری چرانے ڈھلان پر جا رہی تھی۔ جب وہ لیدر کے کنارے لگے ہوئے سیاحوں کے خیموں کے پاس سے گزری تو پل پر اُسے ایک پردیسی جوڑا نظر آیا —— کالا مرد اور کالی عورت —— اس نے تو زندگی میں پہلی بار اتنے سیاہ فام آدمیوں کو دیکھا تھا۔ وہ ٹھٹیں ٹھٹیں ہنسنے لگی —— واہ کیا جوڑی ہے —— اس نے سوچا اور پھر بکری ترش ترش چھی چھی کہتی وہاں سے چل دی۔

'اے'—— چلتے چلتے اُس کے قدم رُک گئے۔ مڑ کے دیکھا تو اُسی عورت کے ساتھ والا مرد اُسے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے پاس آنے کو کہہ رہا تھا ——
خدایا —— تو ہی مالک ہے۔ کہیں انہیں میرا ہنسنا بُرا تو نہ لگا —— وہ ہانپنے لگی۔
اے —— آدمی زور سے چلایا۔

وہ ہانپتی کانپتی بکری کو ساتھ لئے اُن کے پاس آئی۔ جب وہ دونوں ہنس ہنس کر اُس کے ساتھ کچھ عجیب سی زبان میں بات کرنے لگے تو اُس کا ڈر جاتا رہا —— سینے میں پیدا ہوئی ہلچل تھم گئی۔ لیکن وہ انھیں کوئی جواب دئے بغیر ہی بُت بنی اُن کے چہروں کو تکنے لگی۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھ رہی تھی۔ جب اسکرٹ پہنی ہوئی عورت نے زبان نکال کر اشارے سے اُس سے یہ جاننا چاہا کہ وہ گونگی تو نہیں تو وہ اس کا اشارہ سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے کشمیری میں بولی:

میں گونگی نہیں —— پر تمہاری بولی نہیں سمجھتی۔

اِس پر وہ دونوں بھی اُس کی بات نہ سمجھ کر ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگے اور وہ بکری کو لئے ایک طرف کو چل دی لیکن وہ آدمی تو اُس کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مُسکرا رہا تھا۔ لیکن وہ اب دور چلی گئی تھی۔ ڈھلان سے اُوپر گھنے گھنے چیل اور دیودار کے درختوں کے بیچ —— جہاں چہچہاتے پرندوں کے ترانے اور بل کھاتے ہوئے جھرنے گاتے تھے۔ جہاں جھاڑیاں اور جھاڑیوں میں لگے ہوئے سُرخ سُرخ جنگلی پھول تھے۔ بکری ایک طرف جاکر سبز سبز گھاس چرنے لگی، اور وہ جھرنے کے کنارے بیٹھ کے رسول میر کے اُس گیت کے بول دہرانے لگی جو کہ رحیم اکثر ندی کے کنارے بیٹھ کر اُس کے سامنے گایا کرتا تھا۔ اُس کی نظریں بار بار اِدھر اُدھر پھیل رہی تھیں۔ بکری بدستور گھاس چر رہی تھی۔ پرندے سرسبز جھاڑیوں میں بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ جھرنا چھوٹے چھوٹے گول گول نیلگوں پتھروں سے ٹکراتا ہوا بہہ رہا تھا اور وہ دھیرے دھیرے گا رہی تھی ؎

مئے گو وچون محبت زیادہ مو کرو عدہ خلافی
گو لاب رو بہ قدِ شمشادِ مو کرو عدہ خلافی

جب بہت دیر تک وہ ایک ہی گیت کو تین چار بار گا چکی دن ڈھلنے کو آیا۔ برفیلی چوٹیوں کے اُوپر سے آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ درختوں کی شاخیں کھڑکھڑاتیں —— پتے سرسرائے تو اُس نے دھیرے سے جھرنے کے سرد سرد پانی میں اپنے کومل کومل سے ہاتھ ڈال دئے۔ بکری کے دودھ ایسے شفاف ہاتھ دھوتے دھوتے چوڑیاں کھنکتی رہیں اور پتلے پتلے ہونٹ ہولے ہولے سریلی رسیلی لے میں گنگناتے رہے۔

مئے گو وچون محبت زیادہ مو کر.....

"اے"

بھاری سی آواز آئی اور اس کے ہونٹوں پر گیت نے دم توڑ دیا۔ سامنے اکیلا وہی آدمی جو اسے خیموں کے پاس ملا تھا، مُسکرا رہا تھا۔ اُس کا دِل ایک بار کانپ اُٹھا اور آگے آدمی اور آگے کھسک آیا۔ اب اُس

کے ڈر نے شدّت پکڑ لی اور کشمیری ہی میں بولی:

کیا چاہئے تمہیں ——؟

آدمی کچھ نہ سمجھتے ہوئے صرف مُسکرا کر اور اس کے قریب آیا۔ ساجی کی آنکھوں میں شعلے سے کوندنے لگے۔ آدمی نے اُس کے پھرن کے دامن کو اپنی گرفت میں لیا اور ساجی نے آخ تھو تھو اس کے منہ پر خوب تھوکا اور زور کے ایک جھٹکے کے ساتھ پھرن چھڑا کر بکری کے ساتھ چلنے لگی۔ اُس نے ایکبار پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ آدمی بھی تیز تیز قدموں سے اُس کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بکری کی پیٹھ تھپتھپا کر اور تیز چلنے لگی لیکن وہ جلدی اُس کے راستے میں آ کر اُس کے سامنے ہی چھوٹی سی پگڈنڈی پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بکری کی گردن موڑتی ہوئی بائیں جانب کو چلنے لگی تو وہ بھی لپک کر وہیں آ کھڑا ہوا۔ وہ عجیب حیرت میں پڑ گئی جدھر اور جس طرف کو چلنے لگتی وہ اُس کے راستے میں کھڑا ہو جاتا۔ جیسے آدمی بھاگتی ہوئی مرغی کو پکڑنا چاہتا ہو۔ وہ پروں کو جیسے پھڑپھڑاتی ہوئی دوڑی تو وہ بھی دوڑ پڑا اور اس دوڑ میں بکری پیچھے رہ گئی۔ اگر اُس کے پاس بکری نہ ہوتی تو وہ کب کا اُس سے پیچھا چھڑا کر دوڑتی دوڑتی گھر پہنچ گئی ہوتی لیکن بکری —— وہ تو آج ایک مصیبت بن گئی تھی۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ وہ بکری کو وہیں چھوڑ دے لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے سوچا۔ رات کی تاریکی میں بے زبان بکری کو جنگل کے وحشی جانور کھا جائیں اور وہ پیاری بکری کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ یہ بکری تو اُس نے تین سال سے پال پوس کر اتنی بڑی کر دی تھی۔ وہ اس کو ندی پر لے جا کے نہلاتی۔ اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی۔ اُس کی نیلم ایسی آنکھوں میں سرمہ لگاتی اور پھر کبھی خود ننگے کان رہ کر اُس کے بڑے بڑے کانوں میں برف ایسی سفید سفید چاندی کی بالیاں بھی ڈال دیتی تھی۔ جب وہ اپنے کندھے پر گھاس کا بڑا سا گٹھڑ لا کر بکری سے پُوچھتی:

"گھاس کھائے گی دُلہن ——"

تو وہ اپنی گردن کی لرزش سے کیسے ہاں کہہ دیتی۔ اُس لرزش میں اُس کی سفید سفید بالیاں جھولنے لگتیں۔ اور ساجی خوش خوش اُس کا مُنہ چُوم چُوم کے اس کے سامنے گھاس کُھڑ کھول دیتی ——— اور آج اِس بکری کو کیسے یہاں اکیلی چھوڑ سکتی تھی۔ اُس نے دِل بڑا کیا اور بکری کی گردن پر کے بال پکڑ کر آدمی سے بولی۔ چھوڑ دے مجھے۔ ورنہ میں تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔

آدمی اِس بار بھی اُس کی بات نہ سمجھ سکا۔ صرف اتنا جان سکا کہ بھولی بھالی لڑکی شیرنی کی طرح بپھرنے لگی ہے اور اس کے اِس بپھرنے میں اس کے گال سُرخ ہو گئے ہیں۔ اور کالی کالی آنکھوں میں جیسے خُون اُتر آیا ہے۔ اُس نے ایک قدم آگے بڑھا کر ساجی کو پکڑنا چاہا لیکن وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ آئی۔ اُس کا دِل ڈوبنے لگا اور پھر معصوم ہرنی کی طرح بکری کو وہیں چھوڑ کر مٹی کے ڈھیروں درختوں کی جڑوں اور پتھروں سے پھسلتی پھسلتی ٹکراتی ٹکراتی نیچے کی جانب دوڑتی چلی گئی ——— ہانپتی ہانپتی ہوئی ندی جہاں رحیم ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر میلی سی دھجی دھو رہا تھا۔ اُس نے ساجی کا ہانپنا اور گرد آلود چہرہ دیکھا تو گھبراتے ہوئے پُوچھا۔

یہ ——— یہ تُم ہانپ کیوں رہی ہو ساجی

ساجی نے دم سنبھالتے ہوئے ڈھلان سے اُوپر چیڑ اور دیودار کے درختوں کی طرف اِشارا کیا۔

"بکری ——— میری بکری وہاں رہ گئی۔"

رحیم نے مُسکرا کر ساجی کے سُرخ و سفید چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ———

"نُور اور سائے"

وہ نظریں نیچے کئے ہوئے بولی

"ہاں ———"

اور رحیم ڈھلان سے اُوپر چیڑ اور دیودار کے درختوں کے نیچے بکری

کو لانے کے لئے چلا گیا۔
لیکن جب بہت دیر بعد ندی پر آ کر ساجی سے بولا
"بکری تو وہاں ہاتھ نہ آئی"
تو ساجی زعفران کی پتی کی طرح زرد پڑ گئی
"ہاتھ کیوں نہ آئی —— تم نے تلاش ہی نہ کی ہو گی۔ ابھی تو یہیں تھی اور ابھی کہاں کھو گئی —— ؟"
"تمہاری قسم ساجی —— سب درخت چھان مارے۔ جھرنے کے نیچے تک دیکھ آیا لیکن کہیں بھی نہ ملی"
پھر ایک دن سہ پہر کو جب رحیم ریوڑ کو چرانے ڈھلان کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں ایک جانا پہچانا مرکبان ملا۔ رحیم نے جب اُس کے کندھے پر بکری کی کھال لٹکتے دیکھی تو اُسے ساجی کی سفید بکری یاد آئی، اور پھر یہ کھال بھی تو سفید ہی تھی۔ اُس نے مرکبان کو روکا۔ کھال پر اچھی طرح نگاہیں جمائیں تو اُس کے جگر سے خون رسنے لگا۔ جیسے سوئی کی سی باریک اور چبھتی اس کے جگر میں گھس آئی تھی۔
اُس سفید بکری کی کھال —— اُس نے سوچا۔ سبز روشنائی تو اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں تن گئیں۔ آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ پھر ڈنگی کا بھرپور وار اس مرکبان پر کرتے ہوئے گرج کر بولا۔
"حرام زادے۔ یہ تو نے ہماری بکری چرائی ہے"
اور دوسرے لمحے اُسے زمین پر سلا دیا
لیکن مرکبان اُٹھ بیٹھا اور رحیم کی طرف رحم آلود نظروں سے دیکھ کر بولا
"خدا رسولؐ کی قسم رحیم بھائی۔ تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں نے تمہاری بکری دیکھی تک نہیں۔"
کہتے کہتے وہ رو دیا اور رحیم زور سے گرجا

"جھوٹ ـــــ پھر تیرے پاس یہ کھال کہاں سے آئی ـــــ ؟ یہ تو ساجی کی بکری کی کھال ہے۔ دیکھے گی تو تمہارا خون پی لے گی۔ حرام خور!"

مرکبان پھر گڑگڑاتے ہوئے بولا

"دستگیر کی قسم رحیم۔ نبیؐ کی قسم جو میں نے وہ بکری دیکھی ہے۔ یہ کھال تو مجھے وہ پردیسی صاحب انعام میں دے گیا۔ جس کا سامان میں نے اپنے گھوڑے پر کولہلے اور لیدروٹ تک لیا۔ وہی وہ کالا کالا صاحب"

"وہ جس کے ساتھ وہ کالی میم صاحب تھی۔ وہ ننگی ننگی ٹانگوں والی۔"

مرکبان کی جان میں جان سی آگئی۔ وہ دم سنبھالتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ وہی ـــــ وہ تو یہاں اُس میم صاحب کو بھگا کر لایا تھا اور اب عیش اُڑا کر واپس چلا گیا ہے ـــــ"

رحیم حیرت سے اُس کی طرف دیکھ کر بولا

"واپس چلا گیا ـــــ"

"بچ گیا حرام خور ـــــ ذلیل ـــــ کمینہ ـــــ"

کہتے کہتے اُس نے دیگچی اُٹھائی۔ بڑبڑاتے لبوں سے بھیڑ بکریوں کو ترش ترش چھی چھی کہتے جانے ہی لگا تھا کہ آدمی نے روک کر کھال اُس کے کندے پر ڈال کے کہا ـــــ

"رحیم بھائی یہ کھال لیتے جاؤ۔ ساجی کو دے دینا۔ اُس کی بکری تھی ـــــ بے چاری کتنی پالتی تھی اُسے۔ اب بکری کی بجائے اِس کھال کو دیکھ کر روئے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر لٹکا کر وہاں سے چلدیا۔ اور شام کا جھٹپٹا چھاتے ہی جب رحیم ریوڑ چرا کے آیا اور ساجی کے سامنے اُس کی سفید بکری کی دودھ ایسی کھال رکھ دی تو وہ کھال کو پہچان کر اُسے سینے سے چمٹا کے مرزنی صورت بنا کے بولی۔

"یہ کہاں ملی میری بکری کی کھال۔ کس کا پیٹ پھٹ گیا۔ کس کا مُنہ کٹ گیا۔

اس کی بوٹیاں کھاتے"

"کالے صاحب کا"

"کالے صاحب کا"

"ہاں ـــ ہاں وہ کالے چہرے والا پردیسی۔ یہاں کوئی لڑکی بھگا کر لایا تھا۔ اُسی نے تمہاری بکری کھائی ہے۔ لیکن اب واپس چلا گیا ہے۔"

"ورنہ مزا چکھا دیتی ـــ پہلگام سے تو بس اُس کی لاش جاتی۔"

اور پھر ساجی کی روتی آنکھوں کی طرف دیکھ کر بولا

"اب تو رو مت ـــ جو ہونا تھا ہو چکا۔ تیرے رونے سے تو بکری واپس نہ آئے گی۔ تجھے میری قسم نہ رو ساجی۔ اور ساجی نے پھرن کے آستین سے آنسو پونچھ ڈالے۔ لیکن اُسے بار بار وہ آدمی یاد آرہا تھا جس نے اس کا تعاقب کیا تھا اور اُس کی سفید بکری کھائی تھی ـــ اُس کے دل کے زخم تو آج ہرے ہو گئے تھے۔ بکری ـــ چور ...... تھو تھو تھو ـــ اور پھر رحیم کی طرف دیکھ کر ایک سرد آہ کھینچی ـــ

اور آج پھر اُسے ڈھلان پر بیٹھے بیٹھے کالی رات میں وہ کالا آدمی یاد آیا ـــ لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔ اِس لئے کہ چند لمحوں کے بعد ہی پھر سے اُس کی نگاہیں رحیم کا انتظار کرنے لگ جاتیں۔ رحیم جو آج بھی اُس کے لئے بکری تلاش کرنے دیودار اور چیڑ کے درختوں کی طرف چلا گیا تھا۔ جب بہت دیر تک انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی تو بارش کے ننھے ننھے قطرے گرنے لگ گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد چاروں طرف زور دار بارش ہوئی۔ وہ بھیگتی رہی کپکپاتی رہی۔ ٹھٹھرتی رہی ـــ بار بار نگاہیں گھومنے لگ جاتیں۔ دِل دھک دھک کرنے لگتا۔ ماحول پر ویرانی سی چھا جاتی تو اُسے یہ انتظار کی گھڑیاں بڑی ڈراونی اور زہریلی محسوس ہوتیں۔ جب وہ کپڑوں سے بارش کا پانی جھٹکتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تو کالی رات میں کالی بکری لئے رحیم آتا دکھائی دیا ـــ جھپکتے ہی اُس کی آنکھوں میں خوشیاں ناچ گئیں۔ اور وہ دوڑتی

دوڑتی رحیم کے پاس پہنچ کر پہلے بکری کو گلے لگایا۔ اور پھر شوخی سے رحیم کے بازو پر اپنا سر رکھ کر بولی

"کہاں ملی میری بکری ـــــ ؟"

رحیم نے اُس کے بھیگتے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا

"وہاں جہاں تمہارا باپ بھی جاتا تو بکری نہ لے آتا۔ جنگل میں ایک چیڑ کے درخت پر چڑھ بیٹھی تھی۔ یہ میں نے تو ڈھونڈ ہی نکالی۔ تمہاری خاطر ـــــ ورنہ کون جان خطرے میں ڈال کے جاتا ـــــ ساجی نے اُس کے بازو پر سے اپنا سر ہٹا لیا اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بولی

"اچھا ـــــ چلو اب گھر چلیں، ـــــ تم بھی تو کافی بھیگ چکے ہو۔"

دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے بکری کو ساتھ لے کر اُسے ترش ترش چھچھی کہتے پگڈنڈی جانے لگے۔ چلتے چلتے اُسے ساجی کا بارش سے بھیگتا اور چمکتا ہوا چہرہ بہت بھلا لگ رہا تھا اور اُس کے بالوں سے اُٹھتی ہوئی خوشبوئیں سونگھتا وہ گھر پہنچا۔ بکری باڑے میں بند کر دی اور ساجی کے ساتھ کمرے میں آیا۔ اُس کی ماں نے ساجی سے ذرا تیز لہجے میں پوچھا

"کہاں گئی تھی اتنی رات گئے تک ـــــ ؟"

ساجی کی پلکیں تھرتھرا کر جھک آئیں اور رحیم اُس کی طرف ایک نظر پھیکر ماں سے بولا۔

"ماں یہ تو میرے ہی ساتھ تھی۔"

بوڑھی ماں کے چہرے کی جھریاں مسکرا دیں۔ مینگنیوں کا ٹوکرا چولھے کے پاس رکھ بولی:

"ہے مشٹنڈے بیوی کی طرف داری کرتے شرم نہیں آتی۔"

ہرندے کول بھارتی

سراب

پت جھڑ کے دِن تھے۔ سُورج کی کمزور ترچھی کرنیں اپنا دامن سمیٹ رہی تھیں اور سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سرد ہوا کا جھونکا آکر زرد و خشک پتوں کو کپکپا دیتا۔ وہ دبی سی سسکیوں کے ساتھ شاخوں سے الگ ہو کر زمین پر آگرتے۔ سفید برفاب سا کبوتروں کا جوڑا دیر تک بلندیوں پر پرواز کرتا رہا دونوں پرندے ایک دوسرے کا طواف کر رہے تھے .... معصوم آج بھی اُسی کھڑکی پر کھڑا کبوتروں کے جوڑے کو انہماک سے تک رہا تھا۔ جس کے سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک لمبی اُونچی بختہ دیوار تھی۔ کسی قلعے کی فصیل کی طرح سخت اور مضبوط — جس میں کوئی سراخ نہیں تھا، دراڑ نہیں تھی۔ کتنی بار معصوم کی نظروں نے اُس کو چھید کر دیوار کے اُس پار کی دنیا میں جھانکنا چاہا تھا لیکن ہر بار اُس کی نظریں دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی زخمی سی ناکام لوٹی تھیں۔ اُس پار کی دُنیا کتنی حسین ہوگی۔ ناکامی کے اس احساس کو کم کرنے کے لئے وہ غیر شعوری طور سے سوچنے لگتا۔ تصویریں کچھ خاکے سے اُبھرنے لگتے اور وہ ان خاکوں میں طرح طرح کے رنگ بھرتا، تصویر مکمل ہو جاتی۔ معصوم کا سارا وجود پگھل کر احساسات کا ایک مجسمہ بن جاتا اور دیوار کو پھلانگ کر دھیرے دھیرے اُس وادی میں اُترتا جہاں اُجلے دِن تھے اور سہانی راتیں۔ پھول تھے، کلیاں تھیں شہد کے چھتے تھے اور بادام کے شگوفے تھے۔ جہاں ہر شام نیلے سرمئی آسمان پر ایک قوسِ قزح اُبھرتی ہے اور

ہر صبح بادۂ گُل رنگ کی طرح دمکتی ہے اور ساری فضا پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے جہاں کسی ماتھے پر سلوٹ نہیں۔ کسی دِل پر داغ نہیں اور کوئی جسم ننگا نہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے ایک دھند سی چھا جاتی۔ دھواں سا اُٹھتا اور پھر معلق ہو کر ایک سخت دیوار کی صورت اختیار کرتا۔ کبوتروں کا جوڑا اب کافی اُوپر پرواز کر رہا تھا۔ نیلے آکاش کی یہ لاتناہی وسعتیں اور سیماب کی طرح تھرکتا ہوا یہ پرندوں کا جوڑا ——— معصوم کچھ دیر کے لئے دیوار کی سختی اور اُس پار کی دُنیا کو بھول سا گیا۔

جب سے معصوم یہاں قیام کرنے آیا تھا اور جب سے اُسے اُس دیوار کی سختی اور اُس پار کی کسی حسین وادی کا احساس ہو گیا تھا تب سے اُس کی زندگی میں ایک عجیب سا اُبالی پن اور عجیب سی بے ترتیبی آ گئی تھی۔ کمرہ دیکھو تو عجیب ویرانی سی ٹپک رہی ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر جوتے پالش کرنے کا بُرش ہے اور دانتوں کا برش ایک کونے میں پالش کی ڈبیا کے ساتھ چپٹ پڑا ہے۔ لکھنے کی میز پر کوئی تصویر روندی پڑی ہوئی ہے۔ کتابیں، کاغذات، فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں۔

پروین اب اُس کی اُس بے دلی سے کافی تنگ آ چکی تھی۔ کبھی کبھی اسے معصوم پر اتنا غصہ آتا کہ وہ لڑ جھگڑنے کے لئے تیار ہو جاتی لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کی یہ کیفیت ہمدردی سے بدل جاتی۔ جب وہ معصوم کے چہرے کے اُلجھے ہوئے نقوش دیکھتی جن سے اِنتہائی کرب اور بے بسی جھلکتی ہوتی اور بغیر کچھ کہے ہی معصوم کے کمرے کو پھر آراستہ کرتی۔ کپڑوں کو قرینے سے رکھتی۔ کتابیں شلف میں سجاتی۔ لیکن کمرے کی یہ حالت تب ہی تک رہتی جب تک معصوم کے قدم کمرے سے باہر رہتے۔ اُس کی ذہنی کیفیت بھی تھی عجیب۔ دیوار کے اُس پار کی دُنیا کے بارے میں سوچتے ہی اُس کی طبیعت میں ایک نامعلوم سا والہانہ پن بیدار ہو جاتا اور وہ اردگرد کی تمام چیزوں سے بے نیازی برتنے لگتا یہاں تک کہ پروین سے بھی۔

دفعتاً کبوتروں نے پرواز کرنا بند کی۔ اُن کے پروں کی برقی حرکت بند ہو گئی

اور وہ ایک خاص رفتار سے نیچے آنے لگے۔ نیچے اور نیچے اور ساتھ ہی معصوم کی نگاہیں بھی جھکتی ہی گئیں۔ ایک رفتار سے بیتر دیوار کے اُس پار جا چھپے معصوم کو ایک دھچکا سا لگا اور نظریں دیوار سے ٹکرا کر پلٹ آئیں۔ جیسے کوئی اندھا اپنے اندھے پن کو بھول کر دوڑتا چلا جائے اور اچانک ہی ایک آہنی دیوار سے ٹکرا جائے اور اُسے اپنے بے نُور وجود کا شدید احساس ہو جائے۔ اُس کے ہونٹ خود بخود بھینچ گئے اور وہ بے قراری کی سی حالت میں ناخنوں سے کھڑکی کی چوکھٹ کُھرچتا رہا۔ قسم کھا کر کہتی ہوں، کل ہی ترکھان کو بُلوا کر یہ کھڑکی بند نہ کروا دی تو کنیز کو پروین نہ سمجھنا۔" پروین نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ایک ادا سے کہا معصوم کھڑکی سے ہٹ کر عجیب انداز سے مسکرایا۔

پروین تم سمجھتی ہو کہ حقیقت پر پردہ ڈالنے سے اُس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے آنکھیں موند کر روشنی کی حقیقت کو جھٹلایا تو نہیں جا سکتا۔ پروین۔"

"اور آپ کی ہم سے بے نیازی!" پروین کہنے لگی۔ کیا سمجھوں اسے —؟ یہ کہ ہماری کوئی حقیقت نہیں — ؟ ہماری دُنیا دنیا نہیں۔ سراب ہے جہاں سورج نہیں چمکتا۔ چاند نہیں کھلتا — نہیں پروین ایسی بات تو نہیں — معصوم عاجزی سے کہنے لگا۔ لیکن ہماری دُنیا اتنی محدود، اتنی تنگ ہے کہ انسان آسانی سے چھاتی پھیلا کر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اس محدود سی دنیا میں چیزوں کی اتنی بھرمار ہے کہ ان میں اُلجھاؤ سا پیدا ہو گیا ہے اور ایک بے ترتیبی سی آ گئی ہے۔ کوئی قرینہ نہیں۔ کہیں کوئی ترتیب نہیں اور تبھی ......"

اور تبھی آپ اس سب سے ڈر کر سراب کے پیچھے بھاگے ہیں کوشاں ہیں اور تبھی آپ حقائق سے خوف زدہ ہو کر سپنوں کی کسی ان جان دنیا میں بسیرا کھوجتے پھرتے ہیں — کیوں؟ معصوم کے ہونٹوں کے کونے اس انداز سے پھیل گئے جیسے پروین نے کوئی نہایت ہی ہلکی بات کہی ہو۔

پروین — وہ ایک عجیب انداز سے کہنے لگا۔ تمہاری یہ باتیں عام انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اِنسان اپنے آپکو دھوکہ دینے کے لئے عموماً

ایسے ہی جملے تراش کرتا ہے کیونکہ فطرتاً وہ شکست کھانے کے لئے تیار نہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جو آج ترتیب پا سکی ہو، جسے گھٹن کا احساس نہ ہو۔ اِسی احساس کی شدّت نے میرے شعور کو ٹوکا ہے۔ لیکن تم سمجھتی ہو کہ میں ہنگاموں سے ڈر کر کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہوں — وہ کچھ دیر رُکا تب دوبارہ کہنے لگا — لیکن پروین جس دن یہ دیوار وقت کی گرفت سے آزاد ہو کر ڈھ جائے گی اُس دن تمہارا سارا بھرم ٹوٹ جائیگا۔" کہتے کہتے وہ رُک گیا —

پروین غیر متأثر سی چھیڑتے ہوئے کہنے لگی۔ آپ رُک کیوں گئے کہئے نا — آپ کی یہ باتیں بڑی پُر لطف ہیں۔ جو صرف آپ کے احساسِ طبیعت کی پیداوار ہیں جن سے صرف شدّتِ احساس جھلکتا ہے۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ فطرتاً حساس آدمی واقع ہوئے ہیں۔ چیزوں کی اس بے ترتیبی کو جس شدّت سے محسوس کرتے ہیں اُس رفتار سے آپ انہیں ترتیب نہیں دے سکتے۔ حالات جس تیزی سے کروٹ بدلتے ہیں۔ اُس تیزی سے آپ اُن کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس سے آپ کے ذہن میں ایک اُلجھن سی پیدا ہوتی ہے اور نتیجہ کے طور پر آپ اِس سب سے بھاگ کر سپنوں کے کسی تنہا گوشے میں پناہ لیتے ہیں۔"

پروین کی اِن باتوں سے معصوم کو اپنے ذہن پر ایک عجیب سا بوجھ محسوس ہوا۔ بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔ پروین تمہاری اِن باتوں میں کسی فلسفے کی موٹی کتاب کا سا وزن اور اُلجھاؤ تو ہے لیکن ایسی کوئی چیز نہیں جو دل کو چھو جائے، جس سے دھڑکنیں تیز ہوں .... اے ہے! پروین کو اُس کی اس بے بسی پر پیار سا آ گیا۔ اور اُس نے اُس کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے بات کا رُخ بدل دیا — آپ تو ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جو عورت ہونے کے ناطے میری میراث سمجھی جاتی ہیں۔ معصوم مُسکرایا۔ اور دونوں

کمرے کے باہر چلے گئے

اس رات معصوم بستر پر دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اُسے اپنا سر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ پروین کی باتوں نے اُس کے دل پر جیسے ایک یخ بستہ وزنی پتھر رکھ دیا تھا اور سب کچھ منجمد ہو گیا تھا۔ ایک حسین تصویر کی نقاب کشائی سے پہلے ہی جیسے پروین نے اُس پر خراشیں ڈال دی تھیں۔ معصوم دیر تک یخ بستہ تصورات میں حرارت لانے کی سعی کرتا رہا، اور اس کوشش میں اُس کی کلپنا نے کئی بار کھڑکی کے سامنے کھڑی دیوار کو پھلانگا۔ یہاں تک وہ تھک گیا اور اُس کے انگ انگ سے ٹیس سی اُٹھنے لگی۔ ماتھے پر کچھ سلوٹیں اُبھریں اور پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ باہر بیت جھڑ کی خشک ہواؤں نے خاصا زور پکڑا تھا اور کالے کالے بادل چاندنی کے زینوں کو آہستہ آہستہ توڑ کر زمین سے الگ کر رہے تھے یہاں تک کہ آخری زینہ بھی ٹوٹ گیا۔ اور چاند بادلوں میں کہیں چھپ گیا۔ تب گرج کے ساتھ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ آسمان پر بادلوں کی ایک اور موٹی تہہ بچھ گئی اور بارش طوفان کا زور پکڑ گئی۔ کوندا لپکا اور بجلی سی کھٹ سے کہیں گری۔ معصوم کے ماتھے پر بے ترتیب، سلوٹیں اُبھریں اور غائب ہو گئیں۔ صبح جب وہ جاگا تو پروین اُس کے سرہانے کھڑی عجیب انداز سے مُسکرا رہی تھی۔ معصوم کچھ بھی نہ سمجھ سکا پروین اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑکی کی طرف لے آئی۔ کھڑکی کے قریب پہنچکر وہ لمحہ بھر کے لئے رکی پھر کھٹاک سے کھڑکی کھولی۔ معصوم پر جیسے بجلی گری۔ ایک دھماکا ہوا اور اُس کے تصورات کا خزینہ لُٹ گیا۔ دیوار گر کر چور چور ہو گئی اور سامنے ایک وسیع قبرستان تھا۔ بارش کی وجہ سے کچھ قبریں دھنس گئی تھیں اور جگہ جگہ زمین میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس نے بھیگی ہوئی نگاہوں سے پروین کی طرف دیکھا اور جواباً پروین نے مُسکرا کر اُس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ کبوتروں کا جوڑا آج اُن کے چھجے پر تھا۔

غلام رسول سنتوش

یہ قربتیں یہ دوریاں

میں کالج کے سٹوڈیو میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ سامنے ایزل پر لگے کورے کینواس پر میری نظریں جمی ہوئی ہیں۔ اچانک جانی پہچانی وہی دو آنکھیں کینواس پر جھانکتی ہوئی دکھائی دی گئی ہیں۔ جن کے بارے میں میں نے اکثر دوستوں کو یہ کہتے سنا کہ یہ آنکھیں نہیں نیکوں وسعتیں ہیں۔ جن میں دیکھتے ہوئے انسان کھو جاتا ہے

آج بہت دنوں سے اس کینواس پر رنگ بکھیرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لکیروں کا تانا بانا بُننے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ہر بار کینواس میں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں میرے ہاتھوں کی وہ قوت چھین لیتی ہیں جو شاہکاروں کو جنم دیتی آئی ہیں جب کبھی میں نے ان آنکھوں پر سیاہی پھیرنے کی کوشش کی یہ مُسکرا دیتی ہیں۔ برش میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ میں اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہوں اور مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ماضی کی دو پرچھائیاں جو ہر وقت میرے تعاقب میں رہتی ہیں ایک سایہ بنا کر مجھ پر مسلط ہو جاتی ہیں۔

شام ہو چلی ہے اور میں اسٹوڈیو بند کر کے پورچ میں کھڑا ہوں۔ سامنے لان میں سیمنٹ کی بنی ہوئی مورتی شام کی کھوئی ہوئی روشنی میں ایسی دکھائی دے رہی ہے جیسے کوئی کنواری لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپا کر اپنے پیا سے ملنے جا رہی ہے۔ لان کے اُس طرف وہ سڑک ہے جو دن کی تیز دھوپ میں سنسان

رہتی ہے اور شام ڈھلتے ہی اُس پر تنہائی اور خاموشی میں پلنے والے لمحے جواں ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر لمحے کے بعد لڑکے لڑکیوں کے جوڑے ایک دوسرے کا سہارا لئے رنگیتے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہر قدم پر سرگوشیاں وعدوں میں بدل جاتی ہیں۔ مہکتی کنواری خوشبو سے فضا معطر ہو رہی ہے۔ جواں دل دھڑکتے دھڑکتے بے خود ہو جاتے ہیں اور انکار اقرار میں بدل جاتے ہیں مستقبل کی روشن اور تاریک دونوں صورتیں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتی ہیں۔

یہ پورچ تنہائی کا وہ گوشہ ہے جس نے کتنی ہی کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ اس پورچ کے ساتھ اُن آنکھوں کی کہانی وابستہ ہے جو ہر سمت چبھتی ہوئی نظروں کا جال بنتی ہیں —— یہیں بیٹھ کر میں اکثر اپنے ماضی کی بند کتاب کھول کر رکھ دیتا اور نقوش کی تلاش میں کھو جاتا جو زمانہ کی حوادث سے دھندلے پڑ گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ میں حال کا باسی ہو کر بھی ماضی کا انسان ہوں۔

ایک ایسی ہی شام کو جب میں ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ اپنے پیچھے کسی چبھتی ہوئی شے کے شدید احساس نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہی دو آنکھیں تھیں جن کا تذکرہ میں نے یار دوستوں سے سُنا تھا۔ گھنی بوجھل پلکوں سے جھانکتی ہوئی دو بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں سمندر کی سی نیلاہٹ اور گہرائی لئے مجھ پر مرکوز تھیں۔ چند لمحوں کے لئے ماضی کے وہ دھندلائے ہوئے نقوش جیسے روشن ہو کر پھر سیاہ تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ میرے سینے میں درد کا ایک طوفان جاگ پڑا تھا اور درد میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ رات کے سناٹوں میں گونج گئی تھی۔

"ہٹاؤ ان چبھتی ہوئی نظروں کو!"

ایک دبی دبی سی ہنسی میں میری چیخ کی گونج دب کر رہ گئی تھی۔

"خاموشیاں انسان کو پاگل بنا دیتی ہیں"

"میں خاموشیوں میں پلی ہوں، وہ آواز ہوں۔ جو دھڑکن بن کر زندہ رہتی ہے۔"

غارے سے چھوٹتے ہوئے پانی کی طرح کلپنا کی ہنسی نے مجھے بے چین کر رکھا تھا اور میرا دل رو اٹھا تھا۔

"اور تنہائیاں خودکشی کا احساس اُبھارتی ہیں۔"

"خودکشی ایک فرار ہے لیکن تم کیا چاہتی ہو"

کلپنا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

'فرار'

میں نے چیختے ہوئے پوچھا

"کس چیز سے"

کلپنا کی سانسوں کا لمس میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

"تنہائی اور خاموشی سے۔"

اس کے بعد ایک طویل قہقہہ پگھلتا ہوا سیسہ بن کر میرے ماضی کے رستے ہوئے ناسوروں میں بھر گیا تھا۔ میں درد کی شدت سے کراہ رہا تھا اور سانسوں کا لمس نزدیک سے نزدیک تر ہو رہا تھا۔

فضا خاموش ہے۔ کھیتی باڑی کے وہ پھول جو دن کی روشنی میں آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ رات کی سیاہی میں اپنے رنگ کھو چکے ہیں برگد کے درخت کسی غیبی حکم کے انتظار میں گم سم کھڑے ہیں۔ یونانی حسینہ کا مجسمہ اپنا ایک ہاتھ چھاتی پر دھرے اور خلاؤں میں دیکھتا ہوا اپنے آپ سے بے خبر ہے۔ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا یہ راستہ اپنے دونوں طرف ایسے گوشوں کو چھپائے ہوئے ہے جن کی تنہائیاں جواں دِلوں کو دھڑکن سکھاتی ہیں۔ میرے قدموں کی چاپ سے مخالف سمت سے آتی ہوئی چاپ اچانک رک جاتی ہے اور پھر تیز تیز قدم جھاڑیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ کمپنی باغ کا الگ تھلگ گوشہ ہے جہاں میں اکثر خلا میں لٹکے ہوئے ستاروں کو دیکھتا رہا ہوں۔ چاند کے اجلے چہرے سے داغ مٹانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ کبھی اس تنہا خاموش گوشے میں بھی سرگوشیوں نے جنم لیا تھا لیکن وہ سرگوشیاں مختلف تھیں۔ کچھ درد میں ڈوبی ہوئی۔ کچھ محبت کی ٹھنڈک سے بھرپور۔ شفاف چاندنی کی طرح اکثر یہ سرگوشیاں سسکیوں میں ڈوب جاتیں اور ماضی کے سائے ہر طرف منڈلانے لگتے ـــــ ایسے ہیبت ناک منظر سے گھبرا کر میں کلپنا کے آنسو پونچھ لیتا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگتا ـــــ

"کیسے ہیں وہ لوگ جو تمہاری آنکھوں کی اِن نیلگوں وسعتوں میں ڈوب جانے کے لئے اپنی روشن راہوں کو تاریک بنا کر خوش ہوتے ہیں"۔

کلپنا کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھرتی جیسے میں اَن سُنی کر دیتا

"میں اِن آنکھوں کو صرف دیکھنے کا تمنائی ہوں اِس لئے کہ اِن میں میرے ماضی کی وہ نامکمل تصویر ہے جس کے رنگ زمانے کے مدوجزر نے دھو ڈالے ہیں۔ کون جانے یہ تصویر کبھی اپنے اصلی رنگوں کو پا سکے گی یا نہیں"۔

کلپنا میری باتوں کو بھول کر کہتی

"اور مجھے تم میں مستقبل کی وہ رنگین و روشن تصویر دکھائی دے رہی ہے۔ جس میں ماضی اور حال دونوں اپنی ہیئت کھو دیتے ہیں"۔

کلپنا کے ملائم ہاتھ کا لمس میرے منتشر خیالات کو ایک نقطے میں سمیٹ کر جکڑ دیتا اور مجھے محسوس ہوتا جیسے خلا میں لٹکا ہوا سیارہ اچانک دھرتی کی جانب کھینچتا چلا جا رہا ہے اور میں آپ ہی آپ کلپنا کے سینے سے لگ کر انجانے خیالوں میں ڈوب جاتا۔ چند لمحوں کے لئے میرے ماضی کا تصور آنکھوں سے دور ہو جاتا۔ میں اسے وقتی سکون سمجھ کر اپنے آپ کو جھٹک دیتا۔

"دو مخالف سمتوں کو جانے والے رستے کبھی مل نہیں پائیں گے۔"
"راستے کبھی اچانک کسی موڑ پر ختم بھی ہوتے ہیں۔"
ماضی کے سلیے پھر اچانک نمودار ہو جاتے۔
"وہ موت ہے جس کی اُمید پر جی رہا ہوں۔"
کلپنا اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیتی۔ مجھے سینے سے لگا کر اپنی گھنیری زلفوں میں یوں چھُپا لیتی جیسے میں بلکتا ہوا وہ معصوم بچہ ہوں جو اپنوں سے بچھڑ گیا ہے۔

وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی!
"جس انجام کو تم موت کہتے ہو۔ در اصل وہی آغاز ہے اُس زندگی کا جہاں قرب اور دُوری کا احساس مِٹ جاتا ہے۔"
مجھے محسوس ہوتا جیسے برفانی چوٹیوں سے گرتا ہوا پہاڑی نالہ سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہا ہے۔ کلپنا کا باہوں کا حلقہ سمٹ جاتا۔
"میں وہ بنجر دھرتی ہوں جو تمہارے قدموں کو چھُو سکے تو پھول ہی پھول کھِل اُٹھیں گے۔"

میری نظریں ستاروں سے ہٹ کر کلپنا کی آنکھوں میں دیکھنے لگتیں جن میں پیار کا ساگر آنسو بن کر چھلکنے لگتا۔ نہ جانے کیوں میں بے چین سا ہو جاتا کیونکہ اس میں جھانکتی ہوئی وہ تھکی تھکی سی آنکھیں جیسے ہر طرف سے آ کر مجھے اپنے حلقے میں جکڑ رہی ہیں اور مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ ایک ایسی کیفیت جس میں درد بھی ہے اور سکون بھی جن کی جھپتی ہوئی نگاہوں میں پیار کا وہ لمس شامل ہے جو مجھے تھپکیاں دے کر میٹھی نیند کی آغوش میں سُلا رہا ہے۔ ماضی کے سائے چاندنی میں تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو رہے ہیں —— ایک ساتھ کئی قدموں کی چاپ کھنکتی ہوئی چوڑیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مختلف سمتوں کی طرف بھاگ کر گم ہو جاتی ہے

یہ وہی جھولتا پل ہے۔ جہاں ایسی ہی ایک رات کو میں نے پہلی بار کلپنا کے دل کی دھڑکنوں کا سنگیت سُنا تھا۔ اُس کی کنواری مہک سے آشنا ہوا تھا۔ جو ایک تاج محل کو جنم دیتی ہے۔ حالانکہ میری ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ فاصلے وہاں تک کھینچے چلے جائیں جس کی کوئی حد نہ ہو۔ لیکن کلپنا کی موجودگی اُن فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیتی اور مجھے یہی محسوس ہوتا میں وہیں کھڑا ہوں جہاں سے میں چلا تھا۔ بھٹکے ہارے مسافر کی طرح میرے قدم لڑکھڑا جاتے اور میں خود بخود کلپنا کی آغوش میں گر جاتا۔ چند لمحوں کے لئے اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا۔ وہ چند لمحے مجھے سکون ضرور دیتے لیکن اُن تلخیوں کا اثر زائل نہ ہو جاتا جو زہر بن کر میرے تمام وجود میں سرایت کر چکا تھا۔ کلپنا چاہتی تھی کہ یہ لمحے ایک ایسی لمبی زندگی بن جائیں جہاں ماضی کا کوئی بھی سایہ نہ ہو۔ مستقبل کے تابناک نقوش لئے حال کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ سیلاب کے رکے ہوئے پانی میں ایک ہلچل سی پیدا ہوتی اور دور ساکن پانی کی جھیل کے اوپر طوفان اپنے پر تولتا ہوا منڈلانے لگتا۔

"پرانی تصویر پر پھر نئی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔" دل کی گہرائیوں سے ایک آواز اُبھرتی۔

لیکن اِس احساس کو مٹایا نہیں جا سکتا جو اِس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اس تصویر کے نیچے ایک اور تصویر بنی ہوئی ہے۔ دماغ کے نہاں خانوں سے ایک سوچ سوال بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور میں نے اپنے آپ کو اُس دوراہے پر کھڑا پایا جہاں ایک طرف اندھیرا ہوتا اور دوسری طرف اُجالا۔

لیکن میں اُس سنگم کی تلاش میں ہوں جہاں اُجالے اور اندھیرے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔

احساسات اور جذبات کے اس نہ ختم ہونے والے دائرے میں، میں ایک مدت گھومتا رہا۔ جتنا ہی اِس دائرے سے نکلنے کی کوشش کرتا اُتنا ہی اپنے

آپ کو اس میں اُلجھا ہوا پاتا ـــــ میں کلپنا کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتا تو اپنا وجود کھو دیتا۔ میں دُور بھاگنے کی کوشش کرتا تو اپنا دامن کہیں کسی چیز سے اُلجھا ہوا پاتا اور میرا وجود ایک سوالیہ نشان کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اور میں لاجواب سا ہو کر آنکھیں بند کر لیتا۔ کلپنا میرے دِل کی دھڑکنوں کو چھو لیتی :

"احساس وہی رُوپ اپناتا ہے جو ہم اُسے دیں۔ احساس ایک کورا کینوِاس ہے۔ جس پر من چاہی صورت بنائی جاتی ہے۔"

اُس پار چڑیا گھر کے پیچھے گاؤں سے گربھا ناچ کرتی ہوئی لڑکیوں کے گانے کے بول اُبھر رہے تھے۔ ایک پرانی لوک کہانی ہے جسمیں ایک راجہ ایک راہ چلتی گوالن سے مخاطب ہوتا ہے ـــــ

"گوالن اپنی دودھ کی گگریا کی قیمت کیا ہو گی ـــ ؟" "راجہ کے اِصطبل کے سارے گھوڑے ـــ" گوالن جواب دیتی ہے ـــــ "اپنی ان باہنوں کی چوڑیوں کی کیا قیمت ہو گی ـــــ؟" گوالن مُسکرا دیتی ہے اور کہتی ہے ـــ "راجہ کا سارا راج ـــ" راجہ گوالن کے قریب جا کر اُس سے سرگوشی میں پوچھتا ہے ـــ "اور اپنی اِس من موہنی صورت کی کیا قیمت ہو گی ـــــ؟" گوالن کڑکتی ہوئی آواز میں کہتی ہے ـــــ "راجہ کا تن سے جُدا کیا ہوا سر۔"

اِس گیت کے بول اُس رات بھی فضا میں تھرک رہے تھے جب میں نے کلپنا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس سے کہا تھا۔

"کلپنا آؤ ہم سودا کریں۔"

کلپنا نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"سودے سے مکر تو نہیں جاؤ گے ـــ؟

"نہیں"

"قسم کھاؤ"

"تمہاری اِن آنکھوں کی سوگند ———— ؟"

نہ جانے کیسے یہ الفاظ میری زبان سے پھسل پڑے تھے اور مجھے اپنے ہی الفاظ پرائے محسوس ہوتے تھے ———— اپنی ہی آواز نا آشنا معلوم ہوئی تھی۔

"مجھ سے دُور رہنے کی کیا قیمت ہوگی —— ؟"

میں نے مُنہ پھیر کر کہا تھا

کلپنا نے میرے سینے سے لگ کر جواب دیا تھا

"صرف تمہاری قربت جس میں دُوری کا احساس نہ ہو۔"

مجھے محسوس ہوا تھا جیسے ہوا معلق ہوگئی ہے۔ بڑ کے درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے زور زور سے ٹکرا رہی ہیں ———— وشوامتری اپنا رُخ بدل کر بیچارہ ہوگئی ہے اور میں کہیں باغ میں کھڑے ایک مجسمے کو مبہوت سا دیکھ رہا ہوں اور گائیں سے گر بجا ناچ کرتی ہوئی لڑکیوں کے گیت کے بول ڈوب رہے ہیں اور کلپنا میرے سینے میں مُنہ ڈھانپے سسکیاں بھر رہی تھی۔

دور کھیتوں سے چاند نکل آیا ہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے چاند میں سے کلپنا کی تھکی تھکی آنکھیں اپنی داستان دہرا رہی ہیں۔ جس کا عنوان میں ہوں ———— یہ کہانی مجھ سے شروع ہوئی۔ کیوں نہ مجھ ہی پر ختم ہو۔ ہوا سرگوشیوں میں وہ کہانی سنا رہی ہے جب میں کلپنا کے ساتھ کئے گئے سودے سے مکر گیا تھا۔ میں خلاؤں میں دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فاصلے سمٹ رہے ہیں۔ چڑیا گھر سے آتی ہوئی اُلو کی آواز اُن اذیت ناک لمحوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ جب ماضی کے سائے مجھ پر مسلط ہوئے تھے۔ میں حال کا باسی ہوں اور میرا رُخ مستقبل کی رنگینیوں کی طرف ہے۔ یہ اُلو کی آواز مجھے ماضی کے اُن کھنڈروں کی یاد دلا رہی ہے جن پہ میں نے حال کی تعمیر کی تھی۔ جو ڈھ چکی ہے۔ وہ دور کہیں تنہائی اور خاموشی سے گھبرایا ہوا چرواہا الغوزے بجا کر اپنے اکیلے پن کو مٹا رہا ہے۔ کتنی مدھر تان ہے۔ مست چاند کی طرح بے خود کرنے والی۔ یہ کون سا

سنگیت ہے جس میں درد کی کسک متھاس بن کر سارے وجود میں سما رہی ہے۔

چاند آکاش کی بلندیوں پر آچکا ہے اور مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ دھڑکنیں کسی حادثے کی کہانی سنا رہی ہیں۔ حادثے جو زندگی کی دشواریوں اور خوشیوں کے رشتے ملائے ہوئے ہیں۔ سامنے بجلی کا وہ کھمبا ہے جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو یہاں میرے پیچھے مخالف سمتوں سے آنے والے سائے ایک ہوتے ہیں اور میرا سایہ میرا ساتھ چھوڑ کر اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ کیوں میں واپس بجلی کے کھمبے کے پاس جاؤں اور مخالف سمت سے ایک اور سایہ بڑھتا ہوا آئے اور میرے سائے میں مدغم ہو جائے۔

یہ جھولتا ہوا پل جن لمحوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ کاش وہ لمحے لوٹ آئیں۔ اور ایک لمبی زندگی بن جائیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وشوامتری اپنی نگر نگر کی کہانیوں کو اُگل دے —— میری اس کہانی کو، جو اُس نے اپنے اندر چھپالی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ پُرانے کنارے ڈھ جائیں، اور نئے کنارے تشکیل پائیں۔

کمپنی باغ کا جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا راستہ خاموش اور سنسان کیوں ہے۔ مجھے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کسی کے قدموں کی چاپ اس پر بجتی ہی رہے اور وہ یونانی حسینہ کا مجسمہ اب تک یوں خلاؤں میں گھور کیوں رہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ باغ میں بے تحاشا دوڑنے لگے اور پھر تھک ہار کر کسی آغوش میں گر جائے۔

لان میں کھڑی ابھیسارکا اب تک ایسے ہی کیوں کھڑی ہے۔ کیا یہ اب تک اپنے پیا سے ملی نہیں۔ کہیں یہ راستہ تو نہیں بھول گئی ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُس کے پیا تک پہنچا دوں۔ کہیں اگر یہ رات بیت گئی تو خاموشی اور تنہائی پھر لوٹ کر نہ آئے گی اور اُس کا پیا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو جائے گا اور یہ بے چاری اپنے جواں ارمانوں کو اپنے دل میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دینے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس ابھیسارکا کے کتنے نام ہیں۔ شکلا ابھیسارکا۔ کرشن ابھیسارکا اور کبھی یہ ابھیسارکا دن کی روشنی میں بھی اپنے پیا تک پہنچ جاتی ہے۔

میں سٹوڈیو کے باہر پورچ میں کھڑا ہوں۔ رات ڈھل چکی ہے۔ صبح کا پیدا رات کی سیاہیوں کا سینہ چاک کر رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں راستے کے اُس اکیلے راہی کی طرح جو گھوم پھر کر پھر وہیں آ پہنچا جہاں سے اُس کا سفر شروع ہوا تھا ——— یہ کون سا سنگم ہے۔ جہاں راستے ملتے ہیں۔ یہ کون موڑ ہے جہاں راستہ اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہی وقت ہے جب رات کی تاریکیوں کی کوکھ سے روشنی کی ایک کرن جنم لیتی ہے۔ جو پل بھر میں جوان ہو کر ایک روشنی دن کی شکل اختیار کرتی ہے۔

لان کے اُس طرف کی سڑک سنسان اور خاموش ہے لیکن یہ کیا ——— ؟ کوئی سایہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ نہیں یہ میری نظروں کا دھوکہ ہے۔ لان میں کھڑی اِس سیمنٹ کی مورتی میں جان پڑ گئی ہے اور رات ڈھلنے سے پہلے یہ اپنے پیا سے ملنے آ رہی ہے ——— نہیں یہ مورتی نہیں۔ کوئی اور سایہ ہے۔ جو میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ سایہ ایک جیتی جاگتی مورت میں ڈھل گیا۔ میں اُسے اب پہچاننے لگا ہوں۔ یہ وہی تھکی تھکی سی آنکھیں ہیں۔

"کلپنا"

صبح ہونے سے پہلے ہی جیسے روشنی پھیل رہی ہے۔

آؤ کلپنا آؤ ——— میرے گلے لگ جاؤ اُن دوریوں کو قربت میں سمٹ جانے دو جن میں، میں آج تک بھٹک رہا ہوں۔ میں نے ماضی کے اُن سایوں سے چھٹکارا پا لیا ہے جو تمہیں مجھ سے چھین لیتے تھے۔ تم رک کیوں گئیں کیا اب بھی میں تمہیں غیر سا دکھائی دیتا ہوں۔ دیکھو تو رات کی سیاہیاں دِن کی روشنی میں دم توڑ رہی ہیں۔ ایک اُجلی مسکراتی ہوئی صبح جنم لے رہی ہے۔

"میرے لئے اب رات شروع ہو رہی ہے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو کلپنا ——— ؟"

"میں کسی اور کی ہو چکی ہوں ———" مجھے افسوس ہو رہا ہے جیسے واقعی رات شروع ہو رہی ہے۔ جو قربتوں اور دُوریوں کا احساس مٹاتی ہے!!

کلدیپ رعنا

جوئیں

میں سُرخ بالوں والی لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا اور میرا پیچھا زُلفاں کر رہی تھی، زلفاں کی زلفیں لمبی تھیں۔ بہت ہی لمبی لمبی اور سیاہ تاریک راتوں کی طرح۔ میں جہاں جاتا زلفاں کی زلفوں کو پاتا۔ زلفوں میں رینگتی ہوئی جوؤں کو پاتا اور جوؤں کو دیکھ کر میں اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اپنا جسم کھرچنے لگتا۔ کھرچنے سے میرے جسم پر نیلی پیلی لکیریں اُبھر جاتیں اور مجھے خراشوں والی ناگن یاد آجاتی اور پھر مجھے ساری دنیا ایک اندھی گہری قبر میں تبدیل ہوتی ہوئی محسوس ہوجاتی۔

جانے کب کی بات ہے مجھے کچھ یاد نہیں —— ہوگی کوئی ہزار دو ہزار صدی پہلے کی بات۔ میں ایک اندھی گہری قبر میں دفن تھا اور تڑپ رہا تھا۔ روشنی کی ایک کرن کے لئے زندگی کی ایک دبک کے لئے اور پیار کے ایک لمس کے لئے اور میرے پہلو میں لیٹی ہوئی ایک ناگن تھی جس کے دانت لمبے اور نوکیلے تھے۔ ہونٹ سُرخ اور خُون سے لت پت تھے۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا اور اُس کے ننگے بدن پر لمبی گہری خراشیں تھیں جن سے پیپ رس رہی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ جاتی، بولتی۔

"مجھے تم سے پیار ہے"

میں اپنے جسم سے اُس کا خُون اور پیپ صاف کرتے ہوئے اُس کے

چیچک زدہ چہرے پر تھوک دیتا۔ اُسے غصہ آتا اور وہ میرے سارے جسم کو گھیر کر پھن پھیلا کر مجھے ڈسنے لگتی اور میں چیخنے چلانے لگتا۔

"کوئی آجاؤ، کوئی مسیحا، کوئی پیغمبر، کوئی اوتار آکر اس قبر کی دیواروں کی ڈھادو اور مجھے روشنی دیدو، زندگی دیدو اور پیار دیدو ــــ!"

لیکن دُنیا میرے لئے مر چکی تھی (یا میں دُنیا کے لئے مر چکا تھا) میری کوئی نہیں سُنتا اور میں اپنا سر ٹپکنے لگتا۔ بڑی بے قرار اور بڑی بے دردی کے ساتھ اور سر ٹپکتے ٹپکتے مجھے قرار سا آجاتا اور میں سو جاتا۔ سو کر خواب دیکھتا۔ ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کا اور سوتے میں چونک پڑتا۔ چونک کر اپنے ارد گرد ٹٹولتا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے میری انگلیاں خُون اور پیپ کی کیچڑ میں ڈوب جاتیں۔

پھر مجھے رات بھر نیند نہیں آتی!

اور ایک جاگتی رات کو ...... وہ بڑی سرد اور تاریک رات تھی.....

چاند اور سُورج کا قتل ہو چکا تھا، اور خُون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ سُرخ بالوں والی لڑکی مجھے اِس اندھی گہری قبر سے باہر نکال لائی۔ میں رو پڑا اور رو کر اُس سے لپٹ گیا۔

"تُم نے مجھے بہت انتظار کرایا۔"

پہلے وہ روئی، پھر مسکرائی، بولی ــــ

"اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں زہر کھاؤں گی"

یہ بات آج تک میں نے کسی سے نہیں کہی ہے۔ ویسے کہنے سُننے سے دِل ہلکا ہوتا ہے۔ لیکن سچ بولنا گناہ جو ہے۔ کون میری بات کا اعتبار کرے۔

سُرخ بالوں والی لڑکی مجھے ایک بہت ہی لمبے چوڑے صحرا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں چیخا چلایا اُسے اپنے پیار کا واسطہ دیا ــــ بولی

"میں اُڑنے والی پری ہوں جو میرا ساتھ دے میں اُسی کی ہوں"۔

اور اتنا کہہ کر وہ فضاؤں میں اڑ گئی اور رات کی تاریکی گہری ہوگئی

اور اس گہری تاریکی میں، میں نے اپنے سامنے ایک صاف وشفاف گوری باہنوں والی ایک عورت کو دیکھا۔ اُس کی زُلفیں بہت لمبی تھیں۔ بہت ہی لمبی جیسے تاریک رات اور اُس کی صاف و شفاف گوری باہنوں میں چاند اور سُورج نے جنم لیا تھا۔ اُس کی باہنوں نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اُس کے قریب گیا قریب جاکر اُس کی باہنوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"زلفاں، تمہاری صندلی باہنوں سے خوشبو آرہی ہے"۔

وہ مُسکرائی اور میں نے اُس کے بدن کو سہلاتے ہوئے کہا

"تمہارا جسم تنور سے نکالی ہوئی ڈبل روٹی کی طرح نرم اور گرم ہے"۔

اُس کی پلکیں بھاری ہوئیں لیکن پانڈؤں نے میری گردن پکڑی۔

پانڈو وہ نہیں جن کی ایک مشترکہ بیوی تھی۔ یہ پانڈو پانچ لڑکیاں تھیں خوب صورت، زود حِس اور دُور اندیش۔ انہیں دُنیا کے گرم و سرد کا علم تھا۔ مجھ سے بولیں۔ "زُلفاں کے پیچھے نہیں۔ سُرخ بالوں والی لڑکی کے پیچھے دوڑو"۔ میں نے پانڈوؤں کے کہے پر عمل کیا اور زُلفاں کو چھوڑ دیا۔ زُلفاں کو میری بے رُخی پر غصہ آیا اور مجھے اپنے ہاتھوں پر اُٹھاکر اپنی زلفوں میں پھینک دیا، اور میں نے اپنے آپ کو ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں جوؤں میں پایا ——

جوئیں ...... جو میری زبان نہیں سمجھتیں

جوئیں ...... جو گلی سڑی اور مردہ تھیں

وہ بس رینگتیں دِن رات اور رات دن۔ میں چیختا چلاتا لیکن وہ میری طرف دیکھتیں نہیں —— میں ہنستا گاتا لیکن وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتیں میں بہت مایوس ہوا، اور پھر اُس زبان میں جو میں جانتا اُن سے سُرخ بالوں والی لڑکی کا پتہ پوچھا۔ سُرخ بالوں والی لڑکی کا نام سُن کر اُنہوں نے ایک لمحے کے لئے رینگنا بند کیا۔ پھر ایک پُراسرار مسکراہٹ مُسکراکر وہ میری طرف تحقیر آمیز نظروں سے دیکھ کر دوبارہ رینگنے لگیں اور پانڈو رونے لگیں۔ پھر کر نجات کے لئے نئی نئی ایجادات

کرنے لگیں۔ نئے نئے راستے تلاش کرنے لگیں۔ راستے جو پیچ در پیچ تھے۔ لیکن میں پانڈوؤں کی رہنمائی میں اُن پیچ در پیچ راستوں پر چل کر اپنی سُرخ بالوں والی لڑکی اپنی سُرخ بالوں والی لڑکی کی تلاش کرتا رہا۔ جنگل جنگل، دریا دریا، بستی بستی صحرا صحرا لیکن زنفاں کی زُلفیں بہت لمبی تھیں۔ اس کی زلفوں کے پاس پانڈوؤں کی ایک نہ چلی۔ میں جہاں جاتا زنفاں کی زُلفوں کو پاتا۔ زُلفوں میں رینگتی ہوئی جوؤں کو پاتا۔ کالی جوئیں، لال جوئیں، سفید جوئیں —— اور میں اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اپنا جسم کھرچنے لگتا —— کھرچنے سے میرے جسم پر نیلی پیلی لکیریں اُبھر جاتیں —— خراشوں سے لال لال پانی رسنے لگتا اور مجھے زُلفاں پر بڑا غصہ آتا لیکن میں کیا کرتا۔ اُس نے میرے پاؤں میں زلفوں کی زنجیر ڈال دی تھی اور میں اُس کی طرف کھینچتا چلا جاتا۔ اور چاہتا کہ اُس کے جسم کے سلاخوں باہر نکلوں —— لیکن وہ نکلنے —— نکلنے نہیں دیتی۔ اُس نے ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کو نگل ڈالا تھا۔ لیکن اُس کا پیٹ نہیں پھولتا۔ کبھی پھولتا تو وہ ابورشن کراتی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز شوہر تبدیل کرتی جیسے شوہر نہ ہو بالوں کا اسٹائل ہو یا وہ سیاہ تل جو کبھی اُس کے رخسار پر ہوتا اور کبھی ٹھوڑی پر —— پانڈو بولتیں۔ زنفاں کے شوہر کو رہ ہیں۔ اُن سے نہیں ملو۔ لیکن میں نے زنفاں کی باہوں کو چاٹنے کا ارادہ کیا تھا ——

اس لئے ایک رات پانڈوؤں کو سلا کر میں زُلفاں کی سیڑھی پار کرتے ہوئے اُس کے سر پر چڑھ آیا اور دھیرے دھیرے کوئی آواز نکالے بغیر اُس کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ سو رہی تھی۔ اور میں اُس کی باہیں سہلانے لگا۔ اور اُس نے نیند میں مسکرا کر دھیرے سے میرے جسم میں آگ پھونک دی۔ میں اُس کے قریب آیا اور اپنی انگلیوں سے اُس کے جسم کی نرمی و گرمی کا احساس کرنے لگا۔ وہ سمٹنے کے بدلے پھیل گئی۔ اور میری انگلیاں پھسلتے بڑھتے دُور دُور تک نکل گئیں۔ زُلفاں نے پہلو بدلا، بولی ——

"تُم چاروں سے باہر جا رہے ہو؟"
آگ پھیل چکی تھی —— میں بولا —— "یہ حدیں کہاں ہوتی ہیں میں وہیں تک آؤں گا۔"

اُس نے میرے چہرے پر تھپیڑا مارا اور تھپیڑا مار کر اپنی زلفوں میں پھینک دیا اور میرے جسم سے شعلے نکلنے لگے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ اُس کی زُلفیں نہ جلیں۔ میں جلا اور جلتا ہوا دوڑا، دوڑا اُس کی زلفوں میں بنائے ہوئے اپنے گھونسلے میں آیا۔ آ کر گھونسلے میں رکھا ہوا تکیہ اُٹھایا اور اُس کو چیر پھاڑ کر نوچ ڈالا۔ میرا خیال تھا کہ تکیہ چیخے گا، چلائے گا۔ لیکن تکیہ خاموش رہا اور میں نے چاقو سے اپنی انگلی کاٹی اور اس سے بہتے ہوئے خُون کو چوستے ہوئے سو گیا۔ سو کر خواب دیکھا۔ سرخ بالوں والی لڑکی کا اور سوتے میں چونک پڑا۔ چونک کر اپنے اِرد گرد دیکھا —— ہر طرف خُون سے لت پت روئی کے گالے تھے...... میرے اندر کے زخم زندہ ہو گئے۔ زندہ زخموں پر نمک چھڑکا جائے تو تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں۔ میں اپنے دِل کے نہاں خانوں میں یادوں کے نمکداں کو ڈھونڈنے لگا اور مجھے اپنا گھونسلہ اندھی گہری قبر میں اور خُون سے لت پت روئی کے گالے خراشوں والی ناگن میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں سہم گیا۔ سہم کر چیخ پڑا اور اپنا سر پٹکنے لگا۔ بڑی بے قراری اور بڑی بے دردی کے ساتھ پانڈو بولیں، سر پھٹ جائے گا —— دروپدی، جو تھیں اُن کی، بڑا پیار کرتی تھیں مجھ سے۔ سُرخ بالوں والی لڑکی بولی تھی، تمہاری اصل محبوبہ میں ہوں۔ میں نے اُس کے ہونٹوں کو چُوم کر کہا تھا۔ تُم بہت خوبصورت ہو، بولی تھی —— میں بد صورت بھی بن سکتی ہوں۔

میں پانڈوؤں سے بولی۔ —— پھٹنے دو

وہ بہت اُداس ہوئیں۔ بولیں سر پھٹ جائے گا تو تمہاری سُرخ بالوں والی لڑکی زہر کھا لے گی۔ میں کانپ اُٹھا اور بڑی بے چارگی سے رونے لگا۔

پانڈو بولیں ــــ "رونے سے کچھ نہ ہوگا۔ اُٹھ کر یہاں سے بچنے کا کوئی انتظام کرو۔"

میں روتے ہوئے بولا ــــ "مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ مجھے ڈبل روٹی چاہیے۔"

پانڈو میری بات سُن کر چونک پڑیں۔ اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں اُسی وقت زلفان نے اپنی زلفوں میں کنگھی کرنا شروع کی اور میرے گھونسلے میں بھونچال آیا اور گھونسلے کے باہر ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں جوؤں کا قتل ہوا چیخ و پکار شروع ہوئی .... پھر کچھ دیر بعد طوفان تھم گیا اور میری حیرت سے چیخ نکلتے رہ گئی .... میرے سر پر لمبے لمبے بال اُگ آئے تھے، اور میری باہیں نرم و نازک اور صاف و شفاف بن گئی تھیں، اور میں، میں نہیں تھا۔ دروپدی تھا (یا تھی) اور میرے سامنے پانڈو تھے۔ پانڈو پانچ لڑکیاں نہیں، پانڈو پانچ مرد، لمبے۔ ٹھنگنے، بڑے پتلے جن کی ایک مشترکہ بیوی تھی۔ دروپدی .... اور پھر زُلفاں نے اپنی زلفوں میں تیل ڈالا، اور موسم بہت سرد ہوا، اور میں رضائی لے کر سو گیا (یا شاید مر گیا) ــــ

جانے کب کی بات ہے، مجھے کچھ یاد نہیں۔ کوئی ہزار دو ہزار صدیوں بعد کی بات۔ میں جاگ پڑا (یا زندہ ہوا) اور میرے کان دھماکوں سے پھٹنے لگے۔ ایٹم بم۔ ہائیڈروجن بم۔ میزائل، اینٹی میزائل، توپیں۔ ٹینکیں۔ گولیاں بم .... خون صرف خون، لاشیں صرف لاشیں جوئیں صرف جوئیں .... مرتی ہوئیں جوئیں، سڑتی جوئیں۔ رینگتی جوئیں۔ کالی۔ سفید۔ لال سبھی ......

اصل میں میرے مرنے کے بعد گوروؤں میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ اُنھوں نے زلفاں کے حصے کیے تھے۔ کسی نے اُس کی باہیں لی تھی اور کسی نے رخسار، کسی نے سر اور کسی نے ناک، کسی نے گردن اور کسی نے شانے۔ کسی نے ٹخنے اور

کسی نے ٹانگ .... لیکن کوئی بھی حصّہ دار اپنے حصّے سے مطمئن نہیں تھا۔ (ہوتا بھی کیسے۔ عورت کی ٹانگ عورت نہیں ہو سکتی) ہر حصّہ دار اس کوشش میں تھا کہ زُلفاں کے دوسرے حصّے بھی ہڑپ کرے۔ ہڑپ نہ کر سکے تو برباد ہی کرے —— اور بربادی ہر طرف چھا چکی تھی۔ دھرتی پر زندگی ختم ہو چکی تھی۔ اور زلفاں کے جسم پر کھڈ اور اور گھاٹیاں بن چکی تھیں۔ وہ تڑپ رہی تھی لیکن مرتی نہیں —— جوتشیوں کا خیال تھا کہ ابھی اس کے جسم میں نرمی اور گرمی موجود ہے۔ جب سختی اور سردی ہو جائے گی تو آپ ہی آپ مر جائے گی۔

مجھے زلفاں پر سخت رحم آیا۔ لیکن میں کیا کرتا اکیلا اور تنہا۔ میرے چاروں اور بکھری ہوئی لاشیں تھیں۔ رینگتی ہوئی جوئیں تھیں۔ گلی سڑی اور مردہ —— وہ میری زبان نہیں سمجھتیں۔ کسی کی زبان نہیں سمجھتیں۔ صرف رات کی تاریکی میں اُن کے کالے سپاٹ سائے، آسمان کی اور مُنہ اوپر اُٹھائے بے آواز آوازوں میں کچھ بڑبڑانے لگتے۔ دیر تک بڑبڑاتے رہتے اور مجھے ساری دھرتی ایک اندھی گہری قبر میں تبدیل ہوتی ہوئی محسوس ہو جاتی۔

اور ایک رات —— وہ رات بڑی خوف ناک اور منحوس تھی۔ میرے زخموں کے کھرنڈ اُکھڑ گئے تھے اور میں تڑپ رہا تھا۔ تڑپ کر جاگ رہا تھا۔ اور جاگتے جاگتے مجھے دُور بہت دُور خراشوں والی ناگن انسانی سروں کی مالا پہن کر دھرتی پر پھیلی ہوئی لاشوں اور رینگتی جوؤں کے درمیان گھومتی ہوئی دکھائی دی میرے زخموں میں سوئیاں سی چبھ گئیں اور میں اوپر جست لگا کر زلفاں کی زلفوں سے باہر نکل آیا اور چھپتے چھپاتے دوڑنے لگا۔ جنگل جنگل، دریا، دریا، بستی بستی، صحرا صحرا دوڑتا رہا۔ برسوں صدیوں سُرخ بالوں والی لڑکی کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے میں نے ساری دُنیا چھان ماری اور میرے پاؤں میں آبلے اور ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ بدن کے زخم ناسور بن گئے۔ کھال جگہ

جگہ سے اُکھڑ گئی۔ آنکھوں کے پپوٹے سُوجھ کر باہر نکل آئے۔ لیکن سُرخ بالوں والی لڑکی کہیں نہ ملی۔ دھرتی کے کسی کونے میں نہیں ـــــ شاید آکاش کے کسی کونے میں ہو۔ یہ سوچ کر میں رُک گیا۔ وہاں جہاں آکاش دھرتی سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ رُک کر دم لیا ہمت اور کشش تھی۔ ورنہ میں تھک کر چُور ہو چُکا تھا اور مجھ میں کوئی سکت باقی نہیں تھی۔

دم سنبھال کر میں نے ایک لمبی بہت لمبی زلفاں کی زلفوں ایسی ایک سیڑھی لا کر آسمان کے ایک کونے سے ٹکا دی اور اپنے چاروں اور نظر ڈال کر دھرتی پر پھیلی ہوئی لاشوں اور جوؤں سے مخاطب ہو کر بولا کہ وہ میرے لئے دُعا کریں کہ مجھے اپنے کام میں سپھلتا ملے، اور اُن کی دُعا قبول ہوئی تو میں وہاں سے سرخرو واپس آؤں گا۔ اور اُن سبھوں پر امرت کی ورشا کر کے انہیں ایک نیا جیون بخش لوں گا، اور اگر نہیں ـــــ تو...... تو......

میری آواز شدتِ جذبات سے ٹوٹ گئی اور میں بڑی تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

سیڑھیوں پر قدم رکھنے سے اور اُوپر والی سیڑھیوں کو تھامنے سے میرے پاؤں کے آبلے اور ہاتھوں کے چھالے پھٹ پڑے اور میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ ٹانگیں لرزنے لگیں اور بدن کی خراشیں رونے لگیں کشش بڑی چیز ہوتی ہے۔ میں زخموں کی پرواہ کئے بغیر ہی بڑی تیز رفتاری سے سیڑھیاں پار کرتا ہوا اُوپر ہی اُوپر چڑھنے لگا۔

اُوپر

اور اُوپر

بہت اُوپر

تب ایکا ایک دم سے میری اکڑی ہوئی کھال کے ورقے اور گوشت کے چھیچھڑے میرے بدن سے علیحدہ ہو کر گرنے لگے اور میرا گلا خشک ہو گیا۔

کانوں کی سماعت جاتی رہی۔ سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں گھبرا گیا۔ اور گھبرا کر اپنی تیز رفتاری میں تیزی پیدا کرنے لگا۔ اور پھر سے چڑھنے لگا۔ میں نہیں میری ہڈیوں کا ڈھانچہ اور مجھے کوئی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔

صرف میں، میں اور میں
میرے اُوپر پھیلا ہوا آکاش
اور میرے نیچے پھیلی ہوئی دھرتی!

میں نے اطمینان کی سانس لی اور سیڑھیاں چڑھنے کے لئے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ کسی نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی اور مجھے اپنے پاؤں تلے زلفاں کی زلفوں ایسی لمبی سیڑھی سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں خلا میں معلّق نہ آگے جا سکا اور نہ پیچھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور خوف و دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میرے ہر طرف ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں چمگادڑ پھیل کر اُڑ رہے تھے۔ اُڑ رہے تھے۔ اور میری طرف بڑھ رہے تھے مجھ کو نوچنے کے لئے، مجھ کو نہیں، میری ہڈیوں کو، نہیں میری دو زندہ جاوید آنکھوں کو........

میری آنکھیں بڑی تیزی سے گھومنے لگیں۔

اُوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے —— ہر طرف چمگادڑ، چمگادڑ ہی چمگادڑ، میری ہڈیاں خوف و دہشت سے سکڑ گئیں۔ سکڑ کر چیخنے لگیں —— !

کوئی آجاؤ، کوئی مسیحا، کوئی پیغمبر، کوئی اوتار، آ کر مجھے کسی اندھی، گہری قبر میں دفن کرو —— جہاں نہ روشنی ہو، نہ زندگی ہو اور نہ ہی پیار ہو۔

لیکن میرے لئے دنیا مرچکی ہے (یا میں دنیا کے لئے مرچکا ہوں)

میری آواز کسی نے نہیں سُنی اور میں اپنا سر پٹکنے لگا۔ بڑی بے قراری اور بڑی بے دردی کے ساتھ اور دھرتی پر پھیلی ہوئی لاشوں کے سامنے آکاش کی اور مُنہ اُٹھائے بے آواز آوازوں میں کچھ بڑبڑانے لگے بڑبڑاتے رہے اور بڑبڑاتے رہے ——— !!!

ریاض پنجابی

لمحوں کی صلیب

اور میں سمندر کی طرف منہ اُٹھائے بڑی دیر سے چُپکے چُپکے رو رہا تھا۔ آج کرسمس کی رات تھی۔ ہر طرف روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ فضا میں رنگ برنگے غبارے تیر رہے تھے۔ ہر طرف ہنسی اور قہقہے اُبل رہے تھے۔ نئے اور قیمتی ملبوسات پہنے لوگ جھکتے ہوئے ٹہل رہے تھے، ہاتھوں میں ہاتھ دئے، ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے۔ ہوٹل اور بال روم کھچا کھچ بھرے پڑے تھے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ہوٹل تاج محل کے باہر موٹروں کی ایک لمبی قطار تھی۔ لوگ آ رہے تھے۔ جا رہے تھے، دوسری طرف گیٹ وے آف انڈیا پر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے ادھم مچا رکھی تھی۔ وہ چیخ رہے تھے ہنس رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ اُچھل کود رہے تھے۔ ایک دوسرے سے جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

آج کی رات بہت حسین تھی۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہر طرف فضا میں خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ سمندر کی نرم باہوں میں ننھا چاند لیٹ لیٹ کر مچل رہا تھا۔ غم کے سائے دور سمندر سے پرے کہیں تاریکیوں میں سو رہے تھے۔ آج ہر طرف اُجالے ہی اُجالے تھے۔ اندھیرے سو رہے تھے۔ اُجالے جاگ رہے تھے اور میں —— میں اِن اُجالوں سے دُور غم کی رات اوڑھے، دُکھ کی چادر لپیٹے

درد کے آنسو برسا رہا تھا۔ آج کی رات بہت خوبصورت تھی اور مجھے ماریا کا انتظار تھا۔ لیکن ماریا اوبرائے ہوٹل تاج کے بال روم میں فرنانڈیز کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی، اور میں چپکے چپکے رو رہا تھا۔ اکیلا، اُداس، تنہا ـــــ ماریا نے کل شام آفس سے نکلتے وقت آج رات کا سارا پروگرام میرے ساتھ طے کیا تھا۔ آج شام میں نے اُسے چرچ میں بھی دیکھا تھا۔ اُس کے سر پر ایک ریشمی اسکارف بندھا ہوا تھا۔ اور وہ سینے پر ہاتھ باندھے بڑے احترام سے سرمن سن رہی تھی۔ اُس وقت وہ پیاری لگ رہی تھی۔ بڑی مقدس ـــــ اُس کے ساتھ اُس کی ماں اور دو چھوٹے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ سرمن ختم ہوتے ہی پریئر سُنے بغیر میں وہاں سے نکل آیا تھا اور وقت سے پہلے ہی چرچ گیٹ اسٹیشن پر آکھڑا ہو گیا تھا۔ جہاں اُس نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں بہت دیر تک بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ میری نظریں اسٹیشن پر لگے کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے آنے کا وقت بھی نکل گیا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ لوکل ٹرین کئی بار آ جا کر اور لاکھوں آدمیوں کو اُگل کر اور ہضم کر کے آتی جاتی رہی لیکن ماریا نہیں آئی۔ آہستہ آہستہ مجھے یقین ہونے لگا کہ اُس کی پوپلے منہ والی ماما نے اُسے اکیلے جانے سے منع کیا ہوگا۔ اور جب مجھے قطعی یقین ہو گیا کہ ماریا اب نہیں آئے گی تو میں اُداس سا ٹہلتا ہوا اس سڑک پر نکل آیا۔ یوں ہی بے مقصد ہوٹل تاج محل کے سامنے آکھڑا ہو گیا۔ اور آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔

رات آہستہ آہستہ، سبک خرامی سے بہہ رہی تھی ـــــ خراماں خراماں اسکے دامن میں جوہی، موگرے اور دینا کی مہک بسی ہوئی تھی۔ خراماں خراماں، دھیرے دھیرے، خنک رات بہہ رہی تھی۔ دُور دور تک سینٹ، پاؤڈر اور یوڈی کلون کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زندگی کی سخت گیر اور بے رحم نظریں بچا کر یہ لوگ چند لمحے چُرا لائے تھے۔ اور اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے یہی لمحات چرا چرا کر تو آدمی جی لیتا ہے۔ میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا

تھا۔ خوبصورت عورتیں اور بدصورت مرد ـــــ جوان لڑکیاں اور کھچڑی سے بالوں والے ادھیڑ مرد ـــــ جوان مرد اور بوڑھی میک اپ زدہ عورتیں آرہی تھیں اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوٹل میں جارہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں خالی شاید کسی ساتھی کی تلاش میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہی تھیں۔ یہیں کھڑے کھڑے صرف آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔

اچانک ایک لمبی چمکیلی کار رات کے سینے پر تیرتی ہوئی آہستہ آہستہ مجھ سے تھوڑی دور آکے رُک گئی۔ ماریا اس گنجے ادھیڑ عمر فرنانڈیز کے بازو میں بازو ڈالے ہنستی ہوئی کار سے اُتر رہی تھی۔ میں جہاں تھا وہیں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ ماریا نے اپنے کپڑے بدل لئے تھے۔ وہ اب ایک مینی اسکرٹ پہنے تھی۔ جو گھٹنوں سے اُوپر تھا۔ اس کی گوری چکنی صحت مند لمبی ٹانگیں چمک رہی تھیں۔ اس کے سر پر اب اسکارف بھی نہیں تھا۔ اس کے پریشان اور کھلے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اوپر تاج میں چلی گئی تھی۔ میں بہت دیر تک یوں ہی سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اچانک کسی راہ گیر کے دھکے سے میں چونک گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، اپنے قدم بے ارادہ اُٹھاتے ہوئے بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی تھی ـــــ فرنانڈیز ماریا کے گھر گیا ہوگا اور اُسے اپنے ساتھ لایا ہوگا ماریا کی بھولی بھالی ماما نے انہیں ہنسی خوشی جانے کی اجازت دی ہوگی جانے کی اجازت کیسے نہ دیتی ـــــ؟ وہ اُس کی بیٹی کا باس جو ٹھہرا اور میں کھڑے کھڑے چار گھنٹے سے ماریا کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کسی اور گرل فرینڈ کا سہارا بھی نہ لینا چاہا ـــــ کیونکہ ماریا کے سوا مجھے کوئی اور لڑکی اچھی بھی نہیں لگتی ہے۔ اور ماریا فرنانڈیز کے ساتھ کار میں آکر اوپر تاج کے بال رُوم میں ڈانس کر رہی تھی ـــــ چلتے چلتے اب میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے قہقہے لگاتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ ایک

دوسرے سے چمٹے ہوئے جوڑوں کی طرف دیکھا جو اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ خاموش بہتی ہوئی رات کو محسوس کیا۔ جوہی، موگرے اور رویناکی خوشبوؤں کو سونگھا اور اُوپر تاج کی اونچی بلڈنگ کی طرف دیکھا، جس میں کہیں، کسی کمرے میں ماریا ڈانس کر رہی تھی اور خوشی سے کرسمس کی رات منا رہی تھی۔ میں نے غصّے میں اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ مجھے بے حد غصہ آنے لگا۔ خون میرے رخساروں میں تمتمانے لگا۔ میری مٹھیاں خود بخود کھلنے اور بند ہونے لگیں، اور میں نے غصّے سے دانت پیس لئے۔ مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ میں نے سوچا کچھ کرنا چاہئے۔ ورنہ میں غصّے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے دماغ کی رگیں جیسے تن گئی تھیں۔ مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ کچھ خوف ناک، خطرناک دھماکہ، تباہی، توڑ پھوڑ مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ سامنے فرنانڈیز کی لمبی، چمکیلی امپالا کھڑی تھی۔ امپالا کے باہر کھڑکی کے ساتھ لگا ڈرائیور بڑے اِطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا، میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ مجھے اس امپالہ کو تباہ کر دینا چاہئے۔ پہلے اس کے سارے شیشے چکنا چور کر دینے چاہئیں۔ میں نے بڑی تیزی کے ساتھ سوچا، اور پھر ہر طرف پتھروں سے مار مار کے اس کا حلیہ بگاڑ دینا چاہئے۔ اس کی کھڑکیاں، چھت، ڈکی ـــــ سب کچھ توڑ پھوڑ دینا چاہئے۔ اس کا قیمتی انجن نکال کے اس کو ایک ٹوٹے پھوٹے کھلونے کی طرح سمندر میں ڈال دینا چاہئے۔ میرے ہونٹوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا غصہ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ میرے دل کا بوجھ بھی کچھ کچھ کم ہونے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اچانک میرے ذہن میں ایک نئی بات آ گئی۔ اور میں اچھل پڑا۔ مجھے بڑے اطمینان سے ٹنکی میں آگ لگانی چاہئے۔ پوری گاڑی جل کے تباہ ہو جائے گی۔ بہت اچھا طریقہ ہے اور یہ طریقہ میں نے ایجی ٹیشن کے دنوں سرکاری بسوں میں آگ لگاتے وقت سیکھا تھا۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ میں انجن کی ٹنکی میں آگ لگا دوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں کہ گنجی فرنانڈیز ماریا کو کس طرح گھر لے جاتا ہے۔ ساری تفریح کا مزہ چکھا دوں گا۔ کم بخت کو! میں نے غصّے سے زمین پر تھوک دیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنے قدم بڑھانے لگا اور کار کے

پاس پہنچنے لگا۔ ڈرائیور اب بھی کھڑا سامنے لگا۔ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں کار کے بالکل برابر میں کھڑا ہو گیا۔ میں ٹکٹکی باندھے کار کو دیکھتا رہا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے جیب میں ماچس نکالنے کے لئے ہاتھ ڈال دیے لیکن ماچس نہیں مل رہی تھی۔ میرا جوش جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے جیب سے ماچس نکال لی۔ گھبراہٹ میں وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ ڈرائیور نے اچانک گردن موڑ کے پیچھے میری طرف دیکھا اور میں کانپ کر رہ گیا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں ـــــــ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں جلدی آگے نہیں بڑھ گیا۔ تو یہیں پر بے ہوش ہو کے گر جاؤں گا۔ میں نے آگے بڑھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ اب کار میرے بہت پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھ لیا اور ایک گہری سانس چھوڑ دی۔

کار میں آگ لگانے سے کیا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔ ماریا اگر فرنانڈیز کے ساتھ چلی آتی تو اس میں بھلا کار کا کیا قصور ہے؟ ہاں! سارا قصور اس گنجے فرنانڈیز کا ہے۔ فرنانڈیز ہمارے آفس کا باس ہے۔ میں اس کے آفس میں ایک معمولی کلرک ہوں اور ماریا ایک اسٹینوٹائپسٹ۔ گنجا فرنانڈیز دن میں کئی بار کسی نہ کسی بہانے ماریا کو بلاتا رہتا ہے۔ اس میں ماریا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس کا باس ہے اور اس کا حکم بجا لانا ماریا کے لئے، اس کے گھر کے لئے اور اس کو اپنی نوکری کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی ضرورت۔ فرنانڈیز کئی کئی بار ایک ہی ڈرافٹ ماریا سے لکھواتا اور پھر پھاڑ دیتا ہے۔ دراصل وہ ماریا کو اپنے پاس زیادہ وقت بٹھانے رکھنا چاہتا ہے۔ اور ماریا مجبور ہے۔ فرنانڈیز کو خوش رکھے بغیر کوئی بھی آفس میں ایک دن نہیں ٹک سکتا ہے۔ مجھے پرمیلا یاد آگئی۔ وہ بیدھی

سادی، سنجیدہ سی لڑکی، جسے فرنانڈیز نے ایک مہینے کے اندر اندر جھوٹے الزامات لگا کر نوکری سے الگ کیا تھا کیونکہ اس نے فرنانڈیز کے ساتھ گھومنے پھرنے کی ہر دعوت اور پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ فرنانڈیز کو بڑی خوبصورتی اور شرافت سے ٹال دیا کرتی تھی۔ اور اسے نوکری سے علیحدہ ہونا پڑا تھا۔ فرنانڈیز بہت ہی کمینہ آدمی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ فرنانڈیز میرا اور میری خوشیوں کا بہت بڑا دشمن ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ فرنانڈیز ایک مکروہ اور راکھشس کی طرح لمبے لمبے دانت نکالے میری بے بسی پر ہنس رہا ہے اور میرا مذاق اُڑا رہا ہے۔ یہ کمینہ ہر ایک کی خوشیوں کا دشمن ہے۔ بدمعاش کہیں کا! مجھے فرنانڈیز کو ختم کرنا چاہیے۔ اس کو ختم ہونا ہی چاہیے۔—— فرنانڈیز —— میں نے بڑی تیزی سے پھر سوچنا شروع کر دیا۔ مجھے آہستہ آہستہ پھر غصہ آ رہا تھا۔ دماغ کی رگیں تن گئیں۔ نتھنے خود بخود پھڑکنے لگے۔ میں نے سوچا کہ میں بڑی تیزی سے ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ جاؤں گا۔ لانج کو پار کرتے ہی بال روم میں گھس جاؤں گا اور ایک ہی جھٹکے سے ماریا کو فرنانڈیز کی بانہوں سے الگ کر دوں گا۔ فرنانڈیز کو ٹائی سے پکڑ کر بال روم سے باہر کھینچ کے مکے مار مار کے اُس کے سارے دانت توڑ دوں گا —— میری مٹھیاں خود بخود کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ اور پھر اُسے نیچے گرا کے ٹھوکریں مار مار کے اُس کی ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔ میں نے غصے میں دانت پیس لیے۔ پھر —— پھر ایک زور کی ٹھوکر مار کے اُس کی ایک آنکھ بھی پھوڑ دوں گا اور اس کے مُنہ پر تھوکوں گا۔ میں نے غصے سے زمین پر زور سے تھوک دیا، اور ماریا میرے گلے سے لگ جائے گی۔ میری اپنی ماریا، میری اچھی ماریا —— ماریا۔ تصور ہی میں فرنانڈیز ایک مرے ہوئے چوہے کی طرح میرے سامنے پڑا تھا۔ اور میں بُری طرح ہانپ رہا تھا —— اور پھر —— پھر میں ماریا کو لے کر وہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ اور فرنانڈیز —— پھر وہ پولیس میں رپورٹ کرے گا، اور دوسرے ہی دن وہ مجھے نوکری سے بھی علیحدہ کر دے گا —— اور میں پھر بیکار ہو جاؤں گا

—— بے کار —— بے کاری کا خیال آتے ہی میرے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی —— مجھے اُن دنوں کی حالت یاد آگئی جب میں بے کار تھا۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ سارے جسم میں سرد سرد سی لہریں دوڑنے لگیں۔ اندر کا سارا طوفان شانت ہو گیا۔ شعلوں کی لو مدہم پڑ گئی، اور میں نے بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ سر جھکا کے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ خاموش، چپ چاپ، میرے دل پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ اور میں ماریا کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں آج بہت ساری باتیں سوچ رکھی تھیں۔ جو مجھے ماریا سے کہنی تھیں۔ اور میں اس وقت اکیلا اُداس سا ٹہل رہا تھا، اور وہ اُوپر ڈانس کر رہی تھی۔ بڑے مزے سے کسی کی باہوں میں تھرک رہی تھی۔ ماریا —— قصور —— زنانڈیز —— بوجھ ...... قصور تو زنانڈیز کا بھی نہیں ہے —— ؟ میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا، وہ بچارا تو قطعی بے قصور ہے، اُس کی کوئی خطا نہیں ہے سارا قصور اس کم بخت ماریا کا ہے۔ یوں ہی بڑی بھولی بھالی بنتی ہے۔ انوسنٹ ہونے کا پوز کرتی ہے۔ اصل میں یہ لڑکی کافی آوارہ ہے۔ حرافہ کہیں کی! وہ زنانڈیز کے ساتھ جانے سے انکار کر سکتی تھی۔ کوئی بہانہ تراش سکتی تھی۔ وہ کوئی تھوڑے ہی گود میں اُٹھا کے اُسے لے جاتا۔ آوارہ لڑکیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ کسی نے ذرا سی دعوت دی اور جھٹ تیار ہو گئیں۔ میرے سامنے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی خود اپنے ہاتھوں سے میرے بال بنا دیتی ہے۔ کبھی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتی ہے۔ اور کبھی اچانک میرے سینے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ جیسے مجھ سے بہت ہی پیار کرتی ہے۔ ہونہہ —— میں سب سمجھتا ہوں، وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ مجھ سے فلرٹ کرتی ہے۔ وہ —— وہ —— لیکن —— ؟ لیکن —— ؟ لیکن اندر ہی اندر میرے دل میں کوئی چیز اسی بات کو ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی میرے دل میں ماریا کے خلاف نفرت یا انتقام کا کوئی

جذبہ پیدا نہ ہو سکا، اور میں نے سگریٹ کو پیروں تلے زور سے کچل دیا۔
میں آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا سمندر کی لہروں کو گنتا جا رہا تھا۔ سمندر بہت وسیع اور پھیلا ہوا تھا۔ لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور چھپاک سے پھر سمندر میں منہ چھپاتی تھیں۔ پھیلا ہوا وسیع کالا سمندر۔ میں سارے کپڑے اُتار کے سمندر میں گھس جاؤں گا۔ اور بہت دُور تک سمندر کے اندر نکل جاؤں گا۔ کوئی بہت بڑی لہر آئے گی۔ اپنی باہوں میں جکڑ کے آہستہ آہستہ مجھے کھا جائے گی۔ صُبح ماریا سُنے گی۔ تو بہت روئے گی پچھتائے گی۔ لیکن پھر رونے اور پچھتانے سے کیا ہو گا ــــــ؟ سمندر مجھے نگل گیا ہو گا۔ پھر آہستہ آہستہ ماریا بھی مجھے بھُول جائے گی۔ ہو سکتا ہے۔ وہ گنجے زنانڈیسز کے ساتھ ہی شادی کرنے یا پھر جارج کے ساتھ جو اُس کا خاموش عاشق ہے۔ اور مجھے کیا ملے گا۔ کچھ بھی نہیں ــــــ میں مر جاؤں گا۔ مجھے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ نہیں! مجھے نہیں مرنا چاہئے۔ ایک لڑکی کے پیچھے بھلا میں اپنی جان کیوں دینے لگا۔ دنیا میں اتنی ساری لڑکیاں ہیں۔ تو میں ایک بے وفا لڑکی کے پیچھے کیوں مَرنے لگا۔ اب میں زرینہ سے دوستی بڑھاؤں گا۔ بچاری مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ لیکن مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولتی ہے۔ چپ چاپ مجھے گھورتی ہے۔ ڈھیر سارے تحفے چوری چھپے لا کے مجھ کو دیتی ہے۔ میری چھوٹی بہن ایلیا کو بلا کے اُسے پڑھاتی ہے۔ اسے ٹافیاں کھلاتی ہے۔ اور میرے بارے میں پوچھتی رہتی ہے۔ مجھے زرینہ کے پیار کی قدر کرنی چاہئے، اور پھر جب میں زرینہ کے ساتھ گھومنے پھرنے نکلا کروں گا تو ماریا حسد کے مارے جل جل جاتی ہو گی۔ اندر ہی اندر کڑھتی ہو گی۔ اور اُسی لمحے تصور ہی میں ماریا کی دو بڑی بڑی پھیلی ہوئی آنکھیں مجھے حیرت سے گھورتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اُس کا اُداس معصوم چہرہ ــــــ اُس کے کانپتے نازک ہونٹ ــــــ اُلجھی بکھری ایک لٹ ــــــ زرینہ ایک دم میرے دماغ سے محو

ہو گئی۔ نہیں! میں ماریا کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا کبھی نہیں —— ماریا میری اچھی ماریا ——

میں اب رو ہانسا سا ہوٹل تاج محل سے ذرا تھوڑی دور سمندر کے کنارے کھڑا، ہوٹل کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بہتی ہوئی رات تھم گئی تھی فضا میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ ساکت لمحوں کی کال کوٹھڑی میں قید میرا دم گھٹ رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر ڈانس ہو رہا تھا۔ دھنیں تیزی سے بج رہی تھیں۔ میرے دل پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ دھنیں بدل رہی تھیں۔ تانیں بلیٹی جا رہی تھیں۔ میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے تھے۔ مائک پر کچھ اناؤنس ہو رہا تھا۔ اب کوئی نئی دھن بجنی شروع ہو گئی تھی۔ شاید والز کی دھن بج رہی تھی۔ میں تصور ہی میں فرنانڈیز اور ماریا کو ڈانس کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ فرنانڈیز کا پورا بازو ماریا کی کمر کے گرد تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ماریا کا ہاتھ تھا۔ ایک دو —— ایک —— اب اُس کی ٹانگیں ماریا کی ٹانگوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایک دو، دو، ایک —— وہ ایک دوسرے کے سینے کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک —— ایک دو صرف اُن کے پیر ہل رہے تھے۔ ٹانگیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں، ایک دو —— فرنانڈیز اُسے زور سے بھینچ رہا تھا۔ ایک، ایک ......

وہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ ایک دو —— ایک دو ماریا کے جسم کی مہک، اُس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو —— ایک دو —— میری آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ میرا دماغ یخ بستہ ہو گیا تھا —— سینے میں زوروں کا درد اُٹھ رہا تھا۔ ہاتھ بے بسی سے لٹکے ہوئے تھے۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اُسی لمحے شاید بال رُوم کی لائیٹ آف کر دی گئی۔ اب فرنانڈیز نے اپنے ہونٹ ماریا کے ہونٹوں پر رکھ دئیے ہوں گے —— گدے پھٹے کالے موٹے ہونٹ۔

پتلے پتلے سُرخ ہونٹ ـــــ خونخوار کالا وحشی بھیڑیا ـــــ نازک سہما ہوا خرگوشش ـــــ اور خرگوش کی گردن میں پنجے گڑ گئے تھے۔ میں نے درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں اور وہاں سے ہٹ آیا۔

آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا گیٹ وے آف انڈیا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ بے بسی کے عالم میں سمندر کی طرف مُنہ اُٹھائے۔ میں آہستہ آہستہ ٹائی کی ناٹ کھولتا گیا اور میں نے پوری بندرہ سے خریدی ہوئی قیمتی ٹائی سمندر میں پھینک دی۔ بہت محنت سے سنوارے ہوئے بالوں کو تتر بتر کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ میری آنکھوں میں بیچارگی کے آنسو آ گئے اور میں سمندر کی طرف مُنہ اُٹھائے چپکے چپکے رونے لگا!!!

بشیر شاہ

محبُوبہ

عجیب سا آدمی تھا وہ، رات کے تیسرے پہر کی طرح چُپ چاپ اور پُر اسرار! کسی خوب صورت بیوہ کی سُونی سُونی مانگ کی طرح سُونا سونا اور خوف زدہ ایسا جیسے کوئی جنگلی ہرن کسی خونخوار درندے سے بچ بچا کر دُور کہیں جھاڑیوں میں پناہ گزین ہو گیا ہو! ——— اور پھر ایسے بھی کوئی اپنی زندگی اجیرن کرتا ہے۔ یوں بھی کوئی اپنا آپ کسی جان لیوا روگ کے سُپرد کرتا ہے......... وہ بھولا نہیں تھا۔ اُس شام کو' قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈوبی ہوئی وہ سرمئی شام جب اُس نے اپنے دِل کے تہہ خانوں میں ایک صاف و شفّاف سی جوت جگائی۔ ایک پاکیزہ سا دیا روشن کیا مہینوں مہینوں اور سالوں' دِل ہی دِل میں اِس چراغ کو فروزاں رکھنے کی کوشش کی۔ اپنی آنکھوں کا تیل ڈال کر، اپنے جسم کا لہو دے کر...... اور پھر یوں ہوا کہ ایک زور کی آندھی چلی، ہواؤں کا ایک ایسا جھکڑ چلا کہ وہ گھبرا گیا، سراسیمگی کے عالم میں اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چراغ کے گرد حصار کھینچا، ہاتھ جھلس کر رہ گئے۔ دامن میں چھپانا چاہا۔ پر وہ بھی شعلوں کی زد میں آ گیا اور بالآخر اس لرزتے ٹمٹماتے دئے کی ہانپتی کانپتی لو کا دم ہی ٹوٹ گیا۔ اور وہ تنہا تنہا سا لُٹا لُٹا سا، تھکا ہارا سا ماسا فر ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے اندھیروں میں ڈوب گیا

"ڈاکٹر صاحب!" دفعتاً نرس کی آواز نے مجھے چونکا دیا حالانکہ چونکنے کی کوئی بات نہ تھی۔ چونکتا تو میں اُس وقت بھی نہیں جب کوئی منت مسکراتا مریض دیکھتے ہی دیکھتے اپنوں سے اور دُنیا بھر سے آنکھیں پھیر لیتا ہے!!

"کیا بات ہے سسٹر ——؟ میں نے بیٹھے بیٹھے کمرے کے اندر سے ہی پوچھا۔

"آپ کو ڈاکٹر آنند صاحب یاد کر رہے ہیں۔ وارڈ نمبر ۶ میں کوئی نیا مریض ہے، اور سیریس ہے۔"

"او —— آئی سی۔" میں نے بادلِ ناخواستہ ناول میز پر ٹکا دیا۔ جانے کیوں میں ٹریجک ناول ایک ہی نشست میں ختم کرنا پسند کرتا ہوں مگر بُرا ہو اپنے اس پیشے کا جس میں کوئی بھی ٹائم ٹیبل کام نہیں کرتا۔ میں فوراً بستر سے باہر نکل آیا۔ کھونٹی پہ ٹنگی ہوئی بش شرٹ جلدی سے پہن لی۔ اسٹیتھسکوپ ہاتھ میں لے کر پاؤں میں سلیپر ڈال دئے اور دروازے کی کنڈی کھول کر باہر آیا۔ گھڑی کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بجا چاہتا تھا۔ اُس روز میری نائٹ ڈیوٹی بھی تھی۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی میں اپنے وارڈ کا گشت لگا چکا تھا اور مریضوں کو ضروری ہدایات بھی دے گیا تھا میں نے وارڈ نمبر ۶ کی طرف تیز تیز قدم اُٹھائے اور دل ہی دل میں سوچنے لگا عجیب سا پیشہ ہے، یہ اپنا پیشہ بھی، جانے کتنے لوگ رشک کرتے ہوں گے ہم ڈاکٹروں کی زندگی پر، لیکن انھیں کیا معلوم کہ ہم لوگ زندگی اور موت کے درمیان کی ایک ایسی کڑی ہیں کہ کبھی تو مسیحا کہلاتے ہیں اور کبھی کسی قاتل کا گماں گزرتا ہے ہم پر! کیسی بے بسی ہے کیسی بے کسی!!

وارڈ نمبر ۶ میں سناٹا سا تھا، ہر طرف مریض گھبرائے گھبرائے سے تھے اور نرس سہمی سہمی سی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر آنند اسٹیتھسکوپ لے کر نئے مریض پر

جھکا ہوا سا تھا۔ جو چارپائی پر لیٹا اپنی متفکر آنکھوں سے چھت کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ بے حس سا، انسانی جذبات سے عاری سا، جیسے زندگی اور موت دو الگ الگ چیزیں نہ ہوں جیسے زندگی کا سارا حسن موت کے دامن ہی میں سمٹ آیا ہو۔

"ڈاکٹر تمہارے وارڈ میں، میرا خیال ہے ایک سائیڈ روم ابھی تک خالی پڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں انہیں وہیں منتقل کر دیا جائے۔ اور پھر یہاں اس وارڈ میں مریضوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے، میں سمجھتا ہوں یہ DISTURBANCE ان کے لئے بہت ہی ہارم فل ہے۔"

"یہاں کب سے ہیں؟" میں نے ڈاکٹر آنند سے پوچھا۔

"پچھلے آٹھ دنوں سے ہیں اور مشکل یہ ہے کہ یہ کچھ کہتے نہیں، کچھ بولتے نہیں ——؟"

اور میرے ذہن میں ٹومس ناول کے ہیرو کی شبیہہ ابھر آئی ——!

"کل بڑے ڈاکٹر صاحب بھی جوائن کر رہے ہیں اور مجھے امید ہے وہ انہیں خوب سنبھالیں گے"، ڈاکٹر آنند کہنے لگا۔

اسی وقت بلا تاخیر میں نے وہیل چیر کی مدد سے اسے سائڈ روم میں داخل کرا دیا، بیڈ کور میلا سا تھا۔ میں نے چارپائی پر نئی سفید چادر ڈلوائی اور پھر نرس کو ہدایت دی کہ وہ فوراً پیتھیڈین کا ایک انجکشن لے کر آئے میں کھڑا کھڑا بہت دیر تک مریض کے بجھے بجھے سے چہرے اور بجھی بجھی سی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں انجکشن نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اس کی بے چینی کچھ کم ہو گئی۔ پلکیں بوجھل سی ہو گئیں اور دھیرے دھیرے وہ نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

اپنے کمرے میں واپس جانے سے پہلے میں نے وارڈ کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ سب ٹھیک تھا۔ صرف ایک مریض کے ہولے سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔

کمرے میں جاتے ہی میں نے کنڈی چڑھا دی۔ اسٹیتھسکوپ کو کھونٹی پر لٹکا دیا اور بستر میں گھس گیا۔ سگریٹ کی ڈبیہ سے سگریٹ نکالا۔ مگر سلگانے کے لئے تیلی نہ ملی۔ سگریٹ پینے کا خیال ترک کیا اور زور سے رضائی کھینچ لی۔ بجلی کی روشنی آنکھوں میں چبھ سی رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر بتی بھی بجھا دی ——— بہت دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ پر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نہ جانے کیوں ——— ؟ شاید ہر چیز وقت کی پابند ہے! گھڑی کے ڈائل پر لگے ریڈیم کی مدد سے میں نے وقت دیکھا دو بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے ——— جانے کیوں، ناول کے اس باب کی سطریں اور اس مریض کی شبیہہ بار بار نگاہوں کے سامنے ابھر رہی تھیں ——— !

دل کے مہلک مرض کے بارے میں طرح طرح کے سوالات ذہن کا احاطہ کرنے لگے۔ دل کا روگ اتنا عام کیوں ہو گیا؟ پہلے زمانے میں تو بڑے بوڑھے ہی اس مرض کا شکار ہوتے تھے۔ مگر اب یہ روگ نوجوانوں کو بھی نہیں بخشتا .... ؟ یہ روگ صرف بڑے آدمیوں کو ہی نصیب ہوتا ہے! .... عجیب عجیب سے سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے۔

دوسری صبح جب میں جاگا تو میرا سر بھاری تھا، دس بجے تک میں نہا دھو کر تیار تھا۔ سب سے پہلے میں اُس نئے مریض کے کمرے میں گیا، ایک عجیب سا تجسس تھا۔ وہ دو تکیوں کے سہارے چارپائی پر کچھ بیٹھا سا اور کچھ لیٹا ہوا سا تھا، میں نے اسکے چارٹ کی طرف ایک نگاہ دیکھا۔ نام جمیل تھا۔ اور عمر ستائیس سال ——— اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ میں نے کہا:

"کیا حال ہے جمیل صاحب آپ کا ——— ؟ اور جواب میں اُس نے مسکرانے کی ایک ناکام سی کوشش کی، جیسے کہہ رہا ہو ——— "کیا زندگی، کیا موت سب برابر ہیں ڈاکٹر!" میں اُس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ آنکھیں چھوٹی نہ بڑی پھر بھی خوبصورت اور پُرکشش، کچھ سوچتی ہوئیں، کچھ بولتی ہوئیں۔ بال بے ترتیب

لیکن اِس بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب تھی۔ ایک ایسا سلجھاؤ جو شاید اُلجھاؤ کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی جسے وہ ہر دو منٹ بعد کُجھاتا۔

"آپ کا ٹھکانہ کدھر ہے اور ــــ اور شغل وغیرہ ــــ ؟" میں نے ہمت کر کے اس سے پُوچھا!

"ٹھکانہ! ــــ اب شاید کہیں بھی نہیں اور شغل ــــ شغل تو بڑے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب" وہ میری طرف دیکھے بغیر، بہت خوبصورتی سے مگر بہت ہی نحیف آواز میں میرے سوال کا جواب ٹال گیا۔

"یہ بیماری کب سے آپ کے ساتھ ہے؟"

"میں بیمار کب نہ تھا ڈاکٹر!" اُس کا جواب سُن کر مجھے بے حد غصہ آیا لیکن جانے کیوں میں اِسے پی گیا۔

"اچھا آپ آرام کیجیے، بڑے ڈاکٹر صاحب آنے والے ہی ہیں۔ وہ آپ کا خود ہی معائنہ کریں گے، آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ فکر نہ کریں ــــ" میں نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ زیرِ لب مُسکرایا۔ اور اس کی بولتی ہوئی آنکھیں بولیں: ــــ جی کر بہت دیکھ لیا ڈاکٹر صاحب! اب زندہ رہوں تو کس لیے، کس کے لیے؟ ہو سکتا ہے اُس کی آنکھوں نے کچھ نہ کہا ہو۔ یہ سب میرے تخیل کا کرشمہ ہو یا ــــ پھر اُس ناول کا اثر!

اُسی دن بعد دوپہر بڑے ڈاکٹر صاحب نے جمیل کا پھر معائنہ کیا، اُس سے کئی سوال پُوچھے۔ جن کا جواب وہ بس ہوں، ہاں میں ہی دیتا رہا۔ آخر میں اُنھوں نے بلڈ پریشر دیکھا۔ خون کا دباؤ گھٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے MEPHENTINE نام کا انجکشن تجویز کیا اور اگلے روز ELECTROCADIOGRAPH کرانے کی ھدایت بھی دی تاکہ وہ اپنی تشخیص کی تصدیق کر سکیں۔

اُس رات بھر میری ڈیوٹی تھی۔ رات بارہ بجے اپنے وارڈ کا گشت

لگا کے ہیں جمیل کے کمرے میں گیا، سوچا اُس کی خبر بھی لوں اور بلڈ پریشر بھی نوٹ کر لوں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا مجھے دیکھ کر وہ ذرا بھی نہ ہلا بس ویسے ہی پڑا رہا۔ میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا ——"کیا حال ہے اب جمیل صاحب —— ؟" وہ زیر لب مسکرایا اور مسکراتے ہوئے اُس نے ہونٹوں کا ایک زاویہ بنایا کہ اب کے مجھے اُس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اُس کی ہنسی بھی سرگوشی کرتی ہوئی دکھائی دی —— "کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ زندہ ہوں اور ابھی تک متواتر سانس لے رہا ہوں!"

"ذرا اپنا بازو ادھر کیجئے، دیکھوں آپ کا بلڈ پریشر کیا ہے ——؟"

اُس نے کچھ کہے بغیر بازو میری طرف بڑھایا اور خود برابر چھت کی بیٹیوں کو گھورتا رہا —— میں نے خون کا دباؤ نوٹ کیا۔ اُس وقت حالت بہتر تھی مگر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مجھے پھر تشویش ہوئی۔ اس آدمی میں جینے کی کوئی چاہ، زندہ رہنے کی کوئی آرزو دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ وہ جیسے اپنے دن پورے کر رہا ہو، اور بس!

"آپ کے گھر میں اور کون ہے، میرا مطلب ہے آپ کی شادی ....؟"

اُس کی بے رُخی کے باوجود میں نے ایک اور سوال کیا —— اُس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں، مجھے اپنے سارے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے سارے وجود پر اُس کی آنکھیں حاوی ہیں۔ گھما پھرا کر اُس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور میری بات کا جواب دینے کی بجائے میری ہی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ وہ ایک منٹ میں اس خیال سے کھڑا رہا کہ وہ بولے گا، بس اب بولے گا مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے چارپائی پر کروٹ بدلی اور میں کھسیانہ سا ہو کے رہ گیا ——

اُس رات بھی جب تک نیند نے مجھے اپنی باہوں میں نہ لیا، میں اس

پُراسرار مریض کے بارے میں عجیب عجیب سے زاویوں سے سوچتا رہا۔ اس کے اگلے دن جب وارڈ نمبر ۱۲ کا وہ دوسرا مریض چل بسا تو میں یہ خبر سُنانے سید ھا جمیل کے پاس گیا جانتا تھا کہ میرا پیشہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ نفسیاتی باریکیوں کو مدنظر رکھ کر بھی یہ قدم غلط تھا مگر نہ جانے کیوں میں موت سے متعلق جمیل کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خبر سُن کر وہ خائف ہوجاتاہے یا نہیں۔ زندگی اور زندہ رہنے کی تڑپ اُس میں جاگتی ہے یا نہیں ——!

اور جب میں نے اُسے یہ خبر سُنائی تو وہ اپنے پلنگ پر سے ذرا بھی نہیں ہلا۔ بس اپنی نگاہیں میری آنکھوں میں ڈال دیں، مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں کی زبان ایک بار پھر کھُل گئی ہو اور وہ مجھ سے کہہ رہا ہو —— "کتنا خوش قسمت ہے مَرنے والا، ایک میں ہوں جس کے آگے موت بھی کترا کر نکلتی ہے"

دوسرے ہی لمحہ میں اس کے کمرے سے باہر آیا، نہ جانے اپنے انداز کا یہ واحد مریض کیوں میرے سارے حواس پر حاوی ہوگیا! دوسرے مریضوں سے نمٹ کر میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور رات گئے تک ایک رسالے کے اوراق الٹتا رہا۔ ٹھیک چار دن بعد اُس کا آپریشن ہونے والا تھا۔ ELECTROCADIOGRAM سے اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ دِل کے مرض نے اُسے بُری طرح جکڑ لیا ہے مگر آپریشن کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ٹھیک اگلی رات کے دو بجے جب میں نیند کی دُنیا میں گُم تھا نرس نے زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹایا میں بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا —— "آرہا ہوں سسٹر ——!" اُس سے کچھ اور سُنے بغیر میں سب کچھ سمجھ گیا، کمرے کی چٹخنی گرا کر میں دیوانہ وار سائڈ روم کی طرف لپکا ڈاکٹر آنند مجھ سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ وہ تین نرسیں سٹپٹائی سی پاس ہی کھڑی تھیں۔ اور وہ نیم بے ہوشی اور نیم غنودگی کے عالم میں اپنی اُدھ کھلی آنکھیں سے چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ خون کا دباؤ بے حد ابنارمل تھا جو ڈاکٹر آنند نے پہلے ہی نوٹ کیا تھا۔ بڑے ڈاکٹر صاحب کی ھدایت کے مُطابق انجکشن

بھی دیا جا چکا تھا ــــ دفعتاً وہ کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ اور میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ چارپائی پر اِدھر اُدھر ہلنے کی کوشش کر رہا ہے! اس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ کسی پر کٹے پرند کی مانند۔ حلق کی رگیں تن سی گئیں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ رہے تھے۔ میں نے سِسٹر سے پانی کے گلاس کے لئے کہہ دیا۔ وہ اب کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں اس کے پلنگ پر جھک گیا۔ اُس کا آخری وقت قریب تھا ــــ "محبوبہ ــــ؟" اس کے ہونٹوں پر کسی لڑکی کا نام تھا۔ جانے کون تھی یہ لڑکی ــــ؟ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بار بار اس نام کو دوہرا رہا تھا۔ ایسے جیسے کوئی پہلی کا طالب علم ہجے لگا لگا کر لفظ بنا رہا ہو۔ نرس پانی لائی۔ مگر پانی پلانے کی نوبت ہی نہیں آئی! وہ اپنی محبوبہ کا نام ہی گھول گھول پی گیا تھا۔ بہت ہی نحیف آواز میں رُک رُک کر اُس نے ایک بار پھر "محبوبہ" کہا اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا ــــ

ڈاکٹر آنند نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جیسے کہہ رہا ہو مرنے والا کتنا پیار کرتا ہوگا اس لڑکی سے، اور میری نگاہوں کے سامنے اُس ناول کا ہیرو اُبھرنے ڈوبنے لگا!!

شبنم قیوم

آنکھیں

"نہیں نہیں ـــــ ایسا نہ کہئے ڈاکٹر صاحب ـــــ میں آپ کے پیر پڑتی ہوں۔ آپ مجھ پر یہ احسان کیجئے ڈاکٹر ـــــ"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے کیا ـــــ"

"ہاں ڈاکٹر۔ میرا دماغ ٹھیک ہے ـــــ صرف میری آنکھیں...... خُدا کے لئے آپ میری یہ آنکھیں نکال دیجئے۔"

"میں نے ایک بار کہدیا ہے۔ مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا ـــــ" آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ میں آپ کو مجبور کر رہی ہوں پھر آپ کو اس میں اعتراض کیا ہے ـــــ ؟"

"تم اپنی یہ آنکھیں نکالنا کیوں چاہتی ہو۔ آنکھوں کے بغیر تُم جیو گی کیسے؟"

"اس کی آپ فکر نہ کیجئے ـــــ" ان آنکھوں کے بغیر میں جیوں گی اور اچھی طرح جیوں گی۔ مجھے اِن آنکھوں کی کوئی ضرورت نہیں جنہوں نے مجھے قدم قدم پریشان کر دیا ہے۔ جنہوں نے مجھے اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔"

"عجیب عورت ہو تم ـــــ مجھے یقین ہے۔ تمہارا دماغ ٹھیک نہیں۔"

"غلط، ڈاکٹر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے دماغ کو کچھ نہیں ہوا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اگر تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ تو پھر تم اپنی آنکھیں نکلوانا کیوں چاہتی ہو۔؟"

"ڈاکٹر! جن آنکھوں کے نکالنے کے لئے میں آج آپ کے سامنے منت سماجت کر رہی ہوں۔ یہی آنکھیں نہ نکالنے کے لئے میں کبھی روئی ہوں۔ گریہ و زاری کی ہے مگر......... سب بے سُود۔"

"— تو کیا...... کیا تمہاری آنکھیں کبھی نکالی بھی گئی ہیں۔"

"— ہاں اُن دِنوں میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد ہے، میں اپنے والدین کے ساتھ میلہ دیکھنے گئی تھی۔"

"کون میلہ —— ؟

"مجھے یاد نہیں ——"

"کیوں —— ؟"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں، اس وقت میری عُمر کیا ہوگی —— ؟"

"لگتی تو تم پچاس برس کی ہو، لیکن .... تمہاری عُمر تیس پنتیس سال کے درمیان ہوگی۔"

"اگر تیس ۳۰ مان لیا جائے تو آج پچیس ۲۵ سال قبل جب میری عُمر صرف پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نہ جانے اپنے ماں باپ کے ساتھ کہاں کون سا میلہ دیکھنے آئی۔ البتہ یہ بات یاد پڑتی ہے کہ اُس میلے میں ہم ایک جگہ بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے کہ میری نظر ایک غبارے والے پر پڑی اور میرا دل ایک رنگین غبارہ لینے کے لئے مچل گیا۔ میں نے ماں سے غبارہ لینے کے لئے پیسے لئے اور غبارے والے کے پیچھے دوڑی بھاگی —— کچھ دور جاکر میں نے اسے جالیا۔"

"پھر کیا ہوا —— ؟"

"غبارہ لے کر میں خوشی سے اُچھلتی کودتی واپس آرہی تھی کہ ایک شخص نے جھٹ گود میں لے کر مجھے بیٹی کہہ کر چوما اور میرے ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ تھما دیا۔"

—— یہ کون شخص تھا! میں اسے تب جانتی تھی نہ اب جانتی ہوں۔

اُس نے مجھ سے اور باتوں کے علاوہ میرے ماں باپ کے بارے میں بھی پوچھا کہ وہ کہاں ہیں، اور کیا کر رہے ہیں۔ جب میں نے اُس کی باتوں کا صحیح صحیح جواب دیا تو اُس نے مجھے اپنے بیٹے سے ملانے کے لئے کہا۔ کافی دُور پہنچ کر اُس نے مجھے ایک کار میں بٹھا دیا۔۔۔ جس میں دو آدمی ایک چھوٹے بچّے کو مٹھائی کھلا رہے تھے۔ جونہی میں اس کار میں بیٹھ گئی کار پھُر سے چل دی ــــــ میں چلائی تو میرا مُنہ بند کر کے مجھے اُس چھوٹے لڑکے کے ساتھ سیٹ پر لِٹا دیا گیا اور نہ جانے کہاں لے جا کر ہم دونوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔"

"پھر کیا ہوا ــــ؟"

"دوسرے تیسرے روز اُنھوں نے ہمیں ٹرین میں بٹھا کر نہ جانے کہاں اور کِدھر بھیج دیا ــــــ اپنے قبضہ میں کرنے کے چند روز بعد اُنھوں نے لڑکے کے بازو اور ٹانگیں توڑ دیں اور میری آنکھیں نکال دیں۔"

"اُف ...... تو! پھر کیا ہوا ــــ؟"

"اس درد سے جب میں سنبھل گئی تو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا کر مجھے بھیک مانگنے کا سبق سِکھا دیا ــــ"

"تُم نے کیا کیا ــــ؟"

"میں دو تین دِن بھکاریوں کے قبضے میں گلی گلی سڑک سڑک (اندھی بیٹی کا ایک پیسے کا سوال ہے بابا) پکارتی رہی اور زندگی کے یہی راستے طے کرتے ہوئے بڑی ہو گئی۔"

"تُم نے کِسی کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کیا ــ؟"

"میرے ساتھی جو سائے کی طرح اپاہج بن کر میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ مجھے کسی کے سامنے بھی اپنی رُوداد سنانے نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی کئی بار میں نے اس کی کوشش کی مگر ــــــ مگر مجھے اس کی کڑی سزا بھگتنی پڑی، اُس کڑی سزا کا آج بھی تصوّر کرتی ہوں تو کانپ اُٹھتی ہوں۔"

"کیا کیا اُنہوں نے تمہارے ساتھ ؟"

"ایک بار ایک عورت نے مجھے پیسے دیتے ہوئے میرے ماں باپ کے بارے میں پوچھا۔ میرا دِل بھر آیا۔ میں اُس سے اپنی روداد کہنے لگی تھی کہ مجھے فوراً وہاں سے کھسکا دیا گیا اور ٹھکانے پر لے جا کر مجھ پر کوڑے برسائے گئے۔ اور کئی دِنوں تک میرا دانہ پانی بند کیا گیا۔ ایسے ہی واقعے جب چند ایک بار پیش آئے تو میں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔ اُنہوں نے مجھے جس طرح چاہا استعمال کیا۔ میں دِن کو اندازے کے مطابق پانچ آٹھ روپے کماتی تھی۔ لیکن کھانے کو مجھے روکھی سوکھی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا ——— میری جیسی دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کی کمائی پر یہ لوگ بڑے بڑے کاروبار کرتے تھے۔ عیش کرتے تھے۔ اور ہم .... مشرق، مغرب، جنوب و شمال گھومتے گھامتے اپنا دھندا کرتے۔ اپنی زندگی گذارتے رہے۔"

"اُس گروہ سے پھر تم کیسے چھوٹ گئیں ——— ؟"

"اسے آپ ایک اِتفاق سمجھئیے ڈاکٹر! ہماری ایک جماعت کو دھندا کرنے کے لئے کشمیر بھیجا گیا۔"

"اچھا ——— تم نے کشمیر بھی دیکھا ہے۔"

"کاش اُن دِنوں میری آنکھیں ہوتیں۔ جن دِنوں میں کشمیر میں تھی ——— ویسے میں اُس کشمیر کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ جس نے مجھے اُس گروہ سے آزادی دلائی ——— کشمیر میں دھندا کرتے ابھی ہمیں کچھ ہی دِن ہوئے تھے کہ وہاں کی پولیس نے تمام بھکاریوں پر چھاپہ مار کر اُنہیں گرفتار کرکے بیگر ہوم بھیج دیا ——— اس طرح کوئی پچیس ۲۵ سال کے بعد مجھے اپنے ساتھیوں سے علیحٰدہ کرکے زنانہ وارڈ میں رکھا گیا۔"

"وہاں تم نے کیا کیا ——— ؟"

"ہر کوئی بھکاری اور بھکارن وہاں اپنا کام کرتا۔ اور اس کے عوض میں مفت کھانا اور پہننا ملتا تھا۔ ایک روز میں بیمار ہو گئی۔ مجھے بیگر ہوم کی

ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ جہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے میری بیماری کے ساتھ اِن آنکھوں کے بارے میں بھی پوچھا ——— میں نے اُسے اول سے آخر تک اپنی ساری روداد بتائی۔ میری زندگی کا المیہ سُن کر اُس کا دِل بھر آیا۔ دوسرے روز پولیس نے میرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے عدالت میں انکا چالان کر دیا۔ بدقسمتی سے اصلی سرغنے ہمارے ساتھ وہاں نہیں تھے۔ اِس لئے وہ صاف بچ گئے۔ لیکن اُن کی تلاش اب بھی جاری ہے۔"

"پھر کیا ہوا ——— ؟"

"میں بیگر ہوم میں اپنی بقیہ زندگی گذار رہی تھی کہ مجھے نئی آنکھیں لگانے کے لئے یہاں بھیجا گیا۔"

"اچھا یہاں آ کر تمہاری نئی آنکھیں لگ گئیں۔ لیکن تم انہیں نکلوانا کیوں چاہتی ہو ——— ؟"

"ڈاکٹر! ان آنکھوں نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔ بڑی اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ میں حیران ہوں۔ جو بات میں سوچ نہیں سکتی، وہ میں آنکھوں سے کیسے دیکھتی ہوں۔ میری سوچ اور نظر میں اتنا تضاد ہے کہ میں قدم قدم پر چونک اُٹھتی ہوں۔ پچیس ۲۵ برس سال کی تاریک، اور گھناؤنی زندگی میں میں ایک محدود دائرے میں پلی بڑھی ہوں۔ مجھے اپنے سماج، قوم اور مُلک کا بالکل پتہ نہیں ——— میں کسی کو بھی نہیں جانتی نہ جاننے کی ضرورت ہے۔"

"ہوتا کیا ہے تمہیں ——— ؟"

"مجھے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی ——— اظہار کروں گی تو تشریح نہیں کر سکتی۔ آپ یہ جان لیجئے اگر میرا دل اپنے آپ کی فکر کرتا ہے کہ میں کیسے جیوں تو میری یہ آنکھیں مجھ کو چھوڑ کر ملک کی فکر میں پریشان ہو جاتی ہیں۔ دِل اور نظر کے اِس تضاد کو دیکھ کر میرا دماغ ماؤف سا ہو جاتا ہے۔ میں سب کچھ بھول کر ایک چھوٹے سے خستہ حال کمرے میں بیٹھ کر اپنے

بارے میں سوچتی ہوں تو میری نظر پرواز کرتے کرتے بیک وقت ماسکو، نیویارک
لندن، پیکنگ، پیرس ٹوکیو وغیرہ جیسے مقامات پہنچ جاتی ہے۔"
"ایسا کیوں ہوتا ہے ۔۔ ؟"
"اتنا ہی ہوتا تو کوئی بات بھی تھی ڈاکٹر ۔۔۔ ! خیالوں ہی خیالوں میں
دنیا میں گھوم پھر کر جب میں سب کچھ بھول کر سوجانا چاہتی ہوں تو فوراً ذہن
سے بغاوت کر کے میری یہ آنکھیں آپ ہی آپ بنگال۔ راجستھان۔ پنجاب
آسام۔ کشمیر۔ بہار۔ کیرالا اور دوسری ریاستوں میں پہنچ جاتی ہیں اور
وہاں کے بدلتے حالات دیکھ کر مجھے رات بھر پریشان کرتی رہتی ہیں۔"
"کیوں ۔۔۔ ؟ آخر کیوں ؟"
"یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں ۔۔۔۔ میں اپنی حیثیت کے چند
لوگوں سے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں بننا چاہتی ہوں۔ تو میری نظریں ایکدم
ملک کے بڑے بڑے لیڈروں اور سیاستدانوں پر جا کر ٹھہرتی ہیں۔ میں اپنا مسئلہ
حل کرنا چاہتی ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے فوراً غیر ملکی مسائل آجاتے ہیں۔ اسی
طرح الجھنوں اور پریشانیوں میں گھر کر راہِ فرار اختیار کر کے بچ نکلنا چاہتی ہوں
تو میری نظر پھر دل اور دماغ کو دھوکہ دے کر چلی جاتی ہے۔ اور وہاں سے کیا کچھ
دیکھ کر آتی ہے۔ اگر میں اس کا اظہار کروں گی تو ایک انقلاب آجائے گا جس
سے سارا ملک درہم برہم ہو سکتا ہے۔"
"پھر تم کیا کرتی ہو ۔۔۔ ؟"
"میں کر بھی کیا سکتی ہوں ۔۔۔ میں سب کچھ بھول کر اپنے لئے ایک چھوٹا
سا گھر بنانا چاہتی ہوں۔ یکایک میری نظروں میں بڑی بڑی عمارتیں۔ بڑے بڑے
ڈیم، کارخانے اور فیکٹریاں آجاتی ہیں ۔۔۔۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر میں
اپنے جیون ساتھی اور اپنے بچوں کا تصور کرتی ہوں تو میری نظر میں ملک کے لاکھوں
اور کروڑوں لوگ آجاتے ہیں۔ اس طرح میری سوچ، میرے خیالات اور میرے

ارادوں کے ساتھ میری نظر کوئی اتفاق نہیں کرتی۔ میرا جو دل چاہتا ہے نظر وہ مانتی نہیں۔ یہاں تک کہ میں پاگل ہو گئی ——— اگر جلد میری یہ آنکھیں نہیں نکال دیں گے تو میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔"

"تم گھبراؤ نہیں۔ میں سب سمجھ گیا۔ تمہاری یہ آنکھیں نہیں نکالی جائیں گی بلکہ تمہارے دل و دماغ کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ اِن نظروں کا بار سہ سکیں۔ اگر تمہارے دل اور ذہن نے تمہاری نظروں کا بار واقعی سہہ لیا تو سارے ملک کے لئے یہ نیک فال ہے۔ کیونکہ اس ملک کو ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے جس کی آنکھیں تمہارے پاس ہیں۔"

"کس کی ہیں یہ آنکھیں ڈاکٹر ———؟"

"میں بتاؤں گا۔ لیکن تم مچلنا نہیں ———" وہ دیوار پر تم کیلنڈر دیکھ رہی ہو۔"

"ہاں! اس پر ایک عورت کی تصویر ہے جس کے سر پر گھنیرے سیاہ بال ہیں لیکن دائیں جانب ماتھے سے ذرا اُوپر سفید بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا ہے۔"

"بہت دِن ہوئے اس ملک کی باگ ڈور اِسی عورت کے کاندھوں پر تھی۔ اُس نے اپنی زندگی میں یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں EYE BANK کو دے دی جائیں تاکہ یہ کسی اندھے کے کام آسکیں ...... اس کے مرنے کے بعد ملک کی جو حالت ہوگی تم اُسے اِن ہی آنکھوں سے دیکھو، اور اپنے آپ کو ان ہی حالات کے سانچے میں ڈھال کر اپنے آپ کو تیار کرو کیونکہ تمہیں ایک بہت بڑا کام انجام دینا ہے۔ اُٹھو، اپنے دل کو مضبوط کرو، اور اپنے آپ کو ....

میں نے کہا۔"تم یہ نیند میں کیا بڑبڑا رہے ہو ——؟"

"اوں .... ہونہہ! ہم ...... میں کہاں ہوں؟"

"تم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے ــــ؟"

"ہاں! میں ایک خواب دیکھ رہا تھا ــــــ ہندوستان کے مُستقبل کا ــــــ؟"

جب سے تم آئی بنک کے ڈائریکٹر بن گئے ہو تم ایسے ہی خواب دیکھا کرتے ہو ــــ"

"دیکھو میری بات سنو ــــ جو اندھی بھکارن یہاں اکثر بھیک مانگنے آتی ہے اگر وہ آج بھی آ گئی تو اُسے تم میرے پاس ہسپتال بھیج دینا۔ اُس کے لئے آنکھیں میرے پاس آ گئی ہیں"

"اچھا ــــ کس کی ہیں وہ آنکھیں ــــ؟"

"اوہ! مجھے معاف کرنا۔ ابھی آنکھیں نہیں آئی ہیں صرف اُن آنکھوں کے بارے میں وصیت آ گئی ہے۔"

حسن باہو

ایسٹرن کلب

فضا خاموش تھی
تاریک رات کے سیاہ فام سائے پھیل رہے تھے! دسمبر کی کی آخری رات تھی لیکن ایسٹرن کلب کے سامنے مکون تاریکی اور سردی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کی بسیط گود میں شور و غل۔ ضیا پاشی اور حرارت کی شمعیں اب بھی آب و تاب سے روشن تھیں .... اور روشنی پھیلانے میں پیش پیش تھیں۔
آس پاس کی ساری دنیا سونے پر ایسٹرن کلب کی دنیا جاگتی ہے۔
بادل چھٹ گئے
اندھیرا غائب ہو گیا۔
اور آن آن میں ہر سو چاندنی کے سائے منڈلانے لگے۔
کلب ہال کے وسطی گوشے کے ڈائس پر پیانو۔ بربط۔ نقارہ اور دیگر جدید طرز کے اسباب موسیقی نئے ساز نئے سریلے اور دھیمے دھیمے راگ الاپ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے میٹھے میٹھے سرود کی مستی ورپل آمیزی کلب ہال کی وسعتوں میں بکھر گئی .... اور آناً فاناً تمام

رعنائیوں سے مزین رونق افروز ہوئی۔ اس کی اہم عُریاں بھری بھری باہوں اور پریشان زلفوں کے مقابل شاخ سنبل اور برسات کی کالی رات ہیچ تھی۔

ہال میں خاموشی چھا گئی، ہر ایک کی نظروں کا مرکز شہہ نشین بنا تھا۔ جہاں آشالتا کی انگلیاں پیانوں پر ناچ رہی تھیں۔

آشا جوان تھی۔ اس کی جوانی کی طرح اس کا رقص بھی جوان تھا۔ اس کی ہر تھرکن ہال کے ہر ذرّے پر رعنائی و دلکشی کے نقوش بکھیر رہی تھی۔ سبز مہر بوتلوں کے کاگ اُڑ رہے تھے۔ گلاس اور جام ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ مرغ مسلم کی تاشیں بانٹی جا رہی تھیں اور گوشہ دوست میں باون پتوں کی اُٹھک بیٹھک ہو رہی تھی۔

موہن حسب عادت ہال کے درمیانی گوشے میں تسلط جا گیا........ بغیر بکوڑا منہ میں ڈالے کافی کی بھرپور چسکی لئے وہ آشالتا کے اُٹھنے بیٹھنے، سینے اور کتابی چہرے کے زیر و بم کا جائزہ لینے لگا اور پھر ایک گھناونی نظر کلب کے مکینوں کی طرف ڈال دی........ اس سرے سے اُس سرے تک تاکہ عجب سا لگا اُسے .... ہر طرف خوشی........ مسرّت .... شادمانی.....

.... جام ٹکرا رہے تھے اور خالی ہو رہے تھے۔ موہن نے کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا۔

رقص .... نغمہ .... شراب .... اور پھر گرنا سنبھلنا۔

موہن کو محسوس ہوا جیسے یہ ہال شراب کا ایک جام ہے۔ لحظہ بہ لحظہ اس جام میں دنیا سما گئی ساری دُنیا........ پوری کائنات اور ہزاروں کروڑوں انسان کیڑوں مکوڑوں کی طرح اس جام میں تیرنے ڈوبنے لگے........ باپ کی شفقت ڈوب رہی تھی۔ پتی کا وچن و پیار غرق ہو رہا تھا۔

فرائض کی مورتیاں غوطے کھا رہی تھیں۔

اور وشواس کے بھرم خس کی شکل اختیار کر گئے۔ اِدھر اُدھر تیر رہے تھے
"موہن ۔۔۔ کہاں کھو گئے ہیں آپ "
جام نظروں سے اور پھر ہاتھوں سے گر گیا۔ گر کر چکنا چور ہو گیا۔۔۔
.... اور دنیا سمٹ گئی۔ اب ہال تھا، اور موہن کے مقابل آشا لتا ۔۔۔۔
وقفہ ہو چکا تھا اور گئی چند راتوں کی طرح آج بھی لتا موہن کے پاس آ بیٹھی۔
.... اصیل نے مخبری کر لی تھی، اور آشا لتا موہن کی بابت اتنی جانکاری حاصل کر گئی تھی کہ وہ شہر کا بلند پایہ کہانی کار ہے .... اسے اگر نفرت ہے تو دو چیزوں سے، سگریٹ اور شراب سے اور رغبت کافی کے ساتھ۔ اتنا بھی جان چکی تھی کہ موہن جیسی حسن پرست ہے۔ حسن اور خوبصورتی کو پوجنا اُس نے اپنا شعار بنا لیا ہے .... یہ خوبصورتی اور حسن اُسے چاہے اِنسان میں ملے یا حیوان میں .... نخلستانوں میں ملے یا اجنتا کے پتھروں میں۔ کلیوں میں دستیاب ہو یا کانٹوں میں۔
"موہن تم سوچ کیا رہے ہو ۔۔۔ ؟"
آشا ایک بار پھر قفلِ سکوت توڑتے پھلتے پھلتے آپ کی جگہ تم اپنا گئی۔
"سوچ رہا ہوں یہ دُنیا دوسروں کے لئے کتنی دل کش اور حسین ہے، اور اپنے لئے کس قدر پھیکی اور بے جان ۔"
"موہن تم خوبصورت تصوّرات اپنانے پر کھنے کی سعی اپناد ۔۔۔۔ دُنیا تو دنیا تمہیں اس جگہ بھی دِل کشی اور خوبصورتی نظر آئے گی۔ سب کچھ حسین لگے گا۔ میری جانب دیکھو۔"
"تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں حسین سمجھوں"۔ موہن بے تامل کہہ اُٹھا۔
"کیا میں حسین نہیں ۔۔۔ ؟" آشا لتا نے لہجہ بِاستفسارانہ پیدا کئے گویا ہوئی اور بئیر کا آدھا بھرا گلاس اُس کے ارغوانی ہونٹوں کے ساتھ چسپاں ہوا۔

"تم .... تم تو مصنوعیت کی مورتی ہو، جو تصنّع کے سنگلاخ پر بناوٹی حربوں کے استعمال سے تشکیل دی گئی ہے۔ تم اور تمہارے حسن میں حقیقت اور اصلیت کو دخل نہیں۔"

موہن برس پڑا ـــــ

"موہن تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ہزار ہا روشن تمقموں کی چمک کو تیاگ دئے تمہارے چھوٹے سے دئے کی لو کے قریب آ بیٹھی ہوں۔ اِس لئے کہ مجھے تمہارے پاس بیٹھنا اور تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں موہن تمہیں چاہتی ہوں۔"

"ایک مفلس کہانی کار کو جُل دینے سے تمہیں کیا ملے گا"۔ موہن کا احساس برتری جاگ گیا:

"میں سمجھتا ہوں کہ دولت وحشمت کے طاق پر تم رکھنے والی عورت کا دل کسی ایک کا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں دولت کی ضرورت اور چاہ ہے اور تم ہر چیز کو دولت و شہرت کے پیمانے سے ناپنے کی سوچتی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوگا .... ایسا میں کبھی نہیں ہونے دوں گا۔"

"نہیں موہن! نہیں تم نے مجھے غلط جان لیا ہے"۔ آفاقی کی آواز میں نجزدہ انکساری تھی!

"کیا اس میں صداقت نہیں کہ تمہیں ایک خوبصورت موٹر کار کی ضرورت ہے۔ عالی شان بنگلہ کی آرزو ہے اور پھر آسائش اور آرام کی چاہ ہے ـــــ یہ سب میرے پاس نہیں ہے .... تمہارے لئے سب کچھ پیسہ اور تمہیں دُنیا کی ہر چیز اس پیسے کی طرح گول دکھائی دیتی ہے۔ موہن یہ سب کچھ جانتا ہے۔"

"نرے بدھو ہو!"

آفاقی موہن کو خطاب بخشتے پھر سے ڈائس پر براجمان ہو گئیں

اور پھر سے کلب ہال میں نیلی جھلملی ساڑھیاں رقص کرنے لگیں۔

آشالتا کا رقص اور نغمہ ہائے دل نواز کلب ہال کی مضبوط دیواروں سے پھاند کے باہر نکل آیا اور آس پاس کے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔ ایک مختصر قیام میں آشالتا نے ہر معزز گھرانے کے نورِ چشم کو اپنی جانب متوجہ کر دیا۔ کلب ہال معمول سے بڑھ کر کچھا کھچ بھرنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر ہر ایک کی نگاہیں آشالتا کے جسم کے نشیب و فراز پر جم کر رہتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ دیکھتے تھے۔ سوچتے تھے، اور پھر اُٹھتے چلتے تھے۔

ایک منظر یہ ہال میں بیٹھے تمام حضرات کی توجہ کا مرکز بنی تھی مگر اُن سب سے بے نیاز و لاخبر خود منظر یہ کی توجہ کا مرکز موہن تھا جسے لوگ حقارت بھری نظروں سے تاکا کرتے تھے۔ بعض تو اتنا ہی کہہ گئے تھے۔

"اِس تلاش راہ پھیرے کا کلب میں کیا کام؟"

۔۔۔۔۔۔۔ اگلے روز موہن وقت سے پہلے ہال کی زینت کافی کی گرم گرم بھاپ سے بڑھا گیا، اور آشالتا سب معروفیات کا پلندہ طاقچے پر رکھے سیدھی موہن کے روبرو آ بیٹھی۔ کافی کا گرم گرم ایک اور کپ تیار کیے اُس نے موہن کی سمت بڑھایا۔

"لیجیے کہانی کار صاحب! نوش فرمائیے ـــــ" آشالتا کے لہجے میں طنز کو اس بار بڑا دخل تھا۔

"شکریہ! تم نے زحمت کیوں اُٹھائی۔" موہن نے کڑی نگاہوں کی مدد سے آشالتا کو جھانکنا شروع کیا۔ جو نیم عریاں پوشش میں ملبوس ایک قیامت سے کم نہ لگ رہی تھی۔

"آج کل کونسی کہانی لکھی جا رہی ہے۔" لتا نے موضوعِ سخن بدلنے کی غرض سے کہا۔

"کہانی! کچھ بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ زمانہ خود اپنی ہستی ایک کہانی لگ

رہی ہے۔" موہن نے بات کو ٹالنا چاہا

"موہن! تمہیں ہوا کیا ہے، جب دیکھو بہکی بہکی سناتے جاتے ہو۔ اس ایک ہال سے وابستہ تمہیں سینکڑوں کہانیاں مل سکتی ہیں۔ خود اعتمادی کی مشعل روشن کیے دیکھو اُن شرفا کی کہانی جو ماحول، معاشرے اور سماج کی چار دیواری کو پھاندے یہاں سب کچھ حتیٰ کہ اپنی عزت و آبرو لٹانے بھی آجاتے ہیں۔ وہ یہاں آکر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنا وقار، اپنی عظمت اور اپنا مرتبہ سب کچھ فراموش کر جاتے ہیں — موہن دیکھو میری طرف —— اِن آنکھوں میں —— ان میں جھانکنے اور گدازیوں میں کھنگالنے سے تمہیں بے وقت کہانیاں ہاتھ آگئیں —— میری کہانی لکھو —"

"تمہاری کہانی اور اس کلب ہال کی کہانی —— تم چاہتی ہو کہ میں زوال پذیر داستان کو الفاظ کی لڑی میں پرو کر صفحۂ قرطاس بکھیرے اپنے فن کے ساتھ ظلم کروں، اور کہانی کو بناوٹی قصہ کی صورت میں پیش کروں۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ ملمع آرائی کی نہج اپنانے میں حقیقت کی بیخ کنی کرنے سے رہ گیا۔" موہن بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"موہن تم چاہتے کیا ہو —— کیا یہ درست نہیں کہ میں حسین اور دل کش ہوں۔" تا کے ماتھے پر ترشی و تلخی کے آثار پیدا ہوئے

وہ تو سب کچھ ہوا۔ موہن متعدی پن اپنا گیا۔ مگر آرٹ لسٹ میں پیش منظر سے زیادہ پس منظر کا دلدادہ ہوں اور ظاہری لوازمہ و ملکیت سے قطع نظر روح کو پانے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ باور کر دیا نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان خوبصورت آنکھوں کے عقب میں دھنے کنڈرے اور حلقے پڑے ہیں۔ ان رنگیلے چمکیلے لبوں کے پیچھے (امتیازن ذارے) ڈھیرے جمائے بیٹھے ہیں اور ان حسین و اُبھرے رخساروں کی

جگمگ چکلے سمٹے گاؤں نے لی ہے ــــ تم پس منظر کا نظارہ کرنے سے رہ گئیں جب کہ ظاہری رنگ و روپ جانے سمجھنے سے ہی تمہیں فرصت نہیں ملتی نہ ہی تم نے کبھی ...."

"تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔ آشا لتا نے بات کاٹ کر! ....." تم نادان ہو جو دنیا کو نیچا دکھانے کی فکر میں خود نوک و زیاں کے بحر بیکراں میں جا گرتے ہو۔

اس سے قبل کہ موہن جواب میں لب ہلا دیتا کلب کے مالک ہر بھگوان داس اچھی قد و قامت رکھنے والے نوجوان کے ہمراہ نمودار ہوئے۔

یہ رہی اس کلب کی مشہور ڈانسر و سنگر مس آشا لتا، اور یہ ہیں میرے بیٹے سرجیت کمار ــــ آج ہی باہر سے اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" یہ سرجیت تھا۔

"خوب۔ یہ ہیں جناب کے فرزند ارجمند ..... ویل۔ ویل...گڈ" آشا لتا ہر بھگوان سے کہہ گئی اور انداز گرد کے ساتھ سرجیت کمار کو گھورنے لگی جیسے ایک اناڑی جیب کترہ پکڑنے پر سپاہی کے کمر بند سے ہتھکڑی کو اور گھورتا ہے۔ معاً لتا سامنے سے غائب ہوئی اور ذرا توقف کے بعد انگلیاں پیانو پر تھرکنے لگیں۔

اب تو وقفہ ہونے پر بھی موہن اکیلا رہا کرتا تھا۔ آشا لتا موہن کو چھوڑ کر سرجیت کے پاس بیٹھنے لگی ۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں دل چسپی لینے لگے اور بے تکلفی جتانے لگے۔ جوان ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں کی امنگیں جوان تھیں۔ اور پھر پینے پلانے کا شوق مشترکہ تھا۔ اس خاطر سریع الیحادی میں ہی وہ دونوں آپس میں اس قدر گھل مل گئے جیسے دیرینہ جان پہچان ہو اور باہمی تعلقات گہرے

اور شستہ ہوں .... یہ عُمر..... جوانی کا زمانہ۔ اس میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

ایک شام وقفہ کی پہلی گھنٹی بجتے ہی وہ ہشاش بشاش موہن کی بغل والی کرسی میں بیٹھ گئی۔ موہن کی نظریں جوکھا ماکے تنے ہوئے داتوں پر جمی تھیں اُٹھ پڑیں اور لتا کے اُتار چڑھاؤ کا تجزیہ لینے لگیں۔

"خوشی سے پھولے نہیں سماتی ہو۔ آج کوئی خاص بات ہے۔" موہن نے پہل کی۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے موہن! اب زندگی مجھے حسین جان پڑتی ہے۔"

"حسن اور زندگی۔ یہ آسودہ حال کلب اور زندگی حسین نہ لگے ...... اور پھر تمہارے لئے زندگی بے کیف کب تھی۔"

"موہن! تمہیں کسی ایک کی دل شکنی کا ذرہ بھر لحاظ نہیں رہتا۔" لتا کی آواز میں غیض اور عتاب کے مخلوط حرارت صاف اور عیاں تھی۔

"میں حق پر مبنی بات کا طشت از بام کردینا اپنا فرض مقدم مان گیا ہوں"...... موہن پُرزنار لہجے میں کہہ اُٹھا۔ "آشا لتا! میں مُنہ پھٹ ضرور ہوں مگر جو کچھ کہوں گا صحیح اور درست کہوں گا۔ اگر واقعی زندگی کی قدروقیمت کو جاننے سمجھنے کا اشتیاق تمہارے دل میں پیدا ہوا ہے تو پھر کلب ہال سے باہر نکل جائیے اور زندگی کا اصلی و حقیقی رُوپ دیکھئے۔ اس گندے جال میں پھنسے زندگی کی توہین کرنے کے مترادف ہوا ...... اس وقت تم نہیں بلکہ اس کلب کی خوش کن وکیف و سرور سے معمور آواز بول رہی ہے۔ اس کلب کی وقعت، رنگ رلیوں کو اپنی کائنات تصور کرکے اپنی زندگی پر ظلم نہ کرو ...... لتا یہ تمھے وقتی ہیں۔ انہیں گل ہونا ہے ...... اس کلب سے وابستہ ہر شے میں بے ثباتی مضمر ہے .... یہاں کسی

چیز کو پائیداری حاصل نہیں، بقا کا ساتھ نہیں۔"

موہن خود بخود خاموش رہا۔ پہلی نظر بھر سے اوپر کو اٹھی.... آشا لتا شہ نشین کی طرف بڑھ رہی تھی اور اپنے آنچل سے دیدوں کے ڈھلتے نشتک کر رہی تھی۔

آشا لتا کی مخمور جوانی مست کر دینے والے رقص اور دل پذیر نغموں نے اہلِ دل کے سامنے اس کی قدر و قیمت بڑھا دی اور ہر ایک اسے اپنے خوابوں کی ملکہ خیال کرنے لگا۔ بیشتر شریف زادے اس کی بدمست جوانی کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتے تھے........ نواب اجا بھی اس کی شان میں قصیدے سُنا گئے تھے اور تو اور خود کلب کے مالک ہر بھگوان داس کے مُنہ میں بھی لتا کی دوشیزگی دیکھ کے پانی بھر آیا تھا........ اور وہ چاہتا تھا ایک گھڑی وہ لتا کی آغوشِ محبت میں گذار دے۔ وقت گزرتا گیا اور چاہ بڑھتی گئی۔

بالآخر اس چاہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اُس نے اُٹھا لیا....... سب سے پہلے اپنے لاغر جسم میں پھیلی نسوں اور اعصاب میں تازہ رُوح پھونک دینے کے لئے اس نے بوتل کا کارک اُڑا دیا۔ پیگ پر پیگ چڑھائے ہر بھگوان داس بھول گیا کہ وہ اس کلب کا مالک ہے۔ ایک ممتاز شخصیت کے ناطے دُنیا اُسے یاد کرتی ہے اور جانتی ہے........ وہ اتنا بھی فراموش کر گیا کہ اس کی اپنی بیٹی لتا سے دو سال بڑی ہے........ گرتے سنبھلتے اور لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے بڑی رات گئے اُس نے لتا کے کمرہ شب باشی کا رخ کیا۔ جب کہ خود کلب کی دُنیا بھی تھکی سی بے سکت پڑی تھی۔ دروازے پر دستک دی اور آشا لتا نے اِس خیال سے کہ ماما ہو گی چٹخنی گرا دی۔

"آپ"

"ہاں لتا میں ہوں...... ہر بھگوان داس...... اس کلب کا مالک

...... آخر تمہارے حُسن کی کشش مجھے یہاں اُٹھا لائی۔ تم کتنی دل کش ہو۔ لتا میں تمہیں اور تمہارے رقص کو اکیلے ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ خلوت اور تنہائی میں بیٹھ کر جہاں تم ہو اور میں اور کوئی نہیں۔ میں تمہارے نغموں کو صرف اپنے لئے ملفوف پردوں پر محفوظ رکھنا چاہتا ہوں ...... میں نے کب سے چاہا کہ تمہیں اپنے حال سے باخبر کردوں۔ لتا تم بھاگتی کیوں ہو، پاس آؤ ــــ دیکھو یہ دل لگی اچھی نہیں ــــ یہ مذاق ...."

ہر بھگوان کی زبان کام کر رہی تھی اور لتا حیران و ششدر کھڑی مجسمہ حیرت بنی تھی۔ وہ کچھ ترکیب عمل میں لانے والی ہی تھی کہ ہر بھگوان داس نے بڑے بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ کمرہ روشن ہوا۔ تپائی پر سجے ٹیبل لیمپ کی رنگین و مدہم کرنیں اس روشنی میں مدغم ہوئیں اور ہر بھگوان داس کی بے سدھ سی نگاہیں کمرے کا طواف کرنے لگیں۔ اینجا آنجا دیکھنے گھورنے پر اُس کی بے ترتیب نظریں بغل میں پڑے پلنگ پر جم کر رہ گئیں .... اُس کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ہوش و حواس کی متوازن جھیل میں تلاطم برپا ہوا اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی .... اُس نے پھر جھانکا۔ پلنگ پر مست خرام اُس کا سرجیت پڑا تھا ــــ ہر بھگوان کے قدم لڑکھڑائے۔ سر چکرا گیا ...... اور کچھ کہے بنا واپس چلا آیا .... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان گنگ پڑ گئی۔ اُس کے احساسات کے تختے پر جیسے کسی نے کوفت و کرب کے تیروں کی چاند ماری کی ہو۔ اس کا جنون اور نشہ کافور ہو گیا۔

صبح صادق یہ خبر شہر کے ہر چھوٹے بڑے بوڑھے پر بحث و تمحیص کا موضوع بن چکی تھی کہ مس آشا لتا اور سرجیت کمار فرار ہو گئے ہیں۔

قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ چہ میگوئیاں اپنائی گئیں۔ لیکن اسکے باوجود بھی سب لوگوں کے لئے اُن دونوں کا اچانک غائب ہونا ایک معمہ بنا رہا .... اور اس معمہ کا عقدہ اُس گھڑی وا ہوا جب کہ موہن

کو دوسرے شہر سے غیر متوقع طور پر آشا لتا کا نامہ موصول ہوا۔ نفسِ مضمونِ مراسلہ کچھ اس طرح کا تھا ——

نمستے

میں آپ کی لتا ہوں یاد ہے۔ ایک بار نہیں بسا اوقات کلب ہال میں آپ نے مجھے کئی طرح سے ٹوکا تھا۔ اور مطلع کیا تھا۔ کہ میں گندے ماحول میں مقید پڑی ہوں .... سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں —— کہا تھا کہ میں مصنوعیت کے کھڈ میں پڑی ہوں جہاں حقیقت کا نام ونشان ملنا غیر ممکن ٹھہرا ....

اب میں اس جال اور کھڈ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سے الگ کر بیٹھی ہوں۔ اتنی دُور آنکلی ہوں کہ اس جال یا کھڈ کی پرچھائیں بھی میرا تعاقب نہ کر سکیں گی۔ یقین کیجئے میں اِس گندی اور پُر از بناوٹ نگری سے سدا کے لئے ناطہ توڑ چکی ہوں .... اور ایک ایسی دُنیا میں آئی ہوں جہاں زندگی اور اپنی کائنات کو اصلی اور ازلی رُوپ میں دیکھ رہی ہوں .... اپنے پتی سرجیت کے ساتھ میری ہنسی خوشی کٹ رہی ہے۔

التجا کرتی ہوں، اب جب کہ گندے جال سے وابستگی نہیں رہی کم از کم میری کہانی شائع کر دیجئے۔ اب تو آپ کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہئے۔

آپ کی

لتا

موہن خط کو ایک بار چھوڑ کئی بار پڑھ گیا .... انگشتِ شہادت دانتوں میں دبائے سوچنے لگا:

لتا کو سرجیت مل گیا .... سرجیت کو منزل حاصل ہوئی ...

...... اور میں اتنا برگشتہ بخت ٹھہرا کہ منزل کو لپنے قرین پانے پر بھی حاصل نہ کرسکا۔

دیکھتے دیکھتے ہزاروں لتائیں موہن کے روبرو منڈلانے لگیں .... رقص کرنے لگیں .... اس کی کائنات میں وجد آگئی۔ وہ غیرارادی طور چلا اُٹھا۔

کاش مجھے بھی ایک لتا مل جائے .... جسے خوبصورت موٹر کار کی ضرورت نہ ہو......... عالیشان بنگلہ کی ضرورت نہ ہو۔ کاش مل جاتی، اور میرے غریق ظلمت ماحول میں اُجالا بکھر دیتی ؛

عُمر مجید

گونگے گلاب

گُل دو دِن سے غائب تھا اسی لئے ساجد بے حد اُداس تھا۔ اُس کی اُداسی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ آج صُبح سے ہی اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹتا چلا آرہا تھا ——!

ساجد اچھی طرح جانتا تھا کہ جس روز اُس کا باپ گھر دیر سے لوٹتا تو اُس کی ماں کو ضرور پیٹتا —— اور یہ سب کچھ وہ تب سے دیکھتا چلا آرہا تھا جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنی آٹھ سالہ زندگی میں ساجد نے اپنے غصیلے باپ کو ایک مرتبہ بھی مُسکراتے ہوئے یا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہر وقت کرختگی چھائی رہتی عام حالات میں بولتا بھی وہ بہت کم تھا۔ باپ کی آواز سُنتے ہی اُس کا ننھا سا دل دھک سے رہ جاتا۔ اپنی ٹانگوں سے جان سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اور وہ فوراً اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر ماں کے پیچھے چھُپ جاتا۔ جب تک باپ گھر میں موجود رہتا وہ ایسا محسوس کرتا جیسے لال پگڑی والے گھر میں موجود ہوں۔ چپ چاپ دم سادھے کسی کونے میں دُبکا پڑا رہتا یا اپنی ماں کے پیچھے اس طرح چھُپنے کی کوشش کرتا کہ اُس پر باپ کی نظر نہ پڑ سکے۔ ماں خاموشی سے باپ کے سامنے کھانا رکھ دیتی یا سماوار میں سے چائے انڈیلتی تو وہ نظریں نیچی کئے ہوئے فرش کو تکتا رہتا —— اُس کا باپ اکثر کھانے کے موقعے پر ہی چیخنے لگتا۔ چیختے چیختے اُس کی آنکھیں انگاروں کی

طرح دہکنے لگتیں۔ مُنہ کے کونوں سے جھاگ بہنے لگتی۔ بعض اوقات کھانے کی تھالی یا کوئی دوسرا برتن اپنی پُوری قوّت سے چولھے کی طرف کھینچ مارتا — اور پھر اُس کی ماں کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ اس کی ماں خاموشی سے لاتیں اور گالیاں سہتی رہتی۔ اُس نے آجتک اپنی ماں کو کبھی چیختے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جب اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹ کر گھر سے باہر جاتا تو وہ ساجد کو سینے کے ساتھ لگا کر بہت روتی۔ ساجد کی نیلی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے اور پھر اپنی ماں کی گود میں سر چھپا کر سو جاتا —!

جس روز اُس کا باپ زیادہ غصّے میں ہوتا اور ہمسایوں کی مداخلت کے باوجود چیختا رہتا تو اُس روز ساجد کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی۔ وہ فوراً گھر سے باہر آجاتا تارکول کی لمبی سیاہ سڑک پر دوڑنا شروع کر دیتا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے — اُس کا دم پھُولنے لگتا لیکن وہ دوڑتا ہی چلا جاتا۔ بستی پیچھے رہ جاتی سڑک چھوڑ کر وہ بادام کے باغوں میں سے گزرتا ہوا پہاڑی کے دامن میں بھی دوڑتا رہتا، اور پھر راستے کے اختتام پر نشیب میں جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کے پیچھے ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر ہانپنے لگتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی سانسیں اعتدال پر آجاتیں لیکن آنسو اُسی رفتار سے بہتے رہتے — پھر وہ ناشپاتی کے پیڑ سے ٹیک لگاتا۔ اِسی حالت میں اُس کی آنکھ لگ جاتی۔

آنکھ کھل جانے پر وہ اپنے آپ کو بے حد اُداس پاتا اور اُداس نظروں سے جنگلی گلابوں کو دیکھتا رہتا — دیودار اور چیڑ کے جنگل سے آنے والے ہوا کے لطیف جھونکے اُس کے لمبے ریشمی بالوں کو اُلجھاتے۔ نالے کا پانی بہتا رہتا۔ گلاب مُسکراتے رہتے۔ ہرے رنگ والے طوطے کچی ناشپاتیوں کو کتر کتر کر گراتے۔ سنہرے پروں والی تتلیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتیں۔ چیونٹیوں کی لمبی قطار بادام کے باغوں سے ہو کر گزرتی۔ گُل ہزار مرتبہ چیخ کر اپنا جوڑا جیکلر سینہ ٹھونک کر اُس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اُس کی آنکھیں

جھپکنے کا نام تک نہ لیتی تھیں۔ گل کو ایسا لگتا جیسے ساجد بولنے کے ساتھ ساتھ سننے کی طاقت بھی کھو بیٹھا ہو۔ تب گل ناشپاتی کے پیڑ سے اُتر کر کپڑے پہنتا اور جنگل کی طرف قدم بڑھاتا۔ لیکن ساجد خاموشی کے ساتھ گلابوں کو دیکھتا رہتا۔ جو ہمیشہ اُس کی طرح خاموش رہا کرتے تھے۔ جو مُسکراتے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ پھر جب سورج بادام کے باغوں کے پیچھے اپنا سُرخ جال پھیلاتے ہوئے دُور مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپنے چلا جاتا تو وہ سر جھکاتے ہوئے بستی کی طرف اپنے قدم بڑھانا شروع کر دیتا۔

جنگلی گلاب، نالے کا نیلا پانی اُس میں چھپے ہوئے سفید گول گول پتھر اور نالے کے کنارے اُگے ہوئے جعفری، شور مچاتے ہوئے طوطے۔ چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاریں، ناشپاتی کا پیڑ۔ سنہری اودی اور طاوسی رنگ کی تتلیوں کے علاوہ گل بھی اُس کے دوستوں میں شامل تھا۔ گل جس کے بال بے حد لمبے تھے۔ اور چمکیلے تھے۔ جس کا سینہ بے حد چوڑا تھا اور جو ہر وقت مُسکراتا رہتا تھا۔ لکڑی کے کارخانے میں ملازم تھا۔ شام کو جب کارخانے میں چھٹی ہو جاتی تو وہ بُرادے سے اٹا ہوا نالے پر نہانے کے لئے آجاتا۔ شروع شروع میں وہ اس لمبے بالوں والے لڑکے سے لاتعلق سا رہا تھا۔ جو کبھی ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر بے حد اُداس نظروں سے جنگلی گلابوں کو دیکھتا رہتا یا کبھی چیونٹیوں کی لمبی قطاروں کے ساتھ رینگتا ہوا نظر آتا۔ لیکن ایک روز جب وہ نالے سے نہا کے نکل رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکا ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر رو رہا ہے۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے لڑکا چیخنا چاہتا ہو لیکن چیخ نہ سکتا ہو۔ کچھ دیر تک خاموشی سے اُس کو دیکھتا رہا پھر اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکا چونک سا پڑا۔ اُس نے لڑکے سے رونے کی وجہ پُوچھی لیکن لڑکا روتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کو پتہ چلا کہ لڑکا گونگا ہے۔ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کے دل میں لڑکے کے لئے ایک عجیب سی ہمدردی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اُس نے لڑکے کو چُپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اُس کو چمکارا۔ سنہری رنگ کی تتلیاں پکڑ کر لائیں۔ کچے بادام توڑ کر

دایا۔ سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن لڑکے کا رونا بند نہ ہوا تب گُل نے اپنے دونوں ہاتھ مُنہ سے لگائے اور چیخنے لگا —

"میں ٹارزن ہوں — میں گدھا ہوں — تم میرے باپ ہو — لیکن اے میرے خوبصورت پھول میں تم کو ہنسا کر ہی دم لوں گا —!"

پھر وہ ناشپاتی کے پیڑ کی ایک اُونچی ڈال پر لٹک گیا اور جھولنے لگا۔ ڈال اُس کا وزن برداشت نہ کر سکی، چرمرا کر ٹوٹ گئی اور گل سمیت نالے میں گر گئی۔ عین اُس لمحے ساجد نے رونا بند کر دیا اور نالے کی طرف بڑھا۔ گُل اس طرح کراہتے ہوئے پانی سے باہر آ گیا جیسے اُس کو زبردست چوٹ آئی ہو۔ لڑکے کی پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اُسکے قریب پہنچ کر گل دوزانو جھک گیا۔ نیلی آنکھوں میں پریشانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اپنا گورا گول مٹول ہاتھ گل کے کندھے پر رکھ کر اُسکے قریب آ گیا۔ گل نے اُس کو اپنے سینے کے ساتھ لپٹا لیا۔ لڑکے نے ایک ڈھیلی سانس چھوڑ دی کچھ دیر بعد وہ آرام سے گل کی گود میں سو رہا تھا۔ اور گل کی آنکھیں دُور مغربی اُفق پر جمی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز گُل نے لڑکے کو راہ دیکھتے ہوئے پایا۔

پھر ایک روز لڑکا اپنی ماں کو بھی ساتھ لے آیا۔ وہ شاید اپنی ماں کو اپنے ایک اور دوست سے ملانا چاہتا تھا کیونکہ جب وہ جنگل میں کوئی نئی چیز یا کسی نئے دوست کو دریافت کرتا تو اپنی ماں کو ضرور دکھانے لے آتا۔ گُل کو دیکھتے ہی اُس کی ماں گھبرا سی گئی لیکن جلد ہی اُس کو معلوم ہو گیا کہ ساجد کے اور دوستوں کی طرح گل بھی اُس کا بے ضرر قسم کا دوست ہے۔

دُکھ میں کوئی انسان معمولی سی ہمدردی کا اظہار کرے تو دُکھی انسان اپنے دِل کے سارے دروازے کھول کر دُکھوں کے آنسو بہانے لگتا ہے۔

گُل خاموشی سے ساجد اور اُس کی ماں کی کہانی سُن رہا تھا۔ ساجد کی ماں سے ہی اُس کو معلوم ہو گیا کہ ساجد پیدائشی گونگا نہیں بلکہ تین برس کی عمر میں

جب کہ وہ ایک ننھے مُنے بھائی کا بڑا بھائی بن گیا تھا۔ تو باپ کا غصہ قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک زور کی لات چلی۔ ساجد کا تین روز کا بھائی اُس سے جُدا ہوگیا۔ ساجد جو صرف تین سال کا تھا ایک دم خاموش ہوگیا —— ایسا خاموش کہ اب تک ……!

ساجد کی ماں پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی تھی

آج بھی جب اُس کے باپ نے اُس کی ماں کو پیٹنا شروع کیا تو وہ سہم کر ایک کونے میں دبک گیا۔ غفار کاکا بھی آ گیا۔ زونی موسی بھی آگئی۔ اور بہت سارے لوگ آگئے، لیکن اُس کا باپ چیختا ہی رہا۔ وہ دبے پاؤں باہر آگیا، اور باہر آتے ہی تارکول کی سیاہ لمبی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اب وہ ناشپاتی کے پیڑ کے تنے سے لگ کر خاموشی سے جنگلی گلابوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک کئی بار اُس چھوٹے سے راستے کی طرف اپنی نظریں اُٹھا چکا تھا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ لیکن گُل کا دُور دور تک نشان نہ تھا۔

ایک لمبی سانس لیکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور نالے کی طرف بڑھا۔ رات کو بارش ہوئی نالے کا نیلا پانی گدلا ہوگیا تھا۔ چلو سے پانی پکڑ کر وہ نالے میں واپس ڈالنے لگا۔ نالے کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر اسی طرح وقت گذاری کرتا تھا۔ اب کی بار جو اُس نے اپنے ہاتھ پانی میں ڈال دئے تو وہ کسی نرم لچکیلی چیز سے ٹکرائے۔ اس نالے میں چھوٹی مچھلیوں کی بہتات تھی۔ اس خیال سے کہ کوئی بڑی مچھلی رہی ہو۔ ساجد نے اُس نرم لچکیلی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پانی سے باہر لے آیا۔

نیلی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ہونٹ لرزنے لگے ——!

اُس کے ہاتھوں میں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش تھی ——! لاش نیلی پڑ گئی تھی اور پھُول گئی تھی۔ سر کے بال چپک کر رہ گئے تھے ——! جب اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹتا تو اُس وقت اُس کے دل میں ایک طوفان سا اُٹھتا۔ اُس سے بہت

تیز طوفان اس وقت اُس کے دِل میں اُٹھا چیخنے کی ناتمام کوشش سے اُس کا بدن لرزنے لگا۔

وہ شاید بچّے کی لاش سے پُوچھنا چاہتا تھا —— بھیا تو کون ہے —؟ تو اِس نالے میں کیوں پڑا ہوا تھا —— ؟ تمہاری ماں کون ہے —— ؟ تم کس کے بھیا ہو —— ؟ کیا تمہارے ابو نے بھی تمہاری ماں کو پیٹا تھا؟ کیا تم بھی اپنے ابو کی لات سے مر گئے ہو —— ؟ وہ ہزاروں سوال نوزائیدہ بچے کی لاش سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن بچے کی لاش خاموش تھی۔ اور خود اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہ تھا —!

جب وہ چیخ بھی نہ سکا اور اپنے سوالوں کا جواب بھی نہ پا سکا۔ تو اُس نے لاش وہیں کنارے پر ڈال دی، اور پھر گلاب کی جھاڑیوں اور لانبی لانبی گھاس کو پھلانگتا ہوا بادام کے باغوں کی طرف دوڑ پڑا۔

گھر میں ایک منحوس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ باپ گھر میں نہ تھا۔ ماں چولھے سے اُٹھتے ہوئے سُرخ شعلوں پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہی تھی۔ اُس نے ماں کو آواز دینا چاہی لیکن ہمیشہ کی طرح ناکام رہا۔ پھر دوڑ کر اپنے بازو ماں کے گلے میں ڈال دئے۔ ماں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اُس سے کئی سوالات کئے لیکن ساجد اشاروں اور کنایوں کے باوجود اُس کو اپنا مطلب نہ سمجھا سکا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی سمجھ سکی کہ ساجد کو اپنا تین روز کا بھائی یاد آگیا ہے۔ کیونکہ اکثر وہ ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔

جب وہ بھی اپنا مطلب سمجھانے میں ناکام ہوا تو اُس نے ماں کا دامن پکڑ لیا اور باہر کی طرف لے جانے لگا۔ ماں سمجھ گئی کہ وہ اُس کو جنگل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن آج اُس نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ آج دِن بھر جتنی بھی گالیاں اور جتنی بھی لاتیں اُس کو سہنا پڑی تھیں، اُن سب کی ذمہ داری ساجد کے دوست طارزن پر عائد ہوتی تھی —!

وہ ساجد کو زبردستی واپس اندر لے آئی۔ اور اُس کو کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ساجد بہت دیر تک دروازے پر زور آزمائی کرتا رہا۔ ماں اپنے دل کے دروازے کے ساتھ ساتھ اپنے کانوں کی کھڑکیاں بھی بند کر چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کافی اُونچی تھی۔ اُس تک پہنچنے کی کوشش میں ساجد اس قدر تھک گیا کہ بے سدھ ہو کر ایک طرف گر گیا۔

دوسری صبح جب سورج مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے ہی چھپا ہوا تھا۔ ساجد بادام کے باغوں میں بھاگتا چلا جا رہا تھا ـــــ گلاب کی جھاڑیوں کے قریب پہنچکر وہ رُک گیا۔ اگر وہ چیخ سکتا تو اُس کی چیخ آسمان تک پہنچ جاتی۔ نوزائیدہ بچے کی لاش پر ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا کتا جھکا ہوا تھا۔ ساجد کے چہرے پر غصّے اور بے بسی کی مِلی جلی لکیریں اُبھر آئیں اُس نے قریب پڑے ہوئے ایک نوکیلے پتھر کو اُٹھایا اور اپنی پُوری قوت سے کتے پر کھینچ مارا۔ پتھر کتے کے سر پر لگ گیا۔ اور ایک خطرناک غراہٹ کے ساتھ دُور ہٹ گیا۔ کتے کے ہٹتے ہی ساجد نے ناشپاتی کے پیڑ کی طرف چھلانگ لگا دی وہ اپنے آپکو سنبھال نہ سکا۔ مُنہ کے بل گرا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو نوزائیدہ بچے کی لاش عین اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُس کا ایک بازو اور چہرے کا آدھا حصّہ غائب تھا۔

ساجد نے ایک مرتبہ پھر چیخنا چاہا لیکن اب کی بار بھی وہ ناکام رہا۔ کتے کی آنکھوں میں ساجد کے لئے نفرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک اور پتھر اُٹھا کر اُس نے پُوری قوّت سے کتے کی طرف کھینچ مارا۔ کتے نے اُچھل کر اپنے آپ کو صاف بچا لیا۔ اس کے بعد ساجد جیسے پاگل ہی ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں پتھر اُٹھا کر وہ نالے میں کُود پڑا۔ کتا جنگل کی طرف بھاگا۔ ساجد دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا۔ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اُس کو گرتا دیکھ کر کتا رُک گیا اور پھر فوراً ناشپاتی کے پیڑ کی سیدھ باندھی۔ ساجد کپڑے جھاڑنا بھُول

گیا اور اپنی پوری رفتار سے کتے کے پیچھے لپکا۔ لیکن نئے منظر نے اُس کو اور بھی دیوانہ کر دیا۔ تین کوے نوزائیدہ بچے کی لاش پر ٹھونگیں مار رہے تھے۔ اور دوسری طرف ایک مریل کتا لاش کی ٹانگ کو چبا رہا تھا۔ ساجد نے ایک مرتبہ پھر چیخنا چاہا لیکن اب کی بار بھی پتھروں سے کام چلانا پڑا۔ کوے اُڑ گئے لیکن اُوپر ناشپاتی کے پیڑ پر ہی منڈلاتے رہے۔ مریل کتا ٹانگ چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ اور خود ساجد بے سدھ ہو کر اس طرح نوزائیدہ بچے کی لاش پر گر گیا کہ ساری لاش اُس سے ڈھک گئی ـــــ! بھبھونڈی ہوئی لاش اُس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ وہ خود بے تحاشا ہانپ رہا تھا۔ گلا خشک اور زبان کانٹا بن کر چُبھ رہی تھی۔

کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے اُس کے اُوپر سے گزرنے لگے۔ دونوں کُتے قریب آنے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ موٹا تازہ کتا زیادہ دلیر ثابت ہوا ساجد کی پرواہ کئے بغیر اُس نے اپنی تھوتھنی ساجد کی ٹانگوں میں گھسیڑ دی جہاں سے لاش کا ایک حصّہ جھانک رہا تھا۔ سرسراہٹ محسوس ہوتے ہی ساجد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کتّے کو اپنے قریب دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر اُس نے سیدھا کتے کے ماتھے پر کھینچ مارا۔ کتے کے ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ خونخوار انداز میں غرّایا۔ اور ساجد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر برف کی سل رکھ دی گئی ہو۔ ابھی وہ اِس خطرے سے نمٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسری طرف سے مریل کتا آگے بڑھا اور لاش کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ اور اِس سے پہلے کہ ساجد مریل کتّے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ سیاہ رنگ کا کتا مریل کتے پر جھپٹا اور اُس کو بھبھوڑنے لگا۔ کتوں کو آپس میں لڑتا دیکھ کر تینوں کوّے جو اُوپر منڈلا رہے تھے۔ خونخوار بازوں کی طرح شکار پر جھپٹ پڑے۔ ساجد بپھر کر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ کوّے فوراً اُڑ گئے۔

اتنی ہی دیر میں سیاہ کتا اپنے دشمن کو بھگا چکا تھا۔ ساجد کو کوؤں پر پتھر برساتے دیکھ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ساجد نے پاگلوں کی طرح اس کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کتا پھرتی کے ساتھ ہٹ گیا۔ لیکن لاش اس کے منہ میں دبی رہی، اور اسی حالت میں اس نے جنگل کا رخ کیا۔ نہ جانے کب تک ساجد اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ نہ جانے وہ کب تک روتا رہا۔ اس کا سارا جسم گرد و غبار سے اٹ گیا۔ وہ اب بھی کتے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ لیکن اب اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینکڑوں کتے اس کی ٹانگوں کو کھینچ رہے ہوں، اور ہزاروں کوے اس کی پیٹھ پر ٹھونگے مار رہے ہوں۔

آنکھوں کے سامنے چھا رہے اندھیرے میں اس نے گل کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ گل کی باہوں میں آتے ہی وہ چیخ پڑا۔

"ساجد!" گل کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

ساجد کی آواز بے حد دھیمی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

"بھیا..... بھیا.... کتا لے گیا۔ کتا.....لے گیا۔"

گل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اس پر کسی کا سایہ پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا —— وہ ساجد کی ماں تھی ——

تھوڑی دیر بعد گل، ساجد کو گود میں اٹھائے ہوئے جنگل کی طرف جا رہا تھا —— ساجد کی ماں پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

شمس الدّین شمیم

دوہری صلیب

"مجھے آدھ پاؤ گوشت چاہئے"

بشیر ساغر نے قصائی کی طرف اُمّید بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میں آدھ پاؤ گوشت نہیں بیچتا۔ جاؤ اُس نکڑ والے قصائی فنی کھروؔ[1] سے خریدو۔ سالا قصائی پیشے کے نام پر دھبّہ ہے۔"

قصائی نے لمبے لمبے پیلے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ جن دانتوں پر چپکے ہوئے مرچ کے ذرّے صاف نظر آرہے تھے۔

"لیکن اس کے پاس بھیڑ کا نہیں بکرے کا گوشت ہے۔ اور میری بچّی بیمار ہے۔"

بشیر ساغر کی لہجے میں ایک رقّت تھی۔ ایک ایسی التجا جس میں لامتناہی غم اور درد کے گھاؤ پنہاں تھے۔ قصائی نے یہ سُن کر کسی گاہک کے لئے قیمہ ایک طرف رکھ دیا، اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے گوشت کے ذرّے زاوؔ[2] سے صاف کر کے مونچھوں پر ہاتھ پھیر لیا اور بشیر ساغر کا اُوپر سے نیچے تک جائزہ لینے لگا۔ جس کا چہرہ زندگی سے بالکل خالی اور ویران تھا

---

[1] ۔ کھرو ۔ کشمیری میں گنجے کو کہتے ہیں۔

[2] ۔ زاو قیمہ بنانے کے چھرُے کو کہتے ہیں۔

جیسے گلمرگ میں ٹٹو کرایہ دینے والے دیہاتیوں کے چہرے سردیوں میں ویران نظر آتے ہیں۔ اس کی کنپٹیوں پر لمبے لمبے بے ترتیب سیاہ و سفید بال، بڑھی ہوئی داڑھی۔ میل سے چمکتا ہوا نمیتیض کا پھٹا کالر زین کا پتلون جو گھٹنوں پر دانت دکھا رہا تھا اور اکھڑا ہوا جوتا جس پر بیاپائی کے متعدد جھنپٹے صاف نظر آرہے تھے۔

آخر قصائی نے آدھ پاؤ گوشت کا وزن کیا اور کاغذ میں لپیٹ کر اُس کی طرف بڑھانے ہی والا تھا کہ اسی لمحے اس نے ہاکر کی آواز سُنی جو اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"کالج کا طالبات کی اغوا کرنے والوں کا گرفتار۔"

یہ سُن کر قصائی نے گوشت ایک طرف رکھ دیا اور جھٹ اخبار خریدا اُس کی آنکھیں جن میں سُرخ سفینے تیر رہے تھے۔ فوراً خبر کی تلاش میں بھٹکنے لگیں اور بشیر ساغر اپنے سر کو ساٹھ درجے کا زاویہ بنا بنا کر خبر پڑھنے لگا۔

کالج کی طالبات کو اغوا کرنے والے ڈرامائی انداز میں گرفتار طالبات کے ناموں کی ایک فہرست ضبط، مزید انکشافات متوقع ——

حسرت گدڑھ، راگست دسٹی رپورٹر)۔ معلوم ہوا ہے کہ پولیس نے سٹی گرلز کالج کے عقب میں ایک ایسی کار پر چھاپہ مارا ہے جسمیں کالج ہذا کی دو طالبات کو دھوکہ دے کر اغوا کیا جارہا تھا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اس کار پر وہی رنگ چڑھایا تھا جو رنگ پرنسپل صاحبہ کی کار کا تھا۔ اور ان طالبات کو کہا گیا کہ تمہیں پرنسپل صاحبہ نے ایجوکیشن انسٹی چیوٹ میں ملنے کو کہا ہے۔ اطلاع کے مطابق پولیس اس کار کی مشتبہ حرکات پر پہلے ہی کڑی

نظر رکھے ہوئے تھی۔ جونہی کار دو طالبات کے سمیت روانہ ہونے لگی، پولیس نے بڑی سُرعت کے ساتھ کار کو گھیر لیا اور چھاپہ مار کر اغوا کرنے والوں کو حراست میں لے لیا ساتھ ہی کار سے طالبات کے ناموں کی ایک لمبی فہرست ضبط کر لی۔ یاد رہے اس سے قبل پولیس نے ایک ہوٹل میں ایسے گروہ کو حراست میں لے لیا جو اغوا کرنے کے بعد مجبور عورتوں کے ننگے سینوں پر شراب کے جام ڈالتے تھے۔ اس سے پہلے بنڈھ گام میں ایک حسین عورت کو اغوا کرنے کے لئے اس کے دیور کو بے دردی سے قتل کر کے درخت پر لٹکا دیا گیا۔ بتایا جاتا ہے عوامی حلقوں میں پچھلے دَور کی یاد ذہنوں کے دریچوں میں کلبلا رہی ہے۔ آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے دور کے اوباش پھر پُراسرار سرگرمیوں میں مصروف ہیں اس سلسلے میں پولیس کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ ایسے افراد کو سختی سے دبا دیا جائے گا۔"

یہ خبر پڑھ کر بشیر ساغر کا تن و توش پسینے سے شرابور ہو گیا اور وہ بڑبڑایا "میری بیٹی ...... مسعودہ ...... کالج ...... سے شاید ...... واپس آئی ہو گی۔"

اس نے قصائی سے گوشت لے کر پیسے دئے اور اس پر گرفت مضبوط کر کے گھر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ تین سال قبل اس کی بھتیجی یونیورسٹی کے باہر اغوا کر لی گئی۔ اور اس کا کہیں بھی پتہ نہ چل سکا۔ صرف سُلیمان پہاڑی کی جھاڑیوں میں اس کے پھٹے اور خون آلود کپڑے ملے تھے۔ جن کو دیکھ کر وہ پاگل سا ہو گیا۔ اور شاید یہی وہ زخم تھا جس نے اسے سماج کی دکھتی ہوئی رگوں سے روشناس کر دیا، اور اسی بنا پر وہ ایک

سنجیدہ کہانی کار بن گیا تھا۔ اس کی کہانیاں ملک کے معیاری رسالوں اور جرائد میں شایع ہوئی تھیں۔ اس کی کہانیوں میں بلکتے بچوں کے احساسات، چپراسی کی زندگی کے نشیب فراز، چمار کے جذبات اور مظلوموں کی آہ و فغاں آنکھ کے تل کی طرح صاف نظر آتی تھی۔ رومان کو وہ وقتی جوش اور جنون قرار دیتا۔ اُس کی کہانیوں میں

"دوشیزہ کی سیاہ پلکیں بارِ حیا سے جُھک گئیں۔"
"رخساروں پر شفق کی سی سُرخیاں چھاگئیں۔"
"قرمزی ہونٹ ہلنے لگے۔"
"واہ! پروین کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔"
"رابعہ نے صدیق کو اپنایا۔"
"نکی نے قمر کو بہت ہی پیارا خط لکھا۔"

قسم کے جُملے شاید تلاش کرنے پر بھی نہ مِل پاتے۔ وہ سماج کے ان اُونچے طبقوں کی گندی اور سیاہ زندگیوں کو اُچھالتا جن اونچے طبقوں کے درندوں کے سامنے سرِشام ہی حوّا کی کوئی مجبور بیٹی اور چھلکتے ہوئے جام میں شراب کے رُوپ میں دست کاروں، مزدوروں اور محنت کشوں کا خون ہوتا وہ ان لوگوں کی پول کھولنے میں سکون محسوس کرتا جو شیش محل میں بیٹھ کر سوشلزم کے خواب دیکھتے ہیں۔

وہ ان انسان نما بھیڑیوں کو دیکھ کر تلملا کر رہ جاتا جو رات کی تاریکیوں میں اپنے گناہوں کی گٹھڑی چھُپا کر بڑے فخر کے ساتھ دن کے اُجالے میں نت نئے نعرے لگاتے ہیں۔

"سوشلزم ہمارا دھرم ہے۔
ہمارا ایمان ہے
ہم کسی کو دکھی دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"غریبوں کو روٹی دو، بھوکوں کو کھلاؤ"
کیوں ڈارلنگ ٹھیک ہے نا، پلاؤ پھر اور جام ڈارلنگ ساقیا"
وہ ایسے سرمایہ دار قسم کے سوشلسٹوں سے نفرت کرتا تھا۔ اُن کے سامنے کبھی جھکتا نہیں۔ حالانکہ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ کم مائیگی کے احساس کے باوجود وہ رشوت کو شیطانیت کا ایک رُخ قرار دیتا۔ جس محکمے میں وہ کلرک تھا وہاں کے دوسرے کلرک اُسے بے وقوف سمجھتے اور کبھی کبھی ہنسی مذاق میں کہتے۔

"ارے او ادیب کے بچے! یہ ایمانداری کب تک سہارا دے گی تین لڑکیوں کی شادی کیسے کروگے؟ تمہاری حالت تو بھکاریوں جیسی ہوگئی ہے۔" لیکن وہ یہ ساری باتیں مُسکرا کر ٹال دیتا حالانکہ یہ باتیں اندر ہی اندر اس کے وجود کو اپنے وحشی ناخنوں سے بُری طرح زخمی کر دیتیں اور وجود کے زخموں سے رستا ہوا خُون جسم کے انگ انگ میں سوئیوں کی طرح چبھ جاتا اور اس کے سامنے معاً قیامت برپا ہو جاتی۔ ذہن کے تھکے ماندے دریچوں میں یہ باتیں بجلی بن کر گرتیں اور پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑتیں پھر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اَن گنت سُرخیوں کے پیکر میں نمودار ہو جاتیں۔

اتنے میں اُسے اچانک ہوش آگیا کیونکہ وہ راستے میں ماضی کے خیال میں ڈوب گیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہوا۔ جہاں مسعودہ اِس کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے ابا جان ــــــ؟"
"کچھ نہیں بیٹے پروین کی حالت اب کیسی ہے"؟
"فیور تو نہیں ــــــ؟ آرام کیا یا نہیں ــ؟"
"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے آپ کے لئے چائے لاؤں"
"ہاں بیٹا لے آو چائے"

کچھ دیر بعد چلتے چلتے ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے مسعودہ سے کہا
"بیٹی تم اب کالج جانا چھوڑ دو، میں نے سب کچھ صرف تمہاری پڑھائی کے لئے وقف رکھا، اور میری حالت بالکل بھکاریوں جیسی ہو گئی۔ لیکن اب وقت کا تقاضا ہے کہ تم کالج کو خیرباد کہو۔"
"میں سب کچھ سمجھ گئی لیکن یقین کیجئے، میں اپنی حفاظت آپ کرنا خوب جانتی ہوں۔ آپ بے فکر رہئے اگر لڑکیاں کالج جانا چھوڑ دیں گی تو وہ بزدلی ہو گی ہم سب اپنی حفاظت کرنا جانتی ہیں۔ دیکھئے میں نے اپنی حفاظت کے لئے چاقو رکھا ہے۔"
مسعودہ نے سنجیدہ ہو کر والد کے سوال کا معقول جواب دیا اور بشیر ساغر کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نم ہو گئیں۔
"ابا جان چھوڑئے اِن باتوں کو دیکھئے اس اخبار میں آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ مرکزی کلچرل اکیڈیمی نے مُلک کی تمام زبانوں کے ادیبوں سے اپنی اچھی اچھی کہانیاں مانگی ہیں۔ اِس سلسلے میں تین ہزار کا اکیڈیمی ایوارڈ اور سالانہ وظیفہ بھی مُقرر کیا گیا ہے۔ ابا جان آپ بھی اپنی کہانی بھیج دیجئے آپ کو ضرور پہلا انعام ملے گا۔"
اِس خوشخبری سے بشیر ساغر کو یکایک صُبح کا سورج نظر آنے لگا۔ اس کے ذہن میں کافی وقت سے ایک اچھا پلاٹ کلبلا رہا تھا۔ اس نے اِس پلاٹ کی کُلبلاہٹ کو دو دِن کے اندر اندر کاغذ پر تحریر کی صورت میں پیش کیا۔ جب وہ کہانی پوسٹ کرنے کے لئے گھر سے نکلا تو گلی میں اُسے ایک ہمسایہ عورت نے آواز دی وہ رُک گیا اور ایک ضعیف اور لاغر بڑھیا اس کے قریب آ گئی جس کا چہرہ اَن گنت جھریوں کا نشیمن اور غم و یاس کی کھلی کتاب لگ رہا تھا۔
"کیا ہے موسی ۔۔۔؟"

"بے....... بیٹا....... چاول پھر ختم ہو گئے ہیں اور مالک مکان آج کرایہ وصول کرنے کے لئے آتا ہی ہو گا ——"

بڑھیا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا اور اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اِس بڑھیا کے بیٹے کو جو ایک ادارے میں ہیڈ کلرک تھا اس قصور پر بیدردی سے قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش چار حصوں میں کاٹ کر ایک پارک میں پھینک دی گئی کہ اس کی بیوی بے حد خوبصورت تھی ظالموں اور درندوں نے بڑھیا کا دیا بجھا دیا اور اس وقت سے بشیر ساغر غریب ہونے کے باوجود اسے کسی حد تک مدد کرتا رہا۔

"موسی میرے پاس اس وقت کچھ نہیں، تم میرے گھر جاؤ۔ معودہ ابھی وہیں ہے، اِس سے چاول لے لینا شام تک ضرور کرایہ کا انتظام کروں گا"

یہ کہکر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد چوک میں پہنچ گیا جہاں اس نے "سوشل ازم" کے ایک نام نہاد پرستار اور متوالے قمرالدین کو دُور سے آتے ہوئے دیکھا اور معاً اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہ کہانی قمرالدین کو بیچ دوں کچھ دیر غور کرنے کے بعد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ قمرالدین کے قریب پہنچ گیا اور علیک سلیک کے بعد اس نے جیب سے کہانی نکالی اور دھیرے لیکن مضبوط انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"سُنو دوست۔ یہ کہانی میں نے بڑی محنت سے لکھی ہے اور چاہتا تھا کہ اسے اکیڈمی ایوارڈ کے لئے مرکز کو روانہ کر دوں لیکن اب .... مجھے کچھ روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے خرید سکتے ہو لیکن تمہیں کم از کم بیس۲۰ روپے ادا کرنے ہوں گے۔"

قمرالدین نے پل بھر سوچا ایک نظر کہانی پر ڈالی اور جیب سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے بشیر ساغر سے کہا۔

"دیکھو بھئی۔ چونکہ تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ اگر مجھ سے تمہاری

حالت دیکھی نہیں جاتی اور پھر بیس روپے کی رقم ایک "دوست" سے زیادہ تو نہیں ہوتی۔"

قمرالدین نے کہانی لے لی اور بیس روپیہ دے کر چلا گیا

شام کو بشیر ساغر دفتر سے لوٹا تو بیس روپے غریب بڑھیا کو کرایہ ادا کرنے کے لئے دے اور گھر چلا گیا۔ وہاں نئی کہانی لکھنے کے لئے کافی کوشش کی لیکن بات نہ بن سکی، اور اس نے اکیڈیمی ایوارڈ کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

لیکن جس روز مرکزی اکیڈیمی کی طرف ایوارڈ کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس روز وہ دفتر سے نکل کر سیدھا نیاض ٹی سٹال میں شام تک بیٹھ گیا، اور اپنی زندگی کے کھرے کھوٹے سکوں کو پرکھتا رہا لیکن جب باہر سے ہاکر کسی اخبار کا ایوننگ ایڈیشن لے کر چلا چلا کر کہنے لگا۔

" آج کی —— آج کی تازہ خبر —— آج کی کالج لڑکی کا اغوا اور قتل۔"

یہ سنتے ہی وہ نیاض ٹی سٹال سے باہر آیا اور اخبار خرید کر اس کی نظریں مختلف خبروں پر بھٹکنے لگیں اور یکایک اس کی نظریں ایک خبر پر جم گئیں جس پر لکھا تھا کہ مرکزی اکیڈیمی ایوارڈ کہانی کار قمرالدین نے حاصل کیا۔ بشیر ساغر کو جیسے کچھ دیر کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی نظریں اخبار کی دوسری خبروں پر دوڑ رہی تھیں اور اچانک ایک خبر پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"مقامی کالج کی ایک طالبہ معودہ بشیر کو اغوا کر کے قتل کر دیا گیا۔ اطلاع کے مطابق مقتولہ نے بھی ایک اغوا کنندہ کو پیٹ میں چاقو گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ حسرت گڑھ کے مشہور ادیب بشیر ساغر کی بیٹی تھی۔"

لیکن خبر پڑھتے ہی اس کے ہاتھوں سے اخبار چھوٹ گیا اور اس کے سامنے تاریکیاں چھا جانے لگیں۔ یہ خبر اس کے ذہن پر بجلی بنکر گری اور پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑی ہے۔ وجود زخمی اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ اسے اکیڈمی ایوارڈ کی خبر اور بیٹی کے اغوا والی خبر تصور میں ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتی نظر آنے لگی اور وہ دیمک زدہ درخت کی طرح نیچے گر پڑا۔

ہربھجن سنگھ ساگر

دو پیاسی آنکھیں

یہ وہسکی کا پانچواں پیگ تھا۔ جوں ہی ایک ایک گھونٹ میرے حلق سے نیچے اُترنے لگا۔ نشہ بھی تیز سے تیز تر ہونے لگا۔ مجھے جام میں گیتا کا حسین مجسمہ نظر آیا ——— شرابی آنکھیں ——— انگ انگ شراب اور سارا جسم شراب ہی شراب۔ پھر میں پورا پیگ غٹا غٹ پی گیا، اور گیتا میرے جسم میں اُتر گئی۔ میرا نشہ دو آتشہ ہو گیا۔

مجھے یاد آیا، آج جو ڈیڑھ لاکھ روپے میں نے تجوری میں رکھے ہیں۔ کیوں نہ اُنہیں ایک نظر میں گن لیا جائے۔ چوری سے خدا بچائے۔ اپنا شک دور کر لینا ہی اچھی بات ہے۔ ہاں! کل کیلئے بھی تو تین چار ہزار روپے چاہیئے۔ چیف انجنیئر سے وعدہ کیا تھا اگر کنٹریکٹ میرے حق میں نکالا گیا تو......... آجکل پیسہ کمانے کیلئے پیسہ صرف بھی تو کرنا پڑتا ہے۔ کل گیتا کے ساتھ کلب جانے کا پروگرام بھی ہے۔ کمبخت وہسکی پینے کے بعد میری یادداشت بہت تیز ہو جاتی ہے، ایکدم ساری باتیں یاد آنے لگتی ہیں ——— ڈیڑھ لاکھ روپے ——— چیف انجنیئر کو سلام ——— گیتا کے ساتھ پروگرام ——— وغیرہ وغیرہ۔ میں کھسک کر تجوری کے پاس جا پہنچا۔

اب میری نظر وہسکی کی خالی بوتل پر پڑی۔ نہ جانے ٹیبل سے فرش تک کیسے پہنچ گئی ——— خالی بوتل میں شراب کا گمان۔ دو آنکھوں کی مستی۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں ان آنکھوں میں ڈوب رہا ہوں۔ یہ دو آنکھیں جب گھور کر مجھے دیکھتی ہیں تو میں موم کی طرح پگھلنے لگتا ہوں۔ اور ان آنکھوں کی چمک تیز ہو جاتی ہے ——— یہ نیلی گہری آنکھیں ——— ایک جھیل کی طرح۔ ایک دن گیتا نے کہا تھا ——— "یوگ جی! کیا آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں؟"

"دل و جان سے" میں نے جواب دیا ——— "پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے ——؟"

اُس کی بات سنتے ہی میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ پھر میں نے سوچا، وہ بے شک

قیامت کی حسین ہے۔ لیکن —— ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کر کے مجھے کیا ملے گا —؟ میری نظر میں یہ سودا گھاٹے کا تھا۔ میں نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے کہا۔ "گیتا ڈارلنگ! شادی کے لئے ابھی بہت وقت ہے۔ جوانی تو پیار کرنے کے لئے ہوتی ہے۔"

وہسکی پینے کے بعد مجھے ماضی بھی یاد آنے لگا۔ کمبخت وہسکی۔ اپنا کام کرنا ہی بھول جاتا ہوں۔ ہاں —— ! دس ہزار بیس ہزار، پچاس ہزار — میں دس دس ہزار روپے کے الگ الگ ڈھیر بنانے لگا۔ ستر ہزار، ایک لاکھ، ایک لاکھ بیس ہزار، ایک لاکھ چالیس ہزار۔ ایک لاکھ .... ہائیں! یہ آخری ڈھیر یہ دو آنکھیں۔ میں نے اپنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے غور سے دیکھا۔ ہاں —! وہ دو آنکھیں ہی تو تھیں لیکن تجوری میں کیسے اور کیوں پہنچیں ——؟ کون ہے۔ جس کی نظریں میری دولت پہ لگی ہوئی ہیں ——؟ لیکن ..... لیکن یہ تو گیتا کی آنکھیں ہیں۔ نیلی نیلی نشیلی نشیلی۔ کیا وہ میری دولت سے پیار کرتی ہے؟ میرے پیسے سے شادی کرنا چاہتی ہے؟ کمینی، ذلیل...

میرے دل میں اُس کے لئے نفرت پیدا ہو گئی۔ میں نے فوراً وہ دو آنکھیں تجوری سے باہر نکال لیں۔ میں نے دیکھا۔ اب اُن دو آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اُن میں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے سارے روپے تجوری میں رکھنے کے بعد تجوری بند کر دی، اور اُن کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھا۔

کچھ دیر بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا، اور گیتا اندر چلی آئی اُس حسن پری کو دیکھ کر میری آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی جو بہت جلد غصّے کی آگ میں غائب ہو گئی۔

"یہاں کیوں آئی ہو —؟" میں نے بے رُخی سے پوچھا۔

"آپ کی آنکھیں واپس لوٹانے۔"

"میری آنکھیں ــــ ؟" میں نے حیرت سے پُوچھا
"ہاں آپ کی آنکھیں ــــ" اُس نے بہت غور سے میری طرف دیکھا ــــ "آج صبح جب میں نہا رہی تھی تو باتھ رُوم کے روشندان سے یہ آنکھیں مجھے گھُور گھُور کر دیکھ رہی تھیں ــــ اور جھٹ میرے ننگے جسم پہ چپک گئیں۔ میں بہت شرمائی اور فوراً اپنے جسم کو تولئے سے ڈھانپ لیا۔"

میری آنکھوں کی بینائی کھو گئی۔ میں اندھا ہو گیا۔ پھر گیتا کے گداز سینے سے دو آنکھیں نمودار ہوئیں ــــ دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ــــ لومڑی کی آنکھوں کی طرح۔ اُن کی بینائی سے مجھے سب کچھ نظر آنے لگا ــــ اپنا وجود بھی۔ گیتا نے اپنا مکھن کی ٹکیاں جیسا خوبصورت سینہ نائلون کی ساڑھی کے پلو سے ڈھانپ لیا، اور میری آنکھوں کی بینائی واپس لوٹ آئی ــــ بے آبروسی ہو کر۔

"آگے کہو گیتا۔"

"پھر میں وہ آنکھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔"

"ڈاکٹر کے پاس ــــ ؟"

"ہاں ڈاکٹر کے پاس ــــ" اُس نے کہا اور اپنے پرس سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکال کر میری طرف بڑھایا ــــ "پڑھ لو ڈاکٹر کی رپورٹ"

میں نے رپورٹ پڑھی لکھا تھا:

"اِن آنکھوں میں ایک پیاس ہے۔ جو ہر روز ایک حسینہ کے جوان جسم کی شراب سے بُجھ سکتی ہے۔"

رپورٹ پڑھ کر میں ہکا بکا سا رہ گیا ــــ اور گیتا کی آنکھوں میں مجھے اپنی صورت نظر آنے لگی ۔

صہبائے آبگینہ گداز

نظمیں

۱	میں، اُردو اور تُم	شہ زہر کاشمیری
۲	رشوت خوروں سے خطاب	ندہ لال طالب
۳	مجھے جینے سے اُلفت ہے	غ۔م۔ طاؤس
۴	شش رنگ	قیصر قلندر
۵	مانگ کا سیندور	دہندر ریبہ
۶	میری کہانی	حامدی کاشمیری
۷	تجدید عہد	اکبر جے پوری
۸	شاہکار	بشارت سلیم
۹	بلّی	قاضی غلام محمد
۱۰	خلاصہ	سُلطان الحق شہیدی
۱۱	تثلیث	فاروق نازکی
۱۲	گُفتنی	فرحت گیلانی
۱۳	ڈل اور چاندنی	تسنیم کاشمیری
۱۴	زمرّد کی بستی	شجاع سُلطان
۱۵	سفر	اشرف ساحل

شہزور کاشمیری

میں، اُردو اور تم

میں گل اندا موں کی زلفوں کی مہک ہوں گویا
دلِ عشاق کی آتش کی دہک ہوں گویا
طائرانِ چمنستان کی چہک ہوں گویا
ہر گلِ تر کے تبسم کی لہک ہوں گویا
یعنی اُردو ہوں میں تم ساتھ مرا چھوڑو گے
ہو کے شیدائی مرے مجھ سے ہی مُنہ موڑو گے

میں نے جذبات کو کونین کی وسعت دی ہے
فکر کو کنگرۂ عرش کی رفعت دی ہے
نطق کو کوثر و تسنیم کی لذت دی ہے
اور تخیل کو شادابیٔ جنت دی ہے
تم مجھے ذہن بدر، ملک بدر کر دو گے
زہر سے ساغرِ اُمید مرا بھر دو گے

جھوم اُٹھا ہے مرے نغمات سے ہر کوہِ گراں
مجھ سے ساکت ہوئی یہ موجِ رواں برقِ تپاں
میں نے خاموش مناظر میں لگا دی ہے زباں
اور جذباتِ فسردہ میں بھی ڈالی ہے جاں
میرے ہی تارِ نفس تک کو بھی توڑو گے تم
کیا مجھے چیرو گے، پھاڑو گے، نچوڑو گے تم

حسنِ تہذیبِ محبت کو نکھارا میں نے
شوق سے زلفِ تمدن کو سنوارا میں نے
سب کو اِک مرکزِ الفت پہ پکارا میں نے
کیا کوئی روپ ہے ایسا جو نہ دھارا میں نے
حیف تم غیر سمجھ کر مجھے ٹھکراؤ گے
میری تذلیل کرو گے مجھے تڑپاؤ گے

میں نے آزادئ انسان کا تقاضا بن کر — آگ بھر دی ہے غلاموں کی رگوں میں یکسر
صور پھونکے ہیں مسلسل حرکت کے گھر گھر — اور شبستانوں میں پھیلائے ہیں انوارِ سحر

تم تو آزاد ہوئے قید کروگے مجھ کو
بن کے صیادِ اجل، صید کروگے مجھ کو

میں کہ مسجد میں بساتی رہی مندر کے صنم — اور روشن کی گردواروں میں قندیلِ حرم
گوشے گوشے پہ وطن کے ہیں مرے لطف و کرم — اور تم مجھ پہ ستم کرنے کی کھاتے ہو قسم

اِک ذرا سوچو — ستم رانو، ذرا سوچو تو
ہندوؤ، سکھو، مسلمانو ذرا سوچو تو

نند لال طالب (مرحوم)

رشوت خوروں سے خطاب

آہ! اے رسوائے عالم آہ! اے رشوت ستاں
کتنی عبرت خیز ہے بدبخت تیری داستاں

ہے ترا طرزِ عمل صدق و صفا سے بے نیاز
ہے فقط اہلِ غرض راشی سے تیرا ساز باز

جانتا ہوں تو بظاہر صاحبِ ادراک ہے
تو بہت ہوشیار ہے، عیّار ہے، چالاک ہے

جانتا ہوں آنکھ سے کاجل چُرا سکتا ہے تُو
لُوٹ کر اوروں کا گھر اپنا بنا سکتا ہے تُو

جانتا ہوں تیرا ہر اندام ہے جادو اثر
زر کے ہتھیا لینے میں تو ہے بہت بالغ نظر

مانتا ہوں تیری رفتارِ تفکّر تیز ہے
ہر سخن تیرا دروغ مصلحت آمیز ہے

کیا مگر تجھ کو ہے کچھ اپنی حقیقت کی خبر
اپنے انجامِ زبوں کی اپنی قسمت کی خبر

آ سُناؤں تجھ کو ظالم میں پتے کی ایک بات
دِن تیرا ڈھلنے کو ہے آنے کو ہے تاریک رات

چھا گیا ہے تیرے دِل پر پستیٔ فطرت کا رنگ
چڑھ گیا ہے تیرے احساسات پر لالچ کا رنگ
دُشمنِ ایمان و دین ہے مُلک کا غدّار ہے
اور طرّہ یہ کہ ہمدردی کا دعویدار ہے
داد خواہوں کی دعائیں حشر تجھ پر ڈھائینگی
تیری یہ عیّاریاں دم توڑ کر رہ جائیں گی
جاگ اے غفلت کے ماتے اِنقلاب آنے کو ہے
دیکھ دم بھر میں لبِ بام آفتاب آنے کو ہے

ہوشیار اے بندۂ حرص و ہوا ہاں ہوشیار
اب چمکنے کو ہے تیغِ اِنتقامِ کردار

غ۔م۔طاؤس

مجھے جینے سے اُلفت ہے

قسم اُس آہ کی جو رات کی گہری خموشی میں
کسی مظلوم کے مجروح سینے سے نکلتی ہے
قسم اُس آرزو کی جو بہنگام سحر گاہی
ہزاروں حسرتوں کی گود میں کروٹ بدلتی ہے،
قسم اُس شوخ کی جو مضمحل ہوتا ہے منزل پر
قسم اُس آس کی جو یاس کے سایے میں پلتی ہے
قسم اُس رنگ کی جو نوجواں میت پہ چھاتا ہے
قسم اُس خاک کی جو حُسنِ رعنا کو نگلتی ہے
قسم اُس جبر کی جو رُوح کو پامال کرتی ہے
قسم اُس تیغ کی جو ظلم کے سانچے میں ڈھلتی ہے،
قسم اُس قوم کی جو آہنی عدموں کے نرغے میں
کبھی اُٹھ اُٹھ کے گرتی ہے کبھی گر کر سنبھلتی ہے
قسم اُس پاپ کی جو ابنِ آدم پر مُسلّط ہے
قسم اُس خُون کی جو آج بھی دھرتی اُگلتی ہے
قسم اُس زندگی کی جو وبالِ دوش بنتی ہے
قسم اُس موت کی جو آج بھی دھرتی اُگلتی ہے،
مجھے اس غمکدے سے پھر بھی اُلفت ہے ٭ یہ جینا کچھ بھی ہو لیکن مجھے جینے سے اُلفت ہے،

قیصر قلندر

شش رنگ

یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویراں بن
غم کی ہلکی آنچ سے سلگا، آس کا پیراہن

درد کے ماروں کے گھر اُتری، زخموں کی برات
اِستقبال کے نغمے گُم سُم ارمانوں کے ساتھ
حد نظر تک، مایوسی کے پھیلے کالے ہاتھ
صدموں کے لشکر آئے ہیں گھائل میرا من
یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویران بن

دِل کے شالا ماریں مہکے کیسے گُل بوٹے
دھیاں کے ہاتھوں سے زخموں کے ساغر بھی چھوٹے
اِک اِک کرتے وعدوں کے رنگین سپنے ٹوٹے
نغموں کی حوروں نے چھوڑا خوشیوں کا گلشن
یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویراں بن

شہروں شہروں بات جو پھیلی خوشبو کی مانند
گلیوں گلیوں پھرتا رہوں کِس کِس کا کروں مُنہ بند
اک جواں لمحے کی قسمت میں غم کا پیوند
پیار کے گیت سُناتی جائے دل کی ہر دھڑکن
یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویران بن

زندہ لمحوں کے نغموں کا ڈل میں دھڑکا دل
نازک ارمانوں کی پریوں کا ہے یہ حاصل
لہر لہر طوفان سفینو، لہر لہر ساحل
بلاچوں کی حیراں آنکھیں حسرت کے سکن
یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویران بن

نوشس لبوں کے جھرمٹ نکلے شوخ قباؤں میں
گل بدنوں کی مہک بھی ہے نرم ہواؤں میں
گھول دیا نغموں نے امرت مست فضاؤں میں
سیمیں پازیبوں سے جاگا لمحوں کا جوبن
یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویران بن

اپنے ارمانوں کی شمعیں لے کے نکلا ہوں
وقت کے تیرہ جنگل میں ہوں راہ تو دیکھ سکوں
تنبصر تجھ کو آج میں اپنے من کی بات کہوں
روزِ اول سے حسن کا شیدائی ہوں جانِ سخن

یاد کی ہر آہٹ پر چونکا رات کا ویران بن
غم کی ہلکی آنچ سے سلگا آس کا بیراہن

○

مہندر رینہ

مانگ کا سیندور

سوچتا ہوں ——
رنگ بھر دوں کیا تمہاری مانگ میں
اے نگارِ زندگی
یہ میرا ماحول گویا
میرے دل کی آرزوؤں کا کفن ہے
اب بھی گیتوں کی کنواری نغمگی
خامشی کے قید میں محبوس ہے
ہر صدا، ہر راگ، ہر آواز سنگین جُرم ہے
پھر بھی میں نے گیت کچھ چھیڑے تو تھے
اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساز پر
خامشی کو توڑ دینے کے لیئے
آہ! لیکن گیت لب تک آتے آتے کھو گئے —!
آہ! لیکن پھول کھلنے [illegible] گئے!

اب بھی سپنوں کے چمن زاروں کے پھول
خار بن کر سانپ کے مانند ڈسنے کے لئے
ڈھونڈ لیتے ہیں کسی مالی کا دل
پھر بھی میں نے سپن اپنانے کی ہمت کی تو تھی
خون دے کر سینچ ہی ڈالے تھے سپنوں کے چمن

تاکہ کانٹوں کے عوض بھی پھول ہی کھلتے رہیں
آہ! لیکن پھول کھلنے ہی سے پہلے سپین سارے مر گئے!

اب بھی اُلفت کے تقدّس کا جمال
بیچ دیتے ہیں کہ گویا
یہ بازاروں میں بکتی ہوئی بیسوا کا جسم ہو
پھر بھی میں نے پیار کی درگاہ میں سجدے کیے
کائنات دل کی ہر شے شوق سے قربان کی
تاکہ تقدیس محبت کا نہ ہو نیلام اب
آہ! لیکن میری قربانی پہ بھی، پیار لٹتا ہی رہا!

سوچتا ہوں
قید میں محبوس گیتوں سے ہیں کیا رنگ لوں
سپین ڈستے ہی رہیں جو اُن سے کیا رنگ لوں
بازاروں میں بکتے پیار سے کیا رنگ لوں
یہ گھناؤنے رنگ، میلے، مٹیلے
تیری دل کش مانگ کا سیندور بن سکتے نہیں

رنگ بھر دوں کیا تمہاری مانگ میں
اے نگار زندگی ——

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

میری کہانی

کبھی کبھی مجھے تخئیل کے دریچوں سے
دکھائی دیتے ہیں بیتے دِنوں کے ویرانے
وہ دِن کہ جب مرے جذبات تھے سوگوار
لبوں پہ رقص کناں تھے حسرتوں کے افسانے
وہ دِن کہ جب رُخِ احساس پر تھی گردِ جمود
رہینِ خواب گراں تھا مرا شعورِ حیات
نظر ترستی تھی اُمید کی کرن کے لئے
میرے خیالوں پہ چھائی تھی اک بھیانک رات
راہِ حیات پہ یوں تھک کے گر پڑا تھا میں
ہو جیسے خاک بسر طائرِ شکستہ پر
کوئی ستارہ بھٹک جائے جیسے ظلمت میں
خزاں میں جیسے ہو پامال کوئی برگِ شجر
ابھی ہوا ہی نہ تھا دامنِ جگر صد چاک
مرے جنوں کو جگایا نہ تھا بہاروں نے
ہزار تلخیٔ غم تھی مرے تعاقب میں
پناہ مجھ کو نہ بخشی تھی خواب زاروں نے

کہاں تھی اشکوں میں خونِ جگر کی تابانی
بجھے بجھے سے تھے پلکوں پر آنسوؤں کے چراغ
دل و نگاہ پہ تھے غم کی ظلمتوں کے حجاب
گدازِ شوق سے سلگے نہ تھے جگر کے داغ
کسی کی مست نگاہوں نے یوں نہ دیکھا تھا
حیات جھوم کے ہو جاتی غرقِ کیفِ شراب
کسی کی زُلف کی خوشبو سے دِل نہ مہکا تھا
ابھی کھِلے ہی نہ تھے دِل میں آرزو کے گلاب
کسی کے لب پہ نہ پائی تھی شوخیٔ گفتار
جو میرے دِل میں جگاتی نیا جنون و فسوں
سمائی تھی نہ نگاہوں میں کوئی زہرہ جبین
جو لوٹ لیتی اشاروں سے میرا صبر و سکون

وہ ایک لمحہ تو جب میرے سامنے آئی
رُخِ جمیل و حسین سے نقاب سرکائے
ترے جمال کی گریز نزہتوں کی قسم
نگاہ و فکر کی وسعت میں پھول مُسکائے
دھنک کے قوسِ قزح میرے دِل پہ لہرائی
ہزار رنگ خیالوں میں جھلملاتے ہیں
تو آئی شانوں پہ بکھرائے ریشمی زلفیں
مری نظر میں حسیں خواب سرسراتے ہیں
بکھر گئے ترے عارض کے سیمگوں جلوے
پگھل گئے مرے احساس میں نجوم و قمر

تری بہارِ تبسم کی جلوہ سامانی
چمن میں جیسے کھل اُٹھے شگوفہ ہائے سحر
بہک گئے مرے ارماں وفورِ مستی میں
نگاہیں تیری ہیں گویا چھلکتے پیمانے
یہ کس ادا سے مری سمت تُو نے دیکھ لیا
جہاں میں عام ہوئے دو دلوں کے افسانے
ترے شباب نئی دوشیزگی کی خوشبو سے
مری حیات کے شام و سحر بہکتے ہیں
تو آئی موجۂ بادِ بہار کی مانند
مری اُمید کی کلیوں کے دِل دھڑکتے ہیں

تری نظر نے دیا کیفِ سوز و سازِ حیات
بھڑک اُٹھی مری آہوں میں زمزموں کی آگ
ہر اک سمت مسرت کے پھول کھلتے ہیں۔
بہارِ کیف میں ڈوبے ہیں سازِ شوق کے راگ
یہ کیا اثر ہے ترے پیار کی لطافت میں
میں تلخیوں سے بھی شدت سے پیار کرتا ہوں
ترے جمال کی رنگینیوں میں گم ہو کر
میں زندگی کے تصور میں رنگ بھرتا ہوں ——!

ہنسی کا محل نہیں پھر بھی آؤ دل کے ہنسیں
ہمارے حال پہ اہلِ زمانہ ہنستے ہیں
ہمارے شوق کی نوخیز شاخِ گُل کی طرف

نہ جا کتنی خزاؤں کے ہاتھ اُٹھتے ہیں
مگر جو آگ ہمارے دِلوں میں روشن ہے
یہ آگ ظلمت گیتی میں جگمگائے گی
کھلیں گے صرف اِسی آگ سے ہزاروں پھُول
یہ آگ حُسنِ چمن بن کے مُسکرائے گی

اب آؤ ہم کو گُزرنا ہے جن مراحل سے
غمِ حیات کے ان مرحلوں کی بات کریں
جُھکے گا خود ہی زمانہ ہمارے قدموں پر
ہم اپنے دل کے نئے ولولوں کی بات کریں ——

——x——

اکبر جے پوری

تجدیدِ عہد

اے زمینِ کاشمر! اے وادیٔ جنّت نشاں
تیری رونق دیکھ کر چکرا رہا ہے آسماں
زینتِ فطرت ہے تیرے پُرکشش دریا و ڈل
سینۂ آبِ رواں پر تیرتے لاکھوں کنول

تیرا ماضی باعثِ صد ناز ہے میرے وطن
تیرا گلشن بے خزاں تھا، پُرفضا تیرا چمن
تُو رہا زیرِ نگینِ اغیار کا صدیوں تلک
تیری محکومی پہ تھی شبنم فشاں چشمِ فلک

وادیٔ راحت فضا جب غیر کی محکوم تھی!
جبر و استبداد سے تیری فضا مسموم تھی
باغِ جنّت گو ترا محکومیت بردوش تھا
نغمہ زن تیری رگوں میں حُریّت کا جوش تھا

خوبیٔ قسمت سے تیری مِل گئے اب باغباں
رشکِ صد جنّت ہوا پھر سے ترا یہ گلستاں
خاک سے تیرے اُٹھے ہیں آج وہ خنجر بکف
آن پر تیری نہ آنے دیں گے جو کوئی حرف

حُریت کا تیرے افسانوں میں پنہاں ہے سبق
انقلابِ دہر تیری داستاں کا ہر ورق
کوشش و ایثارِ پیہم کا ہے تو آئینہ دار
تیرا ہر ذرّہ ہے دنیائے شجاعت در کنار
بادۂ گلفام سے لبریز ہے تیرا سبو
تیری پیشانی پہ رقصاں ہے شہیدوں کا لہو
کاروانِ سعیِ پیہم کی حسین منزل ہے تو
اے گلستانِ وطن! ایثار کا حاصل ہے تو
تیرے سر پر دیکھ کر تاجِ حُریت جلوہ گر
آستاں پر تیرے جھکتے ہیں جہانبانوں کے سر
تیرا گلشن ہے شہیدوں کے لہو سے لالہ خیز
راہ گم کردہ ہیں تیرے آستاں پہ سجدہ ریز

اُن شہیدانِ وطن کے خون کی ہم قسم
سرنگوں ہونے نہ دیں گے ہم کبھی تیرا عَلَم

بشارت سلیم

شاہکار

تخیّل کے پردوں پہ دُھندلا سا خاکہ کبھی میں نے اک برق وش کا اُبھارا
اک ان دیکھے محبوب کا جو تصوّر کبھی جھلملایا اُسی کو نکھارا
سحر کار شوخی بہاروں کی ہر انگ میں اُس کے میں نے رچائی
ستارے چُنے بامِ افلاک سے اور یوں مانگ میں اُسکی افشاں سجائی
بلوّریں خیالوں کا اوڑھے لبادہ دھنک وار خوابوں سے اُبھری حقیقت
جو بُنتا گیا جال رنگین تصوّر تو سانچوں میں ڈھلتی گئی ایک صورت

مرے بربطِ دل کے تاروں سے نغموں کا ایک سیلاب سا پھُوٹ نکلا
وہ عالم بھی کیا عالمِ بےخودی تھا ہر اک سانس تھی ایک خاموش نغمہ
حریمِ فلک سے ہمہ شعر و نغمہ ضیا پاش آئی تھی تنویر جیسی
شبستاں خیالوں میں رقصاں تھی جیسے مشیّت نے کر دی وہ تخلیق ویسی
جوالا سی سینے میں بھڑکی، لگی لہلہانے یہ سوئی حسرت کی کیاری
تمنّا کی کلیوں میں پھر جان آئی، جو آئی محبّت کی بادِ بہاری

بدلتی رہی کروٹیں خلش پیہم حُسنِ مجسّم کی تفسیر کیا ہے
بہت خوب صورت، بہت ہی حسیں میرے اِس خوابِ مرمر کی تعبیر کیا ہے
سجی بزمِ خوباں تو پیکر تراشے، بگاڑے بنائے کئی بار لیکن
تخیّل میں اُبھری جو رعنائیاں تھیں وہ ان پیکروں کو نہ ہو پائیں ممکن
ہیولے حسینوں کے، سیمیں وہ شعلے، مری جستجو کے وہ امروز و فردا
خلا میں تصوّر کے چند روز تھر کے بے ڈھنگ ملبوس کا سا پھریرا

نگاہوں میں کچھ داستانیں لئے تم اچانک سرِ رہگزر مل گئی ہو
حقیقت تصوّر کے آغوش میں ہے، مجھے جیسے میری نظر مل گئی ہو
ادھر آ بسالیں گے خوابوں کے کھنڈر یہ کھویا سا دِل یوں تجھے پا گیا ہے
ازل سے رہی ہو مرے ساتھ جیسے اگرچہ ملاقات کی ابتدا ہے!
تمنّا کی کونپل، تصوّر کا پیکر، مدھر بھیرویں ساز، جھنکار تم ہو
نگاہ و تخیّل کو ہے ناز جس پر مرے فکر و فن کا وہ شہکار تم ہو

قاضی غلام محمد

بلّی

ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے بلّی
یہ تیری چال مجذوبوں میں بھی کمیاب ہے بلّی
ترے پنجوں کے گُن جب مجھ سے شاعر لوگ گاتے ہیں
گمانِ ناخنِ تدبیر اُن کو یاد آتے ہیں
اُچھل کر تیرے مُنہ میں خود ہی جو چوہا چلا آیا
وہ قیدِ زندگی اور بندِ غم دونوں ہی سے چھوٹا
کبھی چوہوں کے رومانوں میں شامل ہو گئی تن کر
صفائی سے تو ہیروئن کو لے بھاگی وِلن بن کر
خدا ترسی اب کہاں میری اس دُنیا میں باقی ہے
ترے مُنہ سے اگر وہ رال بن بن کر ٹپکتی ہے
بڑھاپے میں براہِ مصلحت حج کو چلی جانا
تو پھر چوہے قدم بوسی کو خود آئیں گے روزانا
عجب کیا ہے اگرچہ مرد کی ہیبت اکثر اُچھلتی ہے
تری رفتار میں آواز کچھ شامل نہیں ہے

تیری آنکھوں میں یہ جو آسمانی روشنی سی ہے
پرندوں کی صفوں کو درسِ تاریکی یہ دیتی ہے
تری طینت کی پاکی زہد کا ایمان ہو جائے
تری سنجیدگی پر فلسفی قربان ہو جائے
اگر بلی نہ ہو چوہوں کا ایسا پروبلم ہو گا
حسینانِ جہاں کا ناک میں ہر وقت دم ہو گا



سُلطان الحق شہیدی

خلاصہ

بے کراں آسماں
چاند سُورج لیے
ظلمتوں سے مسلسل نبرد آزما
جگمگاتے ستاروں کی اک انجمن
گردبادوں کی ہیبت سے مٹی ہوئی
شام سے تا سحر دھول اُڑتی ہوئی
ریت چنگاریوں کی طرح پر فشاں
سیل در سیل طوفانِ موج و بلا

وقت کے تیز دھارے ہیں پیہم رواں

کچھ سکوں سا ملا اس کشاکش کو جب
سرد ہونے لگے کوہ آتش فشاں
گھاس اُگنے لگی اور زرخیزیاں
زیست کو اپنی جانب بلانے لگیں

چند کیڑے پلے، چند حیواں بڑھے

اور تکمیلِ انساں کی صورت ہوئی
دستِ فن کار پتھر تراشا کئے
پھر درختوں کے کھوکھے منقش ہوئے
اور غاروں کو زینت ملی حسن کی
نیستاں صرفِ تعمیر ہونے لگے
ساحلِ آب جو پر قبیلہ بسا
دامنِ دشت میں قافلہ دور تک محوِ تخلیق ہے
جس طرف دیکھئے لہلہانے لگیں، کھیتیاں فصل کی
آگ ایجاد ہونے سے کایا پلٹ ہو گئی روزمرہ کی
اور فولاد نے تو کہیں سے کہیں
آدمی کے لئے سربلندی کا سامان کیا

ایک جذبۂ خودی خودسری کا نپنے لگا
راہِ اخلاص میں نخوت و بغض کی
دُور تک ایک دیوار حائل ہوئی
اور خطوں کی تقسیم ہونے لگی
نیل کو سوئے گنگا نہ بہنے دیا
کوئی سنگم دکھائی نہ دینے لگا
ایک دھرتی جو تھی اب اسی کے کئی نام ہونے لگے
عافیت سے بہت دُور ہونے لگی
نسلِ آدم کا جی خون سے بھرنے لگا
گو مذاہب نے ہرچند روکا مگر
فوقیت کا جنوں سر پھرا رہ گیا

دوسروں کو دبانے کی خاطر یہی دوڑ جاری رہی
ایک قبیلہ جو تھا وہ بٹا پھر کٹا اور کٹتا گیا
وقت کے تیز دھارے جو بڑھتے گئے کھل گیا اک نیا منظرِ دل کشا

شہبازِ تخیّل نے پرواز کی
توڑ لایا ستارے فلک سے
زمیں پر سجانے لگے
آتش و آب و آہن پر قبضہ ہوا
جوہری زندگانی کا جب رچا ہوا
زیرِ فرمانِ آدم ہوئی یہ فضا
شرق سے غرب تک
آن کی آن میں بات دلدار کی کان میں آگئی
وسعت بحر و بر
سمٹ سمٹا کے لمحوں کی میزاں میں آگئی
عرش منظر دکھائی دیے فرش پر
بستیاں جنتوں کی مقابل ہوئیں

دورِ حاضر یہی ہے مگر دوستو جب حقایق سے دوچار ہوتے ہیں ہم
دیکھتے ہیں فقط
قومیت، رنگ، مذہب، علاقائیت
پارہ پارہ ہوئی جس سے انسانیت

قصرِ سیمیں میں ملبوسِ زرّیں سجا

دِل میں افلاس کا درد ہو تو کہیں
خستہ حالوں کی ہو خستہ حالی رواآہ! کیا ستم
ایشیا اور یورپ کی تفریق ہے۔
جس سے تفریق قائم رہے گی سدا سب بنانے لگے ہیں وہی اک اٹم
قمقمے روشنی اور شفاف تن
پھر بھی کالا ہے تہذیبِ حاضر کا من
کھِل کھلا ارتقا طلسمِ مکر و فن

آج کا آدمی ہے وہی قافلہ
دشت میں دُور تک ساحلِ آبِ جو پر جو آباد تھا
جس کی ماں ایک تھی جس کا باپ ایک تھا
جس کے سب بہن بھائیوں میں رشتہ ہوا
اپنی بُنیاد کو بھول کر —— غیر سب کو سمجھنے لگا
اس لئے اس کی یہ سربلندی غلط

آدمی آدمی میں محبّت نہ ہو
پھر تو امریکی عربی و ہندی غلط
صرف تعمیر جب دورِ اُلفت نہ ہو
کیا نہیں ساری منصوبہ بندی غلط

اہلِ گلزار کی اِک شکایت ہے یہ
کیا کبھی آپ نے غور اس پر کیا
پھول کھِلتے رہیں اور خوشبو نہ ہو

اصل اس کی یہ ہے ——

دل میں مالی کے اخلاص و اُلفت نہیں
یہ مثالِ عام ہے گلشنِ دہر کی

اُنس و اخلاق و ایثار و آداب میں
اِک توازن ہے اِنسانیت کے جذبات کا
جائزہ اِن سے ملے جو بھی حالات کا
وہ مسائل صفائی سے سُلجھائے گا
راحتِ رُوح و آرامِ جان پائے گا
جنگ کرنے کی نوبت نہ آ جائے گی
اور دولت بھی اس طرح بچ جائے گی
غربت و مُفلسی دُور ہو جائے گی
ہر طرح امن ہو گا خوشی چھائے گی
شہد و شکر ملے گا جہاں چاہیں گے ——
وادیاں اور یہ سارے دشت و جبل
مثلِ جنّت نظارہ دکھا جائیں گے
ساری دُنیا بنے گی وہی قافلہ
جو سرِ آب جو دشت میں محوِ تخلیق تھا
جس کی ماں ایک تھی جس کا باپ ایک تھا

یعنی دُنیا ہی گھر میں بدل جائے گی
اور پھر اپنی معراج کو پائے گی ——!!!

فاروق نازکی

تثلیث

میں کہ ہوں امن کے گلشن کا شفق رنگِ گلاب
میرے ہونٹوں پہ ہے شبنم کی ملائم تحریر
میرے اوراق پہ مرقوم ہے اُلفت کی کتھا
قصۂ ذوقِ نظر
قصہ نغمہ و وصل
اور ملاقات کی شاموں کے سہانے قصّے
آتشِ لالہ و گُل مجھ سے جلا پاتی ہے
چشمِ نرگس کو دیا میرے ہی جلووں نے خمار
میں ہوں پیغمبرِ گل اور بہاروں کا رسول
میری خوشبو سے صبا اپنا بدن دھوتی ہے
پیکرِ شاخ سے جب کوئی ہٹاتا ہے مجھے
تو کسی شوخ کے جوڑے میں سجا رہتا ہوں
میں کہ تہذیب محبّت سے ہوں وابستہ کئی صدیوں سے
میں وفاؤں کی علامت ہوں جفاؤں کا رقیب
میں کہ ہوں امن کے گلشن کا شفق رنگ گلاب
کس نے سوچا ہے لوٹے میری عظمت کا شباب

آتشِ گل سے وہ بد ذوق جھلس جائے گا

میں کہ ہوں وقت کی ظلمت میں فروزاں قندیل
میری کرنوں میں نہا اُٹھتے ہیں لاکھوں ذرّے
ہے میری تابشِ خود سوز کا حاصل اتنا
گرمیٔ محفلِ دل
قامتِ سروِ خیال
رقصِ پروانۂ غم
شعلۂ عارضِ خنداں کا جمال
نگہِ جس پہ بکھرے ہوئے خوابوں کا سیماب
عظمتِ شعلہ رخاں
نزہتِ ماہ وشاں
میری تابش سے ہے بازارِ بتاں میں رونق
میں کہ ہوں وقت کی آنکھ پر چھائے ہوئے خوابوں کا امین
دوستو، جلوہ گہِ امن کی قندیل ہوں میں
صرصرِ وقت مجھے کیسے بجھا سکتی ہے۔
میں کہ ہوں آگ کے دریا کی تڑپتی ہوئی موج
میری سیماب طبیعت نے دیا
درسِ جنوں مجنوں کو
لیلائے وقت کی کشتی کو لئے دوش پہ میں
خارزاروں سے بیابانوں سے ہو آتا ہوں
جب بھی رکتا ہوں تو اِک کوہِ گراں کی مانند
جب بھی چلتا ہوں تو میں جاں سے گزر جاتا ہوں ——!

فرحت گیلانی

گفتنی

وہی نغمہ جو پلتا ہے تیری خاموش سانسوں میں
بڑی مدت سے میری تیرگی میں رنگ بھرتا ہے
بکھر جاتے ہیں جب ہر سو سلونی رات کے سائے
تو تیری یاد کا ہر خوشنما پیکر نکھرتا ہے

گذشتہ رات میں نے یاد کی پُر پیچ وادی میں
وہ بوڑھا پیڑ دیکھا جس پہ ہم نے نام لکھا تھا
ہوائیں عنبر افشاں اور فضائیں گل بداماں تھیں
سکوتِ نیم شب میں دُودھ کا مہتاب چمکا تھا

جُدائی کی سُلگتی رات ہو یا شامِ مے خانہ
میں اپنے دِل میں تیری داستاں لیکر گزرتا ہوں
فرازِ دار ہو یا دشتِ غم یا کنجِ تنہائی
میں تیری یاد کا اِک کارواں لیکر گزرتا ہوں

یہ دنیا جس کی ویرانی میں لاکھوں بستیاں گُم ہیں
میرے آباد ویرانے سے کتنی دُور بستی ہے
یہ بستی جس کے پردے میں ہزاروں پھُول پنہاں ہیں
میرے ویران آبادے سے کتنی دُور بستی ہے

میں تنہائی کی ویراں رات کا دیرینہ ساتھی ہوں
میری خلوت میں لاکھوں جنّتیں آباد رہتی ہیں
مجھے اپنے اکیلے پن سے گھبرانا نہیں آتا!
میری خلوت میں لاکھوں جلوتیں آباد رہتی ہیں
شفق کی سُرخ گرمی جھالرِ نفس کا ریشمی آنچل
صبح کا نرم جھونکا، شام کا پہلا ستارہ شب کی انگڑائی
ہوا کی تازگی، پھولوں کا رس، تاروں کی تابانی
ادائیں، حسن، غمزے، نازکی، انداز، رعنائی
تبسم کی کرن، آنکھوں کی ٹھنڈک، روپ کی تابش
نگاہوں میں لرزتے ان کہے گیتوں کی استھائی
جھنک پازیب کی، جھنکار میں سنگیت کا طوفان
حنا کا رنگ، آتش بازیوں کا رقص، تنہائی
مری خلوت میں لاکھوں جنتیں آباد رہتی ہیں

سرِ بازار جو اپنا گریباں چاک کرتے ہیں!
مری خلوت گزینی کو جنوں کا نام دیتے ہیں
مجھے شکوہ نہیں لیکن میرا دل اوب جاتا ہے
خطا کارانِ محفل جب مجھے الزام دیتے ہیں

تسنیم کاشمیری

ڈل اور چاندنی

رت سہانی چاندنی اور جھیل ڈل
یہ فضا یہ خامشی اور جھیل ڈل

آسمان پر چاند تاروں کا سماں
دُور تک چھایا فضاؤں میں دھواں
آب میں اُتری ہوئی ہے کہکشاں
دھیمی دھیمی روشنی اور جھیل ڈل

دُور تک تاحد نظر ہنستے کنول
ملگجے سائے ہیں یا شامِ غزل
کھُل گئے ہیں گیسوئے جاناں کے بل
یہ انوکھی تیرگی اور جھیل ڈل

یہ روپہلی چھاؤں یہ روشن چراغ
آج چھلکے ہیں مسرّت کے ایاغ
پا رہی ہے زندگی بھی فراغ
جیسے دورِ میکشی اور جھیل ڈل

آج فطرت کی دوشیزہ بے نقاب
آج ہر ذرّے پر آیا ہے شباب
ہے میرے احساس کی حالت خراب
آہ! میری بے خودی اور جھیل ڈل

ڈھل رہی ہے سحر کے سانچے میں رات
اب لبوں تک آ رہی ہے دِل کی بات
مُسکرا اُٹھی ہے سلمائے حیات
بے زباں کی نغمگی اور جھیل ڈل

یاد ہے تیری چتون کا ساز
چھو رہی ہے دِل کو تیری ہی آواز
کھول دے آکر اُن پر اپنے راز
منتظر ہے چاندنی اور جھیل ڈل
یہ فضا یہ خامشی اور جھیل ڈل

شجاع سُلطان

زمرّد کی بستی

شب گزیدہ جبیں
ہونٹ لمحوں کی تُندی میں بہتے ہوئے
آنکھیں سرشاریوں کے کفن میں لپٹی ہوئی سرد لاشیں
بدن راہ گزاروں پہ کٹتے ہوئے
کالے کرینوں میں لپٹے ہوئے شہر کے بام و در
ہر طرف دور تک
تیرہ سفاکیوں کے اُبھرتے ہوئے تند سایے

سحر تابہ شب
حکمراں تیرگی ....!
یہ زمرّد کی بستی کی تصویر ہے

قافلے قافلے
سِلسلے سلسلے
یادِ یارانِ شب
غم گسارانِ شب
سب کہیں کھو گئے
آزری کے طلسمات سے آشنا
ہاتھ کٹ کر گرے
سارے تاریخ گو
آج دریوزہ گر——— !!!

اشرف ساحل

سفر

اپنے احساس کے اندھیروں میں
میں بھٹکتا رہا تھا صدیوں سے
ظلمتوں کے سفر سے تنگ آ کر
روشنی کے خلاؤں میں کودا
رنگ و بو کے طویل صحرا میں
دائروں سے اُلجھ گیا جا کر
کی جو اُڑنے کی آرزو میں نے
بال و پر ہی نے ساتھ چھوڑ دیا
اس کشاکش میں میرے ہاتھوں کی
ساری طاقت جواب دے بیٹھی
نیند آنے لگی مجھے
اک دن

ساعتوں کی صلیب ٹوٹ گئی
زندگی دائروں سے چھوٹ گئی

اِک ہنگامے پہ موقوف ہے رونق

ڈرامے

۱. گھروندے — علی محمد لون

۲. ش سکار — سجود سیلانی

۳. ایک رات نان — بنسی نردوش

علی محمد لون

گھروندے

کردار

جبیب	بابا
سندری	گلی
ماں	غفار

کشتی کا اندرونی حصہ۔ سامنے لکڑی کی دیوار میں کھڑکیوں پر چٹائیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اسی دیوار پر لگے ہوئے ایک تختے سے طاقچے کا کام لیا جا رہا ہے۔ اس پر تانبے اور المونیم کے چند برتن سیدھے رکھے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے دائیں اور بائیں بازوؤں میں دو دروازے نظر آتے ہیں جو کشتی کے دوسرے حصوں میں کھلتے ہیں۔ بائیں کونے میں چولھا ہے جس پر سندری بھات اور ساگ پکا رہی ہے۔ سندری پچیس سال کی ایک خوبصورت عورت پھرن پہنے ہوئے جس کا رنگ زیادہ استعمال سے بگڑ گیا ہے۔ سر پر ایک میلی سی اوڑھنی کے نیچے سے سرخ رنگ کا کسابہ[1] دکھائی دے رہا ہے۔ جس پر چاندی کے دو بڑے بڑے پن لگے ہوئے ہیں۔ سندری کی آنکھیں بڑی ہیں۔ لیکن ان میں اداسی ہے اس کے کانوں میں دو بڑی بڑی بالیاں لٹک رہی ہیں۔ سندری طاقچے پر سے کوئی چیز اُتار کر اوکھلی میں پیسنے لگتی ہے۔ جبیب بائیں دروازے سے گنگناتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ جبیب کی عمر کوئی بائیس سال کے قریب ہوگی۔ اُلجھے ہوئے بال

[1] ۔ سر کی تزئین کے لئے کشمیری بیاہتا عورتیں سرخ کپڑے کا بنا ہوا ایک دائرہ سا پہنتی ہیں جسے کسابہ کہتے ہیں۔

وحشت ناک آنکھیں، چہرے سے تلخی کا اظہار ہو رہا ہے۔

حبیب:۔ (اپنے آپ سے گنگناتے ہوئے اور چٹائی اٹھاتے ہوئے) سُہ چھُ تتہ تہ بو چھس ییتے۔ بار صاحبو وینہ یو زار۔ بار صاحبو وینہ یو زار (پھر اسٹیج کے مرکز میں رُک کر سندری سے) —— سندری کیا پک رہا ہے آج۔

سندری:۔ (پیسا بند کرتے ہوئے اور پیسی ہوئی چیز ہانڈی میں ڈالتے ہوئے) بھلا بتاؤ تو کیا پک رہا ہوگا

حبیب:۔ (تلخ لہجے میں) وہی ساگ ہوگا۔

سندری:۔ (اپنے کام میں مشغول ہے۔) اور نہیں تو کیا گوشت پکاؤں تیرے لئے۔ بابا کی نوکری جب تک نہیں لگے گی۔ جب تک ساگ ہی پکے گا بھیا۔

حبیب:۔ لیکن کب تک سندری؟ (منہ کھولتے ہوئے) یہ دیکھو..... یہ ..... ساگ کھاتے کھاتے منہ کا ذائقہ ہی خراب ہوگیا ہے۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ منہ کے اندر کبھی گوشت کی بوٹی گئی ہی نہیں (آہ بھرتے ہوئے) اچھا بھئی۔ دیکھیں، کب تک یہ گھاس کھائی جائے گی ہم سے (پھر گنگنانے لگتا ہے) بار صاحبو وینہ یو زار

سندری:۔ کیا گا رہے ہو حبیب؟

حبیب:۔ اُن مزدوروں کے گیت جو ملہ سلطان کا بوٹ صاف کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہی تو گا رہے تھے۔ شاید اس خوشی میں کہ سورج پہاڑوں کے اُدھر لڑھک رہا ہے اور انھیں آج کی مزدوری کے پیسے ملنے والے ہی ہیں۔ کیا تم نے نہیں سُنا۔

سندری:۔ نہیں تو

حبیب:۔ کیسے نہیں سُنا ہوگا۔ آواز تو صاف آرہی تھی۔

---

[2] وہ (محبوب) وہاں ہے اور میں یہاں ہوں۔ وہائی ہے۔ وہائی ہے

سندری :- میں جانے کس کام میں جُتی ہوئی تھی

حبیب :- چٹائی اُٹھا کر سُن لیا ہوتا۔

سندری :- (اُداس لہجے میں) چٹائی اُٹھتی تو ماں جانے کیا کچھ کہتی۔ اچھا ہوا جو میں نے مزدوروں کا گیت نہیں سُنا (مزدوروں کا گیت دور سے سنائی دیتا ہے) ارے یہ تو پھر وہی گیت گانے لگے۔

حبیب :- ہاں لو اب چٹائی اُٹھا کر سنو۔ آواز صاف آئے گی

سندری :- (گھبراتے ہوئے) نا بابا چٹائی اُٹھی تو غضب ہو جائے گا۔ مجھے گیت نہیں سُننا ہے۔ مجھے اب گیتوں سے نفرت سی ہو گئی ہے

حبیب :- بڑا اچھا گیت ہے سندری — لالہ گو ییو یا نیری وتے. کونگہ پوشہ روٹ نالہ متے — سُہ چھُتے بو چھس بیتے. بار صاحبو ونہ یو زارے[1]

کیا گیت ہے سندری

سندری :- (کچھ کھو سی جاتی ہے) بار صاحبو ونہ یو زارہ

حبیب :- میں نے کہا گیت کیسا ہے —؟ سندری. تمہیں پسند آیا

سندری :- (پہلے کی طرح) بار صاحبو ونہ یو زارہ

حبیب :- (چونکتے ہوئے) سندری

سندری :- (اپنے آپ میں آتے ہوئے) کیا ہے بھیا

حبیب :- سندری تمہارا چہرہ — تم اُداس کیوں ہو گئیں

سندری :- میں کیوں اُداس ہونے لگی (چولھے میں پھونک مارنے لگتی ہے (اور پھر) دیکھو تو میں ہنس رہی ہوں۔

حبیب :- میں جانتا ہوں سندری۔ یہ گیت بچھڑے ہوؤں کی یاد دلاتا ہے نا۔ اسی لئے تم اُداس ہو گئیں۔ لیکن کیا کریں سندری۔ ابھی وہ گیت کسی نے لکھا ہی نہیں جس کے گائے جانے سے بچھڑے ہوئے مل بھی جائیں

---

[1] لالہ (محبوب) یا پورر (سرزمین زعفران) کی اور چلا گیا۔ زعفران کے کھیتوں نے اسے گلے لگایا وہ وہاں رہ گیا اور میں یہاں اکیلی رہ گئی۔ دہائی ہے دہائی ہے۔

سندری :۔ (ٹالتے ہوئے) جانے کیا کہہ رہے ہو تم ـــ جب سے تمہارا اسکول چھوٹا ہے، عجیب باتیں کرنے لگے ہو۔

جبیب :۔ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) سچ تمہیں میری باتیں عجیب لگتی ہیں۔

سندری :۔ ہاں

جبیب :۔ لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں. ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ابھی وہ گیت کسی نے نہیں لکھا ہی نہیں جس کے گائے جانے سے بچھڑے ہوئے مل جائیں اور جب تک ایسا گیت لکھا نہیں جاتا۔ تمہارا لالہ یا جوہر کی راہوں کے اُس پار ہی رہے گا اور تم اُس سے مل نہ سکو گی۔

سندری :۔ (بُرا مناتے ہوئے) بکواس

جبیب :۔ اب میں بک رہا ہوں۔

سندری :۔ اور نہیں تو کیا۔ کیسی بُری بُری باتیں مُنہ سے نکالتے ہو۔ جاؤ مجھے کام کرنے دو۔

جبیب :۔ تمہاری یہی بات تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہو۔

سندری :۔ یہ ذرا سی بات کہی تُم نے

جبیب :۔ اور نہیں تو کیا بڑی بات کہی ہے میں نے

سندری :۔ جاؤ میں نہیں بولوں گی تم سے

جبیب :۔ ارے بابا تو نہ بولو۔ مگر یہ تو بتاؤ سندری مُجھ سے روٹھ کر پھر کس کے ساتھ باتیں کرو گی ؟ (سندری کی خاموشی سے تنگ آتے ہوئے) بولو خاموش کیوں ہو گئیں۔ مجھ سے روٹھ کر کس کے ساتھ باتیں کرو گی

سندری :۔ تمہیں اس سے مطلب ؟

جبیب :۔ ہے کیوں نہیں۔ جبھی تو پُوچھ رہا ہوں۔ بولو ڈل کے اس خاموش پانی سے باتیں کرو گی ؟

سندری :- نہیں تو
جبیب :- تو کیا زبروَن کے اِن کالے پتھروں کو پکاروگی
سندری :- بے جان چیزوں کو پُکارنے سے حاصِل
جبیب :- ڈل کے پانی سے نہیں۔ زبروَن کے پتھروں سے نہیں تو آخر کس سے باتیں کروگی
سندری :- کِسی سے بولوں پر تُم سے تو نہ بولوں گی۔
جبیب :- (شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ) تم لاکھ چھپاؤ سندری۔ میں جانتا ہوں تم کس سے باتیں کروگی
سندری :- (چونکتے ہوئے) کس سے ؟
جبیب :- لالہ سے اور کس سے
سندری :- لالہ سے ؟ مگر —— مگر وہ تو —— وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں
جبیب :- وہ نہیں۔ اُس کی تصویر تو تیرے پاس ہے
سندری :- تصویر ؟ کیسی تصویر
جبیب :- واہ سندری، ایسی بھولی بنتی ہو جیسے سچ مچ کوئی تصویر تیرے پاس ہے ہی نہیں
سندری :- میں سچ کہتی ہوں۔ جبیب، میرے پاس کوئی تصویر نہیں
جبیب :- جھوٹ بالکل جھوٹ (اُس کے قریب جاکر سرگوشی میں) سنگار میز کی دراز میں کیا چھپا رکھا ہے تم نے
سندری :- ہٹ یہاں سے۔ نہیں تو ماروں گی لکڑی
جبیب :- دیکھا میں نہ کہتا تھا
سندری :- (تنگ آتے ہوئے) جاتے ہو یہاں سے یا میں ماں کو پکاروں
جبیب :- اری ماں کو کِس لئے پکارتی ہو۔ لو میں چُپ رہتا ہوں۔ نہیں مگر کھانا جلدی پکاؤ ذرا —— مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے

سندری:۔ تو میں کیا کروں

حبیب:۔ اچھا بھئی پکارو اپنی مرضی سے (وقفہ) لیکن ایک بات تو بتاؤ سندری

سندری:۔ پھر وہی شرارت والی بات ہو گی

حبیب:۔ نہیں بڑی سنجیدہ بات ہے۔ تم ابھی ابھی کہہ رہی تھیں نا کہ بے جان چیزوں کو پکارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر یہ لالہ کی تصویر کے ساتھ تم کیا کیا باتیں کرتی رہتی ہو۔ دیکھو بھئی چھپانا مت۔ میں نے تمہیں کئی بار اس تصویر کو اپنے آنسوؤں سے بھگوتے ہوئے دیکھا ہے

سندری:۔ (اداسی کے ساتھ) تم نے ایسا کیوں کہا پگلے۔ جانے میں نے اس تصویر سے کیا کچھ کہا ہو گا۔

حبیب:۔ ہاں کون جانے تم نے کیا کچھ کہا ہو گا۔ لیکن میں نے جو سنا وہ تو یہی تھا۔ (عورتوں کی نقل اتارتے ہوئے) اب تو آجاؤ لالہ، کب تک اپنی سندری سے روٹھے رہو گے۔ لیکن سندری اس بے جان تصویر نے تو کوئی جواب دیا۔

سندری:۔ (تڑپتے ہوئے) حبیب اسے بے جان مت کہو۔ وہ تو میری زندگی ہے میرا سب کچھ ہے۔

حبیب:۔ (طنزیہ) اونہہ زندگی۔ کب تک ان بہلاوؤں کے سہارے رہو گی بہن۔

سندری:۔ جب تک آخری سانس ہے، اور پھر حبیب، تم نے تو میری ہی باتیں سنی ہیں۔ یہ نہیں سنا کہ اس تصویر نے مجھ سے کیا کچھ کہا ہے سنو گے تو اسے بے جان نہ کہو گے۔

حبیب:۔ کیا کہا اس تصویر نے

سندری:۔ جب بھی میں اس تصویر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہوں تو جیسے اس کی آنکھیں کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں —— آنسوؤں کو روک لے سندری میں بہت جلد آ رہا ہوں بہار کے ساتھ

(آواز بھر جاتی ہے) لیکن جبیب بہار تو آ گئی مگر وہ — وہ ....
جبیب :۔ مگر لالہ نہیں آیا ابھی تک۔ یہی نا
سندری :۔ ہاں وہ ابھی تک نہیں آئے جبیب
جبیب :۔ تم پچھلی سات بہاروں سے لالہ کا انتظار کر رہی ہو، اُسے آنا ہوتا تو اب تک آ بھی چکا ہوتا۔ کون جانے سندری جس طوفان نے سارے پنجاب کا دل ہلا دیا تھا اُس نے تمہارے لالہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔
سندری :۔ نہیں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اور ایک دن ضرور آئیں گے —— (وقفہ — اس کے دوران اندھیرا کشتی میں پھیلنے لگتا ہے۔ مزدوروں کا گیت پھر تیز ہوتا ہے۔ چولھے کی آگ پھر بھڑک اُٹھتی ہے۔ جبیب چٹائی کو اُٹھا کر باہر جھانکتا ہے۔ سندری اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیکر گیت سنتی ہے۔ آگ کی روشنی میں اُس کی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چولھے کی آگ اور زیادہ بھڑک اُٹھتی ہے جبیب کچھ سونگھ کر کھڑکی پر چٹائی گرا دیتا ہے۔ اور سندری کی طرف دیکھ کر گھبراتے ہوئے انداز میں کہتا ہے
جبیب :۔ اری دیکھنا سندری، بھات جل گئے شاید
سندری :۔ (چونکتے ہوئے اور ہانڈی کا ڈھکن اُٹھاتے ہوئے) ارے اب کیا ہوگا
جبیب :۔ آنچ کم کر دو پہلے
سندری :۔ (آگ پر پانی کی چھینٹے مارتے ہوئے) مگر اب ہو گا کیا۔ بُو تو ساری کشتی میں پھیل گئی۔ ماں نے سونگھا تو —— ؟
جبیب :۔ کچھ نہیں ہوگا۔ میں جو یہاں ہوں۔ بارھا جو وہنہ یو زار رسہ چُھوتے تہ بو چھس ییتے، بارھا جو وہنہ یو زار (گاتے ہوئے باہر دروازے سے نکل جاتا ہے)

سندری:۔ (بھات کی ہانڈی چولھے سے اُتار کر اس پر ایک اور برتن چڑھا دیتی ہے) بار ما جبو ونبو زار۔ دہائی دے کر کچھ ہوتا تو میں بھی نیکے کے ٹکڑوں پر پلنے کے بجائے اپنے گھر کی مالکن ہوتی۔ گھر میں وہ ہوتے بچے ہوتے سب کچھ ہوتا۔ (رونے لگتی ہے)

ماں :۔ (دائیں دروازے سے داخل ہوتے ہوئے) سندری

سندری:۔ چونکتے ہوئے اور اپنے آنسو کو پونچھ کر) الٰہی خیر

ماں :۔ (چلاتے ہوئے) اری او سندری

سندری:۔ کیا ہے ماں

ماں :۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں

سندری:۔ کچھ نہیں ماں۔ کچھ بھی تو نہیں ...... وہ ذرا آنچ تیز ہو گئی اور —— اور بھات جل گئے

ماں :۔ آنچ تیز ہو گئی —— کیوں؟ تمہارے ہوش کہاں رہتے ہیں

سندری:۔ (رک رک کر) وہ ماں ..... وہ —— وہ حبیب آیا تھا۔ باتوں میں لگا لے رکھا مجھے اور آنچ تیز ہو گئی۔

حبیب۔ (بائیں دروازے سے داخل ہوتے ہوئے) ہاں ماں سندری ٹھیک کہہ رہی ہے قصور میرا ہی ہے۔ میں نے ہی اُسے باتوں میں لگائے رکھا تھا۔

ماں:۔ ارے جا جا تو کیا اسے باتوں میں لگائے گا۔ یہ تو تم جیسے دس لونڈوں کو انگلیوں پر نچائے گی۔

سندری:۔ ماں

ماں :۔ (بھڑکتے ہوئے) میں جانتی ہوں تم کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو؟

حبیب :۔ جانتی ہو ماں تو کچھ کرتی کیوں نہیں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ سندری ہمیشہ ان ہی خیالوں میں کھوئی رہے۔

سندری :- خدا کے لئے خاموشی ہو جاؤ حبیب

حبیب :- (سندری کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے) تمہیں اور کچھ کہنا ہے ماں

ماں :- ہونہہ تمہارا تو دماغ ہی پھر گیا ہے۔ جب دیکھو الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو ــــ جاؤ میں تمہارے مُنہ نہیں لگتی۔

حبیب :- مُنہ لگو گی تو کیوں کر۔ میں تمہارا اپنا بیٹا ہوں نا

سندری :- خدا کے لئے حبیب

ماں :- اچھا تو بات یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ تم ہی مجھے اس کی طرف سے سوتیلی ماں کا طعنہ دینے لگے ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ پٹی بھی اُسی کی پڑھائی ہوئی ہے۔ خیر آنے دو اُنہیں۔ میں آج فیصلہ کر کے ہی رہونگی۔ اس گھر میں اب سندری رہے گی یا میں رہوں گی ــــ دیکھنا آنے تو دے اُنھیں۔ (جاتی ہے)

سندری :- حبیب یہ تم نے اچھا نہیں کیا

حبیب :- لو اب تم بھی اُلٹا مجھ پر ہی برس پڑو گی۔ تمہارے لئے ہی تو کہا ہے

سندری :- لیکن حبیب اس کے باوجود بھی تم مجھے بچا نہ سکے۔ ماں اب بابا سے جانے کیا کیا کہے گی۔

حبیب - یہی تو رونا ہے سندری، بات ہم تک ہی رہتی تو کیا ہوتا

سندری :- ہاں بھیا۔ بابا بیکاری کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں۔ سات سال کی بیکاری، اس پر ماں کی جلی کٹی باتیں سُنیں گے تو کتنے پریشان ہونگے

حبیب :- دراصل سندری یہ روز روز کے جھگڑے بھی تو بابا کی بیکاری کا ہی نتیجہ ہیں۔ کاروبار ہوتا۔ کھانے پینے کی فکر سے آزادی ہوتی مصروفیت ہوتی تو لڑائی جھگڑوں کے لئے کسے فرصت تھی۔ یہ سب کچھ سوچ کر مجھے ماں کی حالت پر بھی ترس آتا ہے۔ بابا کی بیکاری تو ہم سب کے لئے جان لیوا بن رہی ہے، اُس پر ہر طرف سے قرضخواہوں کے تقاضے۔ اچھا بھلا آدمی پریشان ہو جائیگا

اِن حالات میں

سندری :۔ ہاں بھیا ماں مجھ سے الجھتی ہے۔ شاید اِس لئے کہ میں آج سات سال سے یہاں بڑی بڑی اُن کا اِنتظار کر رہی ہوں۔ بابا میرا بوجھ کو آخر کب تک اُٹھاتے پھرینگے (جذباتی انداز میں) حبیب تمہارے لالہ بھی آجائینگے یا میں یونہی راہ تکتی رہ جاؤں گی۔

حبیب :۔ کون جانے سندری

سندری :۔ میں بھی کبھی کبھی اُداس ہوکر اپنے آپ سے کہتی ہوں کہ جانے والے واپس کب آتے ہیں۔ پگلی جس راہ پر جا رہی ہے اُسکی منزل کہیں نہیں۔

حبیب :۔ پھر

سندری :۔ پھر ایک اُمّید ایک آس مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ آئینگے ضرور آئینگے

حبیب :۔ کون جانے سندری۔ کون جانے

اندھیرا کشتی میں اور گہرا ہو جاتا ہے۔ چولھے کی روشنی میں سندری اور آسیبوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ مزدوروں کا گیت آخری بار فضا میں گونجتا ہے ؎

سُہ چھُوتتے بوچھیس بیتے. بار صاحبو دیہ یوزار ـــ گیت ختم ہوتا ہے تو حبیب اور سندری حرکت کرتے ہیں۔ سندری اُٹھ کر ایک طرف لٹکی ہوئی لالٹین کو اُتار کر اسے جلاتی ہے اور اسے پہلے کی طرح اپنی جگہ پر لٹکاتی ہے۔

سندری :۔ (چولھے کی آگ کو پھر بھڑکاتے ہوئے) مزدوروں کا گیت بھی ختم ہوگیا

حبیب :۔ یہ گیت ختم نہیں ہوگا۔ سندری۔ جانے یہ لوگ کب سے اس گیت کو گاتے آرہے ہیں۔ انہیں کل پھر اسی گیت کو گاتے گاتے دِن کو رات میں تبدیل کرنا ہوگا۔ تمہارے انتظار کی طرح ان گیتوں کا سلسلہ بھی یونہی چلتا رہے گا۔ جانے کب تک؟ (پھر لہجہ بدلتے ہوئے) سندری۔

سندری :۔ ہاں حبیب

حبیب :۔ ایک بات پوچھوں

سندری:۔ کون سی بات بھیا
جیب:۔ سات سال تھوڑی مدت نہیں ہوتی۔ تم تھک تو نہیں گئیں سندری
سندری۔ سات سال کیا، ساری عمر بھی انتظار کرنا پڑے جب بھی نہ تھکوں گی۔
جیب:۔ مگر جیب
سندری:۔ (بات کاٹتے ہوئے) پگلے کون تھکتا ہے؟ بابا اور میں اِس اُمید میں ڈاک خانے، پوسٹ ایجنسیوں اور ہوٹلوں کا چکر کاٹتے رہتے ہیں کہ کب کوئی خط یا تار اُن کے نام آئے اور ہمارے ہوس بوٹ کی رونق لوٹ آئے۔ خط یا تار نہیں آتا مگر بابا پھر اُمید کا دامن نہیں چھوڑتے۔
جیب:۔ اُمید کا دامن! جھوٹی تسلیوں سے کیا ہوتا ہے سندری۔ کبھی میں بھی اس اُمید میں چھاؤنی میں بوجھ ڈھونے گیا تھا کہ ہمارے دن پھریں گے اور میں روز جس بوجھ تلے دبتے جاتا ہوں۔ اُس سے نجات مل جائیگی۔ میں اپنی تعلیم کو پورا کرسکوں گا۔ لیکن سندری دن پھرتے ہیں نہ میری پیٹھ پر سے مار ڈالنے والا بوجھ گرتا ہے۔ میں کالج میں داخل ہوتا ہوں۔ نہ میری تعلیم پوری ہوجاتی ہے۔ سندری میں بھی بہت دنوں تک امید کے ان گھروندوں میں بھٹکتا رہا۔ لیکن حالات کی ایک ہلکی سی آندھی نے اِن تمام گھروندوں کو زمین کے ساتھ ہموار کرکے رکھ دیا۔
سندری:۔ اُمید کے اِن گھروندوں سے نکل کر تو آدمی مرجاتا ہے پھر جیب تم؟
جیب:۔ جانے بھی دو سندری۔ کیا رکھا ہے اِن باتوں میں
دُور سے بابا کے پکارنے کی آواز آتی ہے — جیبا... جیبا... جیب چونک کر چٹائی اُٹھا کر جواب دیتا ہے
جیب:۔ (پکارتے ہوئے) ابھی آیا بابا — (سندری سے) سندری ذرا شکارا تو کھول دے میں بابا کو اس پار اُتار دوں۔
سندری:۔ (سامنے کی دیوار سے لوہے کی ایک زنجیر کو کھولتے ہوئے) تم پٹ

میں اُترو تو ـــــ

حبیب :۔ (چٹان کو اُٹھا کر باہر بوٹ میں قدم رکھتا ہے، اور پھر چٹائی گراتے ہوئے) ـــــ لیکن سندری میں جب تک بابا کو لے آؤں تم میرے لئے بھات پروس کر رکھنا۔ سچ کہتا ہوں بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے مجھے۔ دیکھنا بھولنا مت۔

سندری :۔ ارے بابا نہیں بولوں گی ـــــ تم بابا کو لے تو آؤ پہلے

جبیب :۔ (باہر سے ہی) ابھی پلک جھپکنے میں لے آؤں گا بابا کو ـــــ تم بھات پروس کر تو رکھو

ماں :۔ (دائیں دروازے سے داخل ہوتے ہوئے) سندری

سندری :۔ کیا ہے ماں

ماں :۔ ماں کی لگتی سماوار میں کوئلے ڈال دئے یا نہیں

سندری :۔ کس لئے ماں

ماں :۔ اری وہ جو تھک ہار کر آرہے ہیں

سندری :۔ مگر ماں چولہا تو ابھی تک جل رہا ہے۔ چائے پتیلی میں یوں گرم ہوگی

ماں :۔ تو ابھی تک گرم نہیں ہوئی کیا

سندری :۔ ابھی ہوتی ہے ماں (اُٹھ کر طاق پہ سے پتیلی اُٹھا کر لاتی ہے اور اسے چولھے پر رکھ کر اس میں چائے انڈیلتی ہے) وہاں ابھی گرم ہوتی ہے چائے

ماں :۔ تو اب تک کیا کر رہی تھی۔ مجھے جی بھر کر کوسا ہوگا تم دونوں نے۔

سندری۔ نہیں تو ماں

ماں :۔ نہیں تو کیا ـــــ تم لوگ مجھے اپنا دشمن جو سمجھتے ہو

سندری :۔ خدا کے لئے چپ رہو ماں۔ بابا آرہے ہیں

ماں ۔ (آہستہ آہستہ لہجہ تیز ہو جاتا ہے) چپ رہوں، کیوں۔ اری تو کون ہوتی ہے حکم چلانے والی۔ میں چپ نہیں رہوں گی۔ سب کچھ کہہ کے رہونگی

اُن سے

سندری :- (ہاتھ جوڑتے ہوئے) ماں میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں بابا سے کچھ نہ کہنا۔

ماں :- میں تو ایک ایک بات کہہ کے رہوں گی

سندری :- ماں اگر تم کو مجھ پر رحم نہیں آتا تو بابا کے حال پر ہی ترس کھاؤ۔ وہ تھک ہار کر آرہے ہیں۔ اُس پر یہاں جھگڑا دیکھیں گے تو کتنا پریشان ہوں گے وہ

ماں :- ارے واہ ...... بڑی آئی ہے بابا سے ہمدردی جتانے والی۔ اتنا ہی درد تھا تمہارے دل میں تو آج سات سال سے ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لئے یہاں بیٹھی نہ رہتی۔ کہیں اپنا ٹھور ٹھکانہ کرنے چلی گئی ہوتی۔

سندری :- اُن کے جانے کے بعد بابا کے سوا میرا کون تھا اِس دنیا میں

ماں :- جہنم میں بھی جاتی تو تمہیں سہارا ملتا

سندری :- ماں

ماں :- یہ جوانی اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے اور حکم چلانے کی عادت ارے تمہیں تو کسی راجے کی بیوی ہونا چاہئے تھا۔ راجے کی بیوی

سندری :- ماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو

ماں :- اب بھی کچھ نہیں گیا سندری۔ چاہو تو اور لڑکیوں کی طرح ہاؤس بوٹوں میں ....

سندری :- (تڑپتے ہوئے) ماں خدا کے لئے اب خاموش ہو جاؤ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔

ماں :- برداشت نہیں ہوتا تو چلی جاؤ یہاں سے (سندری روتی ہے) اب یوں ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلیگا۔ آخر کب تک تمہیں کھلاتے پلاتے رہیں گے ایک ایک چیز بک رہی ہے۔ چینی کے برتن، چھرے۔ کانٹے میرے کنگن

گلی کے جھلکے۔ سب ہی تو گئے ہاتھوں سے

سندری:۔ (روتے ہوئے) ماں تمہاری چیزوں کے ساتھ میری چیزیں بھی تو سنار ہڑپ کر گیا

ماں:۔ بڑا تاروں کا خزانہ لٹایا ہے تُم نے ...... چاندی کے کڑے اور سونے کا حلقہ بند ہی تو تھا۔ ارے وہ چنڈال لایا ہی کیا تھا تیرے لئے

سندری:۔ ماں میں تمہارے ٹکڑوں پر پڑی ہوں اُنہیں چنڈال نہ کہو۔ انہوں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا

ماں:۔ ارے نہیں تو کیا بنایا ہے۔ تجھ جیسی آفت کو ہم پر لاد کر چلا گیا۔ جانا ہی تھا تو تمہیں بھی ساتھ لے کر مرتا۔

سندری:۔ وہ بھی تو تمہارے لئے ہی یہاں سے دُور پنجاب چلے گئے۔ بوٹ رہن نہ ہو چکا ہوتا۔ پنڈت کا قرضہ بڑھا نہ ہوتا، تو وہ کاہے کو گھر چھوڑ کر پرائے دیش جاتے۔

ماں:۔ اری وہ قرضہ کیا چکاتا۔ الٹا اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا

سندری:۔ (بھڑکتے ہوئے) جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اُن کے دُشمن۔ خبردار جو تُم نے اُن کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات مُنہ سے نکالی۔ میں اب تک چپ رہی۔ لیکن اب تُم حد سے بڑھ رہی ہو۔

ماں:۔ کیا کہا میں حد سے بڑھ رہی ہوں (رونے کی تیاری کرتے اور ماتھے پہ زور سے ہاتھ مارتے ہوئے) ہائے ہائے میرے پھوٹے بھاگ! چھوکری کو بات کیا سمجھا دی کہ لگی دیدے نکالنے! ہائے اللہ اب اس گھر میں میرا گذر نہیں ہو گا۔ مجھے اپنے پاس بلالے (روتی جاتی ہے)

سندری:۔ تمہاری اپنی بیٹی میری جگہ ہوتی تو پتہ چلتا

ماں:۔ (زور زور سے روتے ہوئے) ہائے ہائے اب تو بات بات پر سوتیلی ماں کا طعنہ دینے لگی ہے۔

سندری :۔ اور نہیں تو اور کیا کروں ۔ تمہارا بنا وہی جو الیا ہے
ماں :۔ (پھرن کے دامن سے ناک صاف کرتے ہوئے) ہاں ہاں سات سال سے جو کھلاتی، پلاتی اور حفاظت کرتی جو آرہی ہوں —— میں نہ ہوتی تو تو بھی اوروں کی طرح ہاؤس بوٹوں میں دھندا کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ یا کسی موئے کے ساتھ بھاگ گئی ہوتی۔
سندری :۔ بھاگیں تیرے ہوتے سوتے۔ میں کیوں بھاگنے لگتی۔
ماں :۔ ہائے اللہ! اب گالیوں پر بھی نوبت آگئی۔ (سندری کے بالوں کو پکڑتے ہوئے اور دو چار ہاتھ مار کر) کل موہنی۔ ناگن کی جنی۔ ٹھہر تو۔ تجھے کچا نہ چباؤں تو رزاق ہانگلو کی بیٹی نہیں —— بدبخت تیری جوانی خاک میں ملے۔ بجلی گرے تجھ پر۔ موت آجائے تجھے

بابا اور حبیب دائیں دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ حبیب دوڑ کر ماں کے ہاتھ روک لیتا ہے۔ سندری بابا کو سامنے دیکھ کر اُس سے لپٹی ہوئی روتی ہے۔

سندری۔ بابا
بابا :۔ گلی کی ماں! آج تو جھگڑا نہ کیا ہوتا
ماں :۔ (روتے ہوئے) ہائے ہائے ..... تم بھی بیٹی کی طرفداری کرنے لگے۔ کیوں نہیں۔ اس گھر میں ایک میں ہی تو پرائی ہوں۔
حبیب :۔ ماں کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔
ماں :۔ سُنے میری بلا سے۔ میں کب ڈرتی ہوں کسی سے۔ تم لوگوں نے تو میری بات سُنی ہی نہیں۔ اُلٹا مجھ پر ہی برس پڑے
بابا :۔ (سندری کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے اور کمرے کے وسط میں آکر) آج میں کسی کی نہیں سنوں گا۔ آج میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ سات سال کی بے کاری۔ قرض

خواہشوں کے تقاضے، لڑائی جھگڑے۔ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ آج میں خوش ہوں، بہت خوش (جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے ہلاتا ہے) آج میں خوش ہوں

جیب :۔ تمہیں بھی تو خوش ہونا چاہئے ماں، چٹھی آئی ہے

سندری :۔ (سب کچھ بھول بھال کر) چٹھی

ماں :۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) جھوٹ

جیب :۔ نہیں ماں بالکل سچ۔ کیوں بابا وزیر آرہے ہیں نا

بابا :۔ ہاں وزیر آرہے ہیں، مدت کے بعد

ماں :۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) وزیر آرہے ہیں۔

سندری :۔ میرے اللہ! تم نے بے کسوں کی فریاد بھی سُن لی۔ مدت کے بعد آرزو پوری کی ہے اُس نے ــــــ اب تو سارے دکھ درد دُور ہوں گے۔

ماں :۔ چٹھی آئی۔ وزیر آرہے ہیں تو تم لوگ کھڑے کھڑے منہ کیا تک رہے ہو۔ سندری جلدی سے دوسری پتیلی چولھے پر چڑھا اور جیب تم دوڑ کے جاؤ اور کھانڈ لیتے آؤ۔ یہ لو پیسے

جیب :۔ ابھی لایا ماں (جاتا ہے)

ماں :۔ (بڑے پیار کے ساتھ) سندری جلد کر بیٹی۔ اُنھیں بھوک لگی ہو گی۔ صبح کے گھر سے نکلے ہیں۔

سندری :۔ اچھا ماں

ماں :۔ یا تو رہنے دے میں خود ہی پتیلی چڑھاتی ہوں چولھے پر۔ تو الماری سے انڈے نکال کر پھینٹ لے۔ روز روز ساگ سبزی اچھی نہیں لگتی

سندری :۔ (حیران ہوکر) انڈے؟ مگر ماں وہ تو

ماں :۔ (بات کاٹ کر) ارے میں جو کہتی ہوں، وہی کر۔ انڈے اب دکاندار کے پاس نہیں جائیں گے۔ اب تو سب کچھ پیسے کے عوض آئے گا۔ کیوں گلی کے بابا۔

بابا :۔ ہاں گلی کی ماں۔ اب پیسوں کی بارش ہو گی۔ اتنا پیسہ آئے گا اتنا پیسہ آئے گا کہ سارے قرض چکا ڈالیں گے۔ سُنا ہے کہ بمبئی کے سیٹھ بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ گھوڑوں کی دوڑ اور جوئے پر لاکھوں روپیہ لُٹاتے ہیں۔

ماں :۔ اچھا

بابا :۔ ہاں تو اور کیا — تم بے فکر رہو گلی کی ماں۔ میں سُنار سے ایک ایک چیز چھڑا لاؤں گا۔

ماں :۔ سب سے پہلے سندری کا حلقہ بند اور گلی کے جھمکے چھڑا لانا گلی کے بابا تین سو کی چیزیں ڈیڑھ سو میں دبا بیٹھا ہے۔

بابا :۔ ہاں ہاں پہلے سندری کا حلقہ بند چھڑا لاؤں گا۔ وہ تو سندری کی امانت ہے ہمارے پاس

سندری انڈے نکال کر ایک برتن میں پھینٹتی ہے۔ ماں چلم میں تمباکو بھر کر حقہ بابا کے آگے رکھ کر خود بھی بیٹھ جاتی ہے۔ سندری انڈے پھینٹتے ہوئے بابا سے کہتی ہے

سندری :۔ بابا گلی آج پھر غباروں کے لئے مچل گئی

بابا :۔ ارے ہاں وہ کہاں ہے

ماں :۔ بیدزار میں ملا سلطان کے بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہو گی۔ میں ابھی بلاتی ہوں — (اُسے پکارتے ہوئے) گلی۔ گلی — گلی بیٹیا.... (دور سے گلی کی آواز آتی ہے — آئی ہوں)

ماں :۔ جلدی آ بیٹی۔ تجھے بابا بلا رہے ہیں

گگی :- (دور سے ہی) بابا آگئے .... بابا آگئے

ماں :- (اداس ہو کر) گلاب جیسی بیٹی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہے گگی کے بابا ——

بابا :- ارے تو اس میں پوچھنے کی بات ہی کون سی ہے۔ اِدھر سیٹھ نے ہاؤس بوٹ میں قدم دھرا۔ اُدھر گگی کے لئے سُرخ چھینٹ کی شلوار اور قمیض آئے گی۔ لال رنگ کی ٹوپی چاندی کی بالیاں، سبھی کچھ تو لاؤں گا اُس کے لئے۔ گگی کی ماں اب تو چند دِنوں کی بات ہے پندرہ دن اور اس کے بعد سب کچھ آئے گا ...... سب کچھ

گگی :- (اندر آتے ہی باپ سے لپٹ جاتی ہے) بابا .... بابا

بابا :- میری بچی کہاں گئی تھی (اسے گلے لگاتا ہے)

گگی :- (اپنے آپ کو بابا کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے) دیکھو بابا عزیزی کے پاس اتنا بڑا غبارہ ہے۔ اُس پر چاند تارے بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو مجھے اُس کو چھونے بھی نہیں دیتی۔

بابا :- اچھا

گگی :- ہاں بابا

بابا :- تو کیا ہوا میری بچی۔ میں تیرے لئے بہت سے نیلے پیلے غبارے لاؤں گا۔ اتنے کہ تو اُن کا ہار بنا کر گلے میں ڈالتی پھرے گی۔ تو بھی عزیزی کو انہیں ہاتھ لگانے نہ دینا، ورنہ وہ سب اُڑ جائیں گے۔

(بابا منہ سے آواز پیدا کرتا ہے۔ گگی اور ماں ہنستی ہیں۔ پھر گگی کا چہرہ اُداس سا ہو جاتا ہے۔ وہ بابا کی طرف ملتجیانہ انداز میں دیکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہتی ہے۔

گگی :- پر بابا تم تو روز ہی کہتے ہو۔ لاتے کبھی نہیں۔ اگر تم میرے لئے غبارے لے آؤ بابا تو میں عزیزی کو دکھاؤں گی۔ اور اُسے ہاتھ بھی نہ لگانے

بھی نہ دوں گی۔

بابا :- اب تو ضرور لاؤں گا بیٹا۔ غبارے ہی نہیں۔ اتنی بڑی ولایتی گڑیا بھی جو چابی سے سر کو ہلائے گی۔ ہاتھوں کو ہلائے گی، اور آنکھوں کو گھمائے گی۔

بابا آنکھوں کو گھماتے ہیں۔ گلی پھر ہنسنے لگتی ہے۔ سندری انڈوں کو پھینٹ کر ایک طرف رکھ دیتی ہے

سندری :- حبیب نہیں آیا ابھی تک

ماں :- آتا ہی ہوگا سندری (پھر کچھ یاد کرکے) ہاں گلی کے بابا۔ قرضے ادا ہوں گے۔ تو حبیب کی شادی رچائیں گے

بابا :- دیکھنا کس شان سے شادی کروں گا حبیب کی۔ ایک ہی بیٹا ہے میرا اس دھوم دھام سے شادی کروں گا کہ ملہ سلطان بھی دانتوں تلے انگلی دبا کر کہنے پر مجبور ہوگا کہ غیرت والے دیکھے ہیں پر خالق جیسا کوئی نہیں

سندری :- میرا راجہ بھیا دولہا بنے گا۔ گھر میں چاند سی بھابی آئے گی۔

ماں :- (خیالات کی رو میں بہتے ہوئے) کشتی کے آگے اگن بوٹ چلے گا۔ پھر باجہ ہوگا، اور اُس کے بعد گانے والوں کی ٹولی۔ اور پاس ہی حبیب دولہا بنا بیٹھا ہوگا۔ شرم سے سر نیچے کئے ہوئے ہونٹوں پر ہنسی لئے ہوئے اور آنکھوں میں خوشی۔ میرے اللہ کب سے آس لگائے بیٹھی تھی میں (باہر کشتی کھینے کی آواز آتی ہے) شاید حبیب آگیا۔

بابا :- (چٹائی ایک طرف اُٹھاتے ہوئے) دیکھوں تو۔ کون ہے بھئی .... ارے غفار! کیا حال ہے۔

غفار :- (باہر سے ہی زور زور سے آواز دیتے ہوئے) ٹھیک ہے ملا خالق تم سناؤ۔

بابا :- شکر ہے اللہ تعالیٰ کا۔ آج چٹھی آئی ہے بمبئی سے

غفار :- چٹھی مبارک ہو۔ لو خالق .... کسی امریکن کی ہے

بابا :- ایک دیسی کی ہے۔ اپنی فیملی کے ساتھ آرہا ہے۔ پندرہ دنوں میں۔

غفار :- چلو اچھا ہوا۔ امریکن نہ سہی دیسی ہی سہی۔ کاروبار تو چلنا چاہیئے

ماں :- (اندر سے ہی آواز دیتے ہوئے) آؤ غفار جو چائے پی کر جاؤ

غفار :- نہیں اب دیر ہو گی۔ یہ لو تمہارا حبیب بھی تو آگیا

بابا :- بھئی آؤ نا

غفار :- نہیں بھئی اب تو کسی دن آ ہی جائیں گے۔ شکر کرو کاروبار کی صورت تو نکل آئی

بابا :- کس مُنہ سے شُکر کروں غفار

ماں :- ہماری تو آس ہی ڈوبتی جارہی تھی

غفار :- اچھا سلام علیکم

حبیب ہاتھوں میں چیزیں لئے اندر آتا ہے۔ بابا چٹائی گرا کر پھر حقہ پینے لگتے ہیں۔

حبیب :- (سندری سے) یہ لو سندری کھانڈ۔ یہ چائے اور یہ کُلچے

بابا :- ارے کلچوں کی کیا ضرورت تھی

ماں :- اے ہے یہی عادت تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ آج کلچے آگئے تو کیا ہوا۔ گلی کے بابا میرے پاس پیسہ ہوتا تو آج کی خوشی میں لٹاتی

بابا :- اچھا بھئی تمہاری مرضی

حبیب :- (بابا کے قریب جاتے ہوئے) وہ چٹھی تو دکھاؤ بابا

بابا :- (جیب سے نکالتے ہوئے) یہ ـــ یہ لو ـــ میں نے ڈاک خانے کے منشی سے بھی یہ پڑھوائی ہے۔ ہاں سنو کل سے تم چھاؤنی نہیں جاؤ گے

حبیب :- (چٹھی سے بے نیاز ہو کر حیران ہوتے ہوئے) کیا کہا بابا ـــ میں

چھاؤنی نہیں جاؤں گا

بابا :۔ ہاں ہاں تم چھاؤنی نہیں جاؤ گے

حبیب :۔ مگر بابا پھر کھائیں گے کیا ؟

بابا :۔ پگلے اب تو دوسروں کو کھلانے کے قابل ہیں ہم لوگ۔ تم فکر کاہے کو کرتے ہو ؟ ہاں دیکھو۔ کل سے بوٹ ڈھلے گا۔ میں نے مزدوروں سے بھی کہہ دیا۔ وہ کل صبح آجائیں گے۔

سندری :۔ سچ بابا۔ ہمارا ہاؤس بوٹ بھی دھلے گا۔

بابا :۔ ہاں بیٹی! حبیب یہ لو سوڈا اور صابن میں ساتھ ہی لایا ہوں بازار سے

حبیب :۔ کس سے لے آئے

بابا :۔ محی الدین سے

حبیب :۔ مگر اُس نے تو یہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

بابا :۔ چیٹھی دیکھ کر تو وہ بھی خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ تمہارے کاروبار سے ہمیں بھی تو فائدہ ہوتا ہے۔ پھر اُس نے چپکے سے چیزیں میرے حوالے کیں اور بولا۔ اپنی دُکان ہے جو جی میں آئے لے لو ملا خاتی ـــــ ہاں گلی کی ماں تُبرش سنبھال کے رکھے ہیں نا

سندری :۔ بابا وہ میں نے سنگار میز میں رکھے ہیں۔

حبیب :۔ (چھیڑتے ہوئے) اور کیا رکھا ہے سنگار میز میں سندری

سندری :۔ اپنی بھابی کے گہنے۔ (سب ہنستے ہیں)

ماں :۔ ارے تو اس میں ہنسنے کی بات ہی کون سی ہے۔ آج نہ سہی، کل تو حبیب کی بیوی آہی جائے گی۔

حبیب :۔ (شرماتے ہوئے) جانے دو ماں! ہاں تو بابا میں سچ مچ کل مزدوری کے لئے نہ جاؤں۔

بابا :۔ ہاں تم بوجھ ڈھونے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ جفرسن کہا کرتا تھا

جیب :۔ جفرسن جھوٹ کہہ رہا تھا بابا۔ تم نے خواہ مخواہ اُس کی بات کو پتھر کی لکیر بنائے رکھ دیا۔

بابا :۔ ارے ایسا نہیں کہا کرتے پگلے ۔جفرسن کبھی جھوٹ نہیں کہتا تھا

جیب ۔ اُس نے سچ کہا ہوتا بابا تو میں اسکول چھوڑ کر مزدوری پر مجبور نہ ہو جاتا۔ میں آج تک بہت کچھ پڑھ لکھ چکا ہوتا بابا

بابا ۔ اب بھی کچھ نہیں گیا بیٹے ۔سیٹھ صاحب کو آنے دو۔ دیکھنا تمہیں پھر اسکول بھیج دوں گا۔ ایک ہی سال میں تم کالج چلے جاؤ گے اور جفرسن کی بات سچ ہو کر رہے گی۔

جیب :۔ سچ بابا۔ تو کیا میں کالج جا سکوں گا۔

سندری چائے پیالی میں لے آتی ہے اور بابا کے آگے رکھ دیتی ہے بابا چائے پینے لگتے ہیں۔ گلی اُس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی اپنے بابا کی باتیں سُن رہی ہے۔

سندری :۔ ماں تم بھی پیو گی

ماں :۔ نہیں بیٹی۔ ہاں گلی کے لئے تھوڑی سی لاؤ

سندری :۔ اچھا ماں (پیالی گلی کو دیتی ہے)

بابا :۔(چائے پیتے ہوئے) جتنی دیر میں ہاؤس بوٹ صاف کیا جائیگا تم دریاں اور پردے اُستاد رسول کے پاس پہنچا دینا یا اُسے آدمی بھیج دینا۔ میں یہاں نہ ہوا تو اُسسے کہنا کہ ڈرائنگ روم کے پردوں کو سُرخ رنگ دے، اور بیڈ رُوم کے پردوں کو لائٹ بلو جفرسن کہا کرتا تھا کہ سُرخ رنگ بھوک کو بڑھاتا ہے اور نیلا رنگ نیند کو بلاتا ہے۔ کیوں یاد ہے نا تمہیں جیب

جیب :۔ بابا ابھی کل ہی کی تو بات معلوم ہو رہی ہے وہ

ماں :۔ (اداس ہو کر) مگر اتنی دیر میں ہم پر کیا کچھ گزری

بابا :- بھول جاؤ اِن باتوں کو گلی کی ماں۔ اب تو سارے گلے شکوے دُور ہوں گے ـــــ ہاں یہ تو بتاؤ، اب اور کن چیزوں کی ضرورت ہو گی کراکری اور چھریاں تو محی الدین سے لے آؤں گا۔ لیکن لیمپوں کے شیڈ

حبیب :- لیمپوں کے شیڈ تو ہیں بابا

بابا :- ہونہہ۔ اُن کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ جفرسن کہا کرتا تھا کہ لیمپوں کے شیڈوں کا رنگ ہمیشہ سبز ہونا چاہئے۔ ایلکہ آنکھوں میں ٹھنڈ پڑے دیکھ کر۔ (پھر یکایک کچھ یاد کرتے ہوئے) حبیب تمہاری مزدوری کے پیسے

حبیب :- ابھی تو پہلی میں بارہ دن ہیں بابا۔

بارہ :- بارہ دن! خیر کوئی بات نہیں۔ کہیں نہ کہیں سے پیسہ آہی جائیگا اور بھی تو پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ کسی سے مانگ لوں گا۔

حبیب :- سندری

سندری :- کیا ہے بھیا

حبیب :- ذرا لالٹین اِدھر لاؤ۔

سندری :- ابھی ٹھہرو بھیا۔ مجھے انڈے تلنے دو

حبیب :- (یقین نہ کرتے ہوئے) انڈے

ماں :- ہاں ہاں اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے

حبیب :- مگر سندری تو کہہ رہی تھی کہ آج بھی روز کی طرح گھاس ہی پک رہی ہے۔

ماں :- گھاس

سندری :- (ہنستے ہوئے) ماں حبیب ساگ سبزی کو گھاس کہتا ہے (سب ہنستے ہیں) اور لاؤں بابا

بابا :- ہاں بیٹی تھوڑی سی اور لاؤ اور گلی کے لئے بھی

گلی :- مجھے نہیں چاہئے۔

سندری :- بھر گیا میری ننھی کا پیٹ

جبیب :- انڈوں کے سالن کے لئے تیاری کر رہی ہو گی۔ کیوں گلی

گلی :- بابا میرے لئے غبارے لائیں گے۔ نیلے پیلے اور لال غبارے

جبیب :- اچھا

گلی :- ہاں —— کیوں بابا

بابا :- ہاں ہاں ضرور لاؤں گا۔

سندری انڈوں کو برتن میں ڈال دیتی ہے۔ پھر لال ٹین جبیب کو دیکر واپس چولھے کے پاس جاتی ہے۔

جبیب :- (لال ٹین ماں کو پکڑاتے ہوئے) ماں ذرا اسے سنبھال لو۔ میں خط پڑھوں گا۔

جبیب خط پر نظر ڈالتا ہے۔ لال ٹین کی روشنی میں اُس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو جاتا ہے۔ وہ خط کو ہاتھوں میں لے کر اس طرح کھڑا رہتا ہے جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان نکال دی ہو

ماں :- جبیب کے چہرے کی حالت دیکھ) جبیب

جبیب :- ہوش میں آتے ہوئے اور درد بھرے لہجے میں) بابا

ماں :- کیا بات ہے جبیب۔ تمہارا چہرہ زرد کیوں پڑ گیا

بابا :- (یکایک چونکتے ہوئے) کیا ہوا جبیب

سندری :- (چولھے کو چھوڑ کر جبیب کے پاس آتے ہوئے) بھیا

گلی :- (اپنی ہی دھن میں) بابا میرے لئے غبارے لائیں گے۔ ولایتی گڑیا لائیں گے۔ اتنی بڑی

جبیب :- (بڑی اُداسی کے ساتھ بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے) بابا

ماں :- کیا بات ہے جبیب، چٹھی میں کیا لکھا ہے۔

جبیب :- (بابا سے جو ایک بت کی طرح جبیب کی طرف دیکھ رہے ہیں) یہ چٹھی تمہارے

نام نہیں لنکاسٹر[1] کے مالک کے نام ہے

ماں :۔(ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے) میرے پھوٹے بھاگ (لال ٹین ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ گر پڑتی ہے)

سندری :۔(روتے ہوئے) بابا یہ کیا ہو گیا

گلی :۔(اندھیرے سے ڈر کر اور سندری کو روتے دیکھ کر) ماں — بابا

حبیب :۔ بابا کشتی میں اندھیرا پھیل گیا —— تمہارے غبارے بھی پھوٹ گئے گلی۔

گلی :۔(روتے ہوئے) ماں میرے غبارے .... بابا میری گڑیا

سُندری :۔(روتے ہوئے) ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا (لال ٹین اُٹھا کر پھر جلاتی ہے)

حبیب :۔ (آنکھوں سے وحشت برستی ہے۔) سندری —— اُمیدوں کے گھروندے ایک بار پھر مسمار ہو گئے۔ بابا تم خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ تو بولو بابا —— ان کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں نہ جھانکو

گلی :۔ بابا میرے غبارے ، میری گڑیا

وقفہ —— جس کے دوران بابا کے سوا سب سر جھکاتے ہوئے روتے ہیں پھر بابا یکایک اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر ارادے کی جھلک ہے۔

ماں :۔ اب کہاں جاؤ گے۔ گلی کے بابا ؟

بابا :۔ تم نے سُنا نہیں گلی کے لئے غبارے لانے ہیں۔ اور ولایتی گڑیا بھی

حبیب :۔ (ڈرتے ہوئے) بابا

بابا :۔ ڈرو مت بیٹے۔ تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ امیدوں کے گھروندے مسمار ہو گئے۔ آؤ مجھے پار اُتار دو

---

[1]۔ لنکاسٹر :۔ ہاؤس بوٹ کا نام

سندری :۔ کہاں جا رہے ہو اس وقت بابا

بابا :۔ نئے گھروندوں کی تلاش میں ــــــ حبیب مجھے پار اُتار دو

حبیب : بابا

بابا :۔ ہاں میرے بچو ! تمہارے لئے ایسے گھروندے تلاش کروں گا جن پر مایوسیوں کے طوفان نہ منڈلا سکیں گے۔ ایسے گھروندے تعمیر کروں گا جو جھوٹی امیدوں کے سہارے کھڑے نہ ہوں

حبیب :۔ پر بابا ایسے گھروندے کہاں ملیں گے ــــــ ؟

بابا :۔ کیوں نہیں ملیں گے۔ میری اُمید ابھی تک زندہ ہے۔

بابا اور حبیب دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ سندری لالٹین کو ہاتھ میں لے کر کھڑی رہتی ہے۔ اُس کے چہرے پر اُمید کی ایک جھلک پیدا ہوتی ہے ۔

(پردہ گرتا ہے)

سجود سیلانی

شاہکار

کردار

مہرالدین ——— ایک نوجوان مصوّر
فخرالدین ——— نوجوان شاعر، مہردین کا بھائی
مرزا ——— مہردین اور فخرالدین کا باپ
بیگم ——— مرزا کی بیوی
گھسیٹو ——— گھر کا نوکر

منظر

ایک متوسط گھرانے کا بڑا کمرہ ——— ایک پلنگ۔ ایک ٹی پائی اور چند چند کرسیاں کمرے کا کل فرنیچر ہے۔ کونے میں ایک ٹوٹا پھوٹا ایزل رکھا ہوا ہے۔ جس پر کینواس چڑھا ہوا ہے۔ کینواس پر گدھے کی نامکمل تصویر بنی ہوئی ہے۔ ایزل کے آمنے سامنے ٹی پائی پر چند رنگوں کی ٹیوبیں پانی کی بوتل اور وارنش کا ٹین رکھا ہوا ہے۔ مہردین آرٹسٹ پریشانی کی حالت میں کمرے میں کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے

وقت :- دن کا درمیانی حصّہ

مہرالدین :- کیا مصیبت ہے ——— ؟ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں۔ اب میں پینٹنگ مکمل کر دوں یا چیزیں ڈھونڈتا پھروں — ؟ بنا بنایا موڈ ہی خراب

ہوگیا ــــ یہ گھسیٹو بھی کام چور ہے۔ نالایق ۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتا (آواز دیتا ہے) گھسیٹو ــــ ابے او گھسیٹو

گھسیٹو :۔ (نزدیک آکر) جی چھوٹے میاں

مہرالدین :۔ میری رنگ کی ٹیوبیں کہاں چھپا کر رکھ دی ہیں

گھسیٹو :۔ میں نے کہاں چھپا کر رکھ دیں ۔ یہیں تو تھیں

مہرالدین :۔ کہاں ــــ ؟ مجھے تو نظر ہی نہیں آتیں ، نہ کالے رنگ کی ٹیوب کہیں ہے۔ نہ لال رنگ کی ۔ بھئی میں تو تنگ آگیا تم سے

گھسیٹو :۔ اجی دودھ ملائی تو ہے نہیں جو میں چٹ کر جاتا ۔ خیر ــــ گھبراؤ نہیں ــــ ڈھونڈھ لیتا ہوں میاں ــــ

ارے ! یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے ۔

مہرالدین :۔ (چونک کر) اوہ ــــ یہ ــــ یہ ــــ یہی تو ہیں۔

گھسیٹو :۔ دیکھا چھوٹے میاں ــــ بچہ بغل میں اور ......

مہرالدین :۔ بس بس رہنے دو یہ منطق ۔ ٹیوبیں ڈھونڈ کر کیا دیں ۔ ہمالہ کی چوٹی سر کر لی ۔ یہ دیکھو ــــ سارے اسٹوڈیو کو کباڑخانہ بنا دیا ہے ۔ ان برشوں کو ایزل کے پاس ہونا چاہئے یا جوتوں کے ریک پر ــــ ؟ اور یہ ایزل ؟ ــــ اس کے بھی انجر پنجر ڈھیلے کر دئے ہیں ۔ اب تو کینواس اس پر لٹکایا ہی نہیں جاتا ــــ تم نے تو اسے کپڑے لٹکانے کی کھونٹی بنا دیا ہے ۔ پورے ماحول پر تم نے جھاڑو پھیر دیا ہے ۔

گھسیٹو :۔ لیکن میرا کیا قصور ــــ ؟ ایسا تو مالک نے ہی کہا تھا ۔

مہرالدین :۔ (متحیر ہو کر) مالک نے کہا تھا ــــ ؟ کیا کہا تھا انہوں نے

گھسیٹو :۔ یہی کہ آپکی یہ الم غلم چیزیں باہر پھینک دی جائیں

مہرالدین :۔ (طنز سے) اور تم نے پھینک دیں ۔ یہی بات ہے نا ۔ ہاں بھئی

نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ مجھے تو یہی دکھ ہے اِس گھر میں میرے آرٹ کا کوئی قدر دان نہیں۔

گھسیٹو:۔ لیکن میں نے آپ کی کوئی چیز ضایع ہونے نہیں دی۔ البتہ اِدھر اُدھر چھپا کر رکھ دی۔

مہر الدین:۔ تھینک یو۔ بھائی گھسیٹو ــــ تیرا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں اچھا۔ اب تم چپ چاپ بیٹھو۔ میں پینٹنگ مکمل کر دوں گا۔

گھسیٹو:۔ چھوٹے میاں ؟

مہر الدین:۔ کیا ہے ؟

گھسیٹو:۔ یہ پینٹنگ کیا ہوتا ہے۔ بھلا۔

مہر الدین:۔ (قہقہہ لگا کر) ذہنی مینڈک کو بھی زکام ہو گیا ــــ ارے بدھو یہ جو میں نے اس کینوس پر بنا دیا ہے پینٹنگ نہیں ہے کیا۔

گھسیٹو:۔ یہ پینٹنگ کہاں ہوئی ــــ ؟ یہ تو رامو دھوبی کے گدھے کی تصویر ہے۔

مہر الدین:۔ میں نے کب کہا یہ تیری تصویر ہے ــــ اب گھسیٹو ــــ تیری کھوپڑی ہے یا سیمنٹ کی بوری۔ میری صحبت میں رہ کر بھی کچھ سمجھ نہیں پایا۔ سن ــــ جو کچھ کینوس پر آرٹسٹ بناتا ہے اُسی کو پینٹنگ کہتے ہیں۔ اور جس چیز کو بنانے کے لئے سامنے رکھا جاتا ہے اُسے ماڈل کہا جاتا ہے۔ سمجھے

گھسیٹو:۔ جی سمجھ گیا

مہر الدین:۔ کیا سمجھ گیا

گھسیٹو:۔ یہی جو آپ نے کہا

مہر الدین:۔ (غصے میں) میں نے کیا کہا ؟

گھسیٹو:۔ وہی جو میں سمجھ گیا

مہرالدین:۔ خاک سمجھا ــــ کینوس پر جو کچھ آرٹسٹ بناتا ہے۔ اُسے کیا کہتے ہیں۔

گھسیٹو:۔ پینٹنگ!

مہرالدین:۔ گڈ ــــ اور بنانے کی غرض سے جس چیز کو سامنے رکھا جاتا ہے

گھسیٹو:۔ اُس کو ماڈل کہتے ہیں چھوٹے میاں!

مہرالدین:۔ شاباش

گھسیٹو:۔ تب رامو دھوبی کا گدھا آپ کا ماڈل ہُوا نا؟

مہرالدین:۔ بے شک! بنانے کے لئے ہی تو میں نے باندھ کر رکھا ہے۔ خیر ــــ اب میں کینوس لے کر اس اسٹوڈیو میں آگیا ہوں۔ مجھے اس پینٹنگ میں آخری ٹچ دینے ہیں۔ تم اب میرا دماغ مت چاٹو۔ مجھے کام کرنے دو۔

(پس منظر سے گدھے کی ہانک سنائی دیتی ہے)

گھسیٹو:۔ ارے! چھوٹے میاں: آپ کا ماڈل؟

مہرالدین:۔ (حیرت سے) میرا ماڈل

گھسیٹو:۔ جی ہاں! سُنئے نا ــــ کس طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہا ہے

مہرالدین:۔ یہ تو گدھا ہے۔ وہی رامو دھوبی کا۔

گھسیٹو:۔ (معصومیت سے) لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔ رامو دھوبی کا یہ گدھا میرا ماڈل ہے

مہرالدین:۔ بھئی ہے "نہیں" تھا" ــــ بے وقوف! آرٹ کی پوری تھیوری ابھی ابھی سمجھا دی۔ لیکن تم لکیر کے فقیر ہی رہے۔ بھئی میرا ماڈل یہ اُس وقت تھا۔ جب میں اس کا سکیچ کر رہا تھا۔ اب میں کینوس لیکر اندر اپنے سٹوڈیو میں آیا ہوں۔ اب رامو دھوبی کی پوزیشن پھر بدل گئی ہے۔ وہ اب میرا ماڈل نہیں بلکہ وہی گدھا ہے

صرف گدھا۔ جیسے تم ــــ سمجھے؟

گھسیٹو:۔ جی سمجھا (پھر پس منظر میں گدھے کے ہانکنے کا تاثر سنائی دیتا ہے

مہرالدین:۔ جاؤ اب میرا دماغ مت چاٹو ــــ اس گدھے کی رسی کھولدو بے چارہ دو گھنٹے سے صحن میں بندھا پڑا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ۔ کھولدو بے چارے کو۔ دیکھو کس طرح احتجاج کر رہا ہے۔

گھسیٹو:۔ (جاتے جاتے) ابھی گیا ــــ

(مہرالدین تنہا رہ جاتا ہے۔ اپنے آپ سے بڑبڑاتا ہے)

مہرالدین:۔ ایک خواہ مخواہ باتوں میں وقت ضائع ہو گیا۔ ہونہہ یہ رہا برش اور یہ رنگ کا ٹیوب ۔ اگر۔ یہاں پر بلیک پیچ لگا دیا جائے تو کیا رہے؟ یوں ــــ ہاں اب ہوئی نا پینٹنگ! واقعی شاہکار پینٹنگ بلاشک ماسٹر پیس! یہاں ــــ اس جگہ بھی بلیک پیچ ہی ٹھیک رہیگا۔ ــــ اس طرح ــــ ٹھیک ــــ اب پوری پینٹنگ کا ٹون TONE اعتدال پر آگیا ــــ لیکن ابھی پینٹنگ کا بیلنس (BALANCE) کچھ جچا نہیں۔ اس کونے پر ٹکیں چڑھا دینا لازمی ہے۔ یہ.... ہاں.... اس طرح۔

(اسی وقت مائیک سے کچھ دور ــــ پس منظر سے فخرالدین اپنا تازہ کلام گنگناتے ہوئے آتا ہے۔ آرٹسٹ مہرالدین اپنے چھوٹے بھائی کی اس بے محل الاپ سے بوکھلا اٹھتا ہے)

.... اوہ ہو ــــ اس فخرو کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گھر ہے یا بھٹیارے کی دکان۔ عجیب مصیبت ہے

(فخرالدین نزدیک آتا ہے۔ غزل گاتے ہوئے)

فخرالدین:۔ رات جاگتا ہوں میں الو کی مانند۔ مجھے ہجر میں نیند آتی نہیں ہے
بینک بیلنس لٹا یا ہے راہ وفا میں ــــ بٹوے میں ایک پائی نہیں ہے

کھٹملوں نے کیا تنگ اگر یہ نہ جانا۔ میری دوسری چارپائی ......
مہرالدین :- ارے بھئی اب بند بھی کرو یہ شاعری
فخرالدین :- (چونک کر) واہ بھئی! تم یہاں ہو؟ میں تو تھک گیا۔ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ۔۔۔ دیکھو کیا کراری غزل ہوئی ہے۔ سبحان اللہ! سنو گے تو داد دئے بغیر ہرگز نہیں رہو گے۔ غرض کیا ہے ......
مہرالدین :- بس بس رہنے دو۔ بڑی مشکل سے آج یہ تصویر بنانے کا موڈ بنایا تھا سو وہ بھی تمہاری بے سر کی الاپ نے بگاڑ کر رکھ دیا۔
فخرالدین :- (قریب آتے ہوئے) ذرا ہم بھی تو دیکھیں کیسی تصویر بنائی ہے تم نے (غور سے دیکھ کر) ارے! تم نے تو بڑا خوبصورت گدھا بنایا ہے!
مہرالدین :- دھت تیرے کی! یہ گدھا ہے؟
فخرالدین :- گدھا نہیں تو کیا میری تصویر ہے؟
مہرالدین :- نہیں۔ تم اسے کیا دیکھ سکتے ہو۔ اس قسم کی تصویر کو دیکھنے کے لئے مصورانہ آنکھ چاہئے۔ یہ تصویر میں نے اپنے تخیل کی بلندیوں سے اُتار لائی ہے۔ اس کینوس پر تم جو یہ مختلف رنگوں کی آمیزش دیکھ رہے ہو۔ یہ سب میری عرق ریز کوششوں کا نتیجہ ہے (ذرا رک کر) ابھی اس میں اور محنت درکار ہے بخدا یہ تصویر شاہکار ثابت ہوگی۔
فخرالدین :- (متحیر ہو کر) یہ تصویر شاہکار ثابت ہوگی؟ ارے بھئی کہیں گدھے کی تصویر شاہکار ہو سکتی ہے؟
مہرالدین :- پھر وہی گدھا؟ کہہ جو دیا یہ گدھا نہیں ہے
فخرالدین :- گدھا نہیں تو پھر ہے کیا؟
مہرالدین :- یہ شرافت ہے
فخرالدین :- شرافت؟
مہرالدین :- ہاں شرافت۔ جو شریفوں کے پاس ہوتی ہے۔ یعنی شرافت

فخرالدین:۔ لیکن اِس شرافت کو تخلیق کرنے میں تمہارا مقصد ؟
مہرالدین:۔میں اس تصویر کے ذریعے اپنے سماج کو اپنی سوسائٹی کو یعنی ساری دُنیا کو شرافت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرنا چاہتا ہوں
فخرالدین:۔ تب تو یہ تصویر عبرت ناک چیز ہے۔
مہرالدین:۔ بے شک! میرا مقصد ہے کہ تمام عالم انسانیت ہمیشہ گدھا چال چلے یعنی شریفوں کی طرح رہے اور شریفوں کی طرح جئے۔ گدھے کو چھل اور کپٹ سے کوئی واسطہ نہیں۔ چوربازاری کے ساتھ کوئی مطلب نہیں۔ جنگ اور فساد کے ساتھ کوئی دِلچسپی نہیں۔ گدھا نہیں جانتا کہ اشیاء خوردنی میں ملاوٹ کیسے کی جاتی ہے۔ نہ چھوت چھات کا مسئلہ گدھے کی سمجھ میں آسکا اور نہ گدھے کو معلوم کہ صوبہ بندی کسے کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ گدھے کو رشوت لینا بھی نہیں آتا۔ بہرحال گدھے کی زندگی قابلِ رشک ہے
فخرالدین:۔ واقعی گدھا پروردگارِ عالم کی عظیم تخلیق ہے۔
مہرالدین:۔ نہیں تو اور کیا ــــ؟ اِسی لئے میں نے اس عظیم جانور کی عظیم تصویر بنانے کا بیڑا اُٹھایا ہے کیونکہ حضرتِ عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہو یا الف لیلیٰ کے علی بابا کا۔ گدھا بہرحال گدھا ہے۔ اور سوفی صدی گدھا۔ مار کھانا اور آگے بڑھنا اس کا کام ہے۔ اس کو اگر غرض ہے بس اپنے کام سے گدھا اپنے گھسیٹو کی طرح کام چور نہیں۔ گدھا بھوکا پیاسا رہتا ہے کبھی مطالبہ نہیں کرتا کہ میری بھی گھاس میں اضافہ کرو۔ ہاں! اگر کسی وقت کسی کے بہکانے سے صدائے احتجاج بلند کرے یعنی ڈھینچوں ڈھینچوں کے ترانے سے اسٹرائیک کا اعلان کرے تو چند لاٹھیاں اسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مار کھاتا ہے اور کام کرتا ہے۔ یعنی سراسر پیکرِ شرافت ہے یہ گدھا!
فخرالدین:۔(مطمئن ہو کر) اچھا اب سمجھ گیا میں۔ یوں کہو نا کہ تم نے اپنی

اس تصویر کا ٹائٹل یعنی عنوان "شرافت" رکھا ہے ؟

مہرالدّین :- (خوش ہو کر) ہاں !

فخرالدّین :- تب تو واقعی یہ شاہکار ہے میرے بھائی ۔ عجیب اتفاق ہے یہ بھی ۔ آج ہی تم نے یہ شاہکار تصویر بنائی اور آج ہی میں نے بھی ایک شاہکار غزل کہہ ڈالی ہے ۔ (گلا صاف کر کے) عرض کیا ہے ؎

گوارہ مجھے یہ جدائی نہیں ہے   کہ مدّت سے چِٹھی بھی آئی نہیں ہے

(پس منظر میں مرزا جی کے کھانسنے کی آواز آتی ہے ۔ دونوں بھائی باپ کی آمد سے گھبرا جاتے ہیں)

مہرالدّین :- باپ رے باپ ! ابّا جان آ گئے ! (بوکھلاہٹ میں اپنی بنائی ہوئی تصویر ایزل پر اُلٹا کر رکھ دیتا ہے)

فخرالدّین :- مر گئے ! اب کیا ہو گا ۔۔ ؟ (شاعری کی کاپی کوٹ کے کالر میں چھپاتا ہے)

مہرالدّین :- چلو چلو اس پلنگ کے نیچے چھُپ جاتے ہیں ۔

فخرالدّین :- ہاں ہاں ۔ چلو (دونوں پلنگ کے نیچے چھُپ جاتے ہیں ۔ مرزا جی ہاتھ میں اخبار لے کر اندر آ جاتے ہیں)

مرزا جی :- (اندر آتے ہوئے) کوئی ہے ۔۔ ؟ ارے بھئی کوئی ہے ؟ لوجی اور سنو ! میں نے کہا کوئی ہے ؟ میرا چشمہ تو لا دو ۔ اے او گھسیٹو ۔ گھسیٹو کے بچّے کہاں مر گئے ؟ لوجی اور سنو اجی دونوں کی اماں کہاں ہو ؟

بیگم :- (اندر آتے ہوئے) کیوں جی ؟ کیا بات ہے ؟ یہ چلّا کیوں رہے ہیں آپ ؟ کیا چاہئے آپ کو ؟

مرزا جی :- لوجی اور سنو ۔۔ چاہئے کیا ۔۔ ؟ دو گھنٹے سے عینک کے لئے امداد

کر رہا ہوں۔ کوئی ہو تو سُنے

بیگم:۔ بس اتنی سی بات پر کوئی سارے گھر کو سر پر اُٹھاتا ہے کیا؟

مرزاجی:۔ لو جی اور سنو۔ میری ہر بات اِتنی سی بات ہوتی ہے۔ اِدھر یہ تازہ اخبار مُفت میں باسی ہوتا جا رہا ہے، اور ہمیں عینک نہیں ملتی۔ عینک نہیں ملتی تو اسے پڑھ کیسے لیں؟

بیگم:۔ اچھا جی جاتی ہوں۔ ابھی لائی آپ کی عینک

مرزاجی۔ لو جی اور سنو۔ تم کیوں جانے لگیں۔ ہٹا کٹا سا نوکر جو گھر میں رکھا ہے۔ آخر وہ کس مرض کی دوا ہے۔ جا گھسیٹو سے کہہ دے

بیگم:۔ ہائے اللہ! تگنی کا ناچ رچاتے ہیں، آپ بھی۔ (جاتی ہے)

مرزاجی:۔ (آپ ہی آپ) لو جی اور سنو۔ تازہ اخبار کا مزا کرکرا کر دیا ان لوگوں نے

گھسیٹو:۔ (دوڑتا ہوا اندر آجاتا ہے) لیجیے سرکار آپ کی عینک

مرزاجی:۔ کہاں مر گئے تھے اب تک؟

گھسیٹو:۔ (سہمے ہوئے لہجے میں) میں ۔ میں رسوئی میں تھا سرکار۔ آپ کے لئے آملیٹ بنا رہا تھا۔

مرزاجی:۔ (عینک کو ہاتھ میں لیکر) لو جی اور سنو۔ رسوئی کی ساری کالک عینک پر لگا دی کام چور نے۔ (عینک آنکھوں پر لگا کر) دیکھتا کیا ہے مشٹنڈا۔ جا حقہ لے کے آ۔

(گھسیٹو حقہ بھرنے لگتا ہے۔ اور مرزاجی اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اچانک اُچھل پڑتے ہیں۔

مرزاجی:۔ لو جی اور سنو۔ اجی کہاں گئیں دونوں کی اماں؟ ذرا اِدھر تو آ

بیگم:۔ (آکر) کیا ہوا؟

مرزاجی:۔ لو جی اور سنو۔ ہوا کیا؟ اخبار میں لکھا ہے کہ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اچھی تصویروں اور اچھی نظموں کا مقابلہ ہوگا۔ اول آنیوالے مصوّر

یعنی آرٹسٹ کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائیگا۔ اور سب سے اچھی نظم لکھنے والے شاعر کو پانچ سو روپیہ کا عطیہ الگ دیا جائیگا۔

بیگم :۔ لیکن ہمیں اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

مرزا جی :۔ لو جی اور سنو۔ تمہارے بیٹے بھی تو اس مقابلے میں حصّہ لے سکتے ہیں

بیگم :۔ (متحیر ہو کر) وہ کیسے؟

مرزا جی :۔ کیا اپنا مہرو رات رات بھر چڑیوں اور چڑوں کی تصویریں نہیں بناتا؟ اور اپنا فخرو آئے دن ہمیں گرما گرم غزلیں نہیں سناتا؟

بیگم :۔ ہاں تو ــــ میں ان دونوں کی بلائیں لوں۔ یہ تو سچ ہے

مرزا جی :۔ لیکن آج اکیڈمی میں تصویریں اور نظمیں پہنچنے کی آخری تاریخ ہے۔ آج ہی بلکہ ابھی سب کچھ ہونا چاہیے۔ وقت غنیمت ہے۔ بیگم کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سنہرا موقعہ ہاتھ سے نکل جائے

بیگم :۔ ہائے اللہ! آج آخری تاریخ ہے۔ میں دونوں کی بلائیں لوں۔ خدا جانے اس وقت کہاں ہوں گے دونوں

دونوں :۔ (چارپائی سے سر نکال کر یکزبان ہو کر) ہم یہاں ہیں!

مرزا جی :۔ (بیوی سے مخاطب ہو کر) لو جی اور سنو ــ دیکھا تم نے ان شریروں کے کرتوت؟ کوئی بھلا مانس اسطرح پلنگ کے نیچے بھی چھپ جاتا ہے کیا۔

بیگم :۔ رہنے دیجئے آخر بچے ہی تو ہیں۔

مرزا جی :۔ (بگڑ کر) اسی طرح کا لاڈ پیار بچوں کو بگاڑ دیتا ہے

بیگم :۔ بگڑیں ان کے دشمن! ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔

مہرالدین :۔ (بات کاٹ کر) ہاں ابھی جو تصویروں کے بارے میں کوئی ذکر ہو رہا تھا

فخرالدین :۔ اور شاعری کے متعلق بھی

بیگم :۔ ہاں بیٹا! ابھی تم دونوں کے ابا کہہ رہے تھے کہ .....

مہرالدین :۔ جو ہم نے سب سُن لیا ماں

مرزا جی :۔(مہرالدین سے) دیکھو بھئی. تم لوگوں کے جوہر دکھانے کا وقت آیا ہے. تم ایسی تصویر بناؤ جو شاہکار کہلائے. یعنی دیکھتے ہی اکیڈمی والے مبلغ ایک ہزار روپے نقد تمہارے ہاتھ میں تھمائیں۔ اور تم (فخرو سے) ایسی گرما گرم غزل کہہ ڈال جو آسمانِ ادب کی بلندیوں کو چھو سکے۔ سُننے والے داد دیں اور دیر تک سر دُھنتے رہیں. یعنی ایک ایک شعر کی تپش سے اکیڈمی کے در و دیوار کو پسینہ آجائے۔

فخرالدین :۔ ابّا جان! آپ بے فکر رہیئے۔ مقابلہ کا سہرا ہم دونوں کے سر ہی رہیگا

مرزا جی :۔ انشااللہ

مہرالدین :۔ ابا جان! خوش نصیبی سمجھئے یا اتفاق۔ آج ہم دونوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ دو عظیم شاہکاروں نے آناً فاناً جنم لیا۔

فخرالدین :۔ ابا حضور! اپنے مہرو نے شرافت بنائی ہے۔

مرزا جی :۔(متحیر ہو کر) شرافت؟ لو جی اور سنو۔ شرافت بنائی ہے۔

مہرالدین :۔ جی ہاں ابا جان! میں نے شرافت بنائی ہے۔ بالکل شرافت کا مجسمہ (تصویر کو ایزل پر سیدھا رکھ کر) یہ دیکھئے ابا جان

مرزا جی :۔ (قہقہہ لگا کر) لو جی اور سنو ــــ یہ تو گدھا ہے!

مہرالدین :۔ یہ گدھا نہیں ابّا جان

مرزا جی :۔ تو کیا تمہاری تصویر ہے یہ؟

مہرالدین :۔ نہیں ابا جان! یہ میرے بلند تخیل کا شاندار نتیجہ ہے. شرافت. جو ــــ جو شریفوں کے پاس ہوتی ہے

فخرالدین :۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اپنے مہرالدین نے اِس تصویر کا ٹائیٹل شرافت جو رکھا ہے۔

مرزا جی :- (سمجھ کر) اچھا ـــــ اب سمجھ گئے ہم۔ سبحان اللہ! واہ واہ کیا خیال ہے. کس قدر باریک نقطہ ہے یہ!

بیگم :- میں نہ کہتی تھی کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ ایک دن ضرور خاندان کا نام روشن کریگا یہ لال۔ کیا خوبصورت گدھا بنایا ہے

مرزا جی :- تم چپ رہو جی بیگم (مہرالدین سے) ہاں تو۔ بر سر مطلب آمد بیٹا؟

مہرالدین :- اس تصویر کے ساتھ ایک لمبا چوڑا فلسفہ وابستہ ہے ابا جان۔

مرزا جی :- یعنی

مہرالدین :- یہ تصویر روس اور امریکہ کے لئے ایک اپیل ہے۔ جب وہ اس تصویر کی باریکیاں سمجھ لیں گے تو فوراً ایٹمی ہتھیار بنانا بند کر دیں گے۔ ہلک ایٹمی ہتھیار جیسے ایٹم بم۔ ہائڈروجن بم بننے بند ہو جائیں گے تو نسل انسانی بے خوف و ہراس سکون کے ساتھ رہے گی ـــــ اور یہ تصویر چین کے لئے ایک چیلنج کے مترادف ہے کہ اے چینیو! جبکہ گدھا کسی کو دولتی نہیں مارتا۔ کسی کو نہیں کاٹتا۔ لہٰذا شریف کہلاتا ہے۔ تم بھی شریفوں کی طرح گدھا چال چلکر اپنی عزت و آبرو برقرار رکھو۔ ساری دنیا کے لئے ایک سبق ہے کہ گدھے کی طرح اپنے کام سے لگن رکھو۔ آگے بڑھو اور کام کرو نئے نئے پروجیکٹ بناکر اپنی اقتصادی حالت خوشگوار بناؤ۔ اور یہ تصویر

مرزا جی :- (سلسلہ کلام کاٹ کر) بس بس! کافی ہے۔ آج ہم تمہارا لوہا مان گئے واقعی تمہاری یہ تصویر شاہکار ہے۔

مہرالدین :- (مسکراکر) شکریہ! یہ آپ کا حسن ظن ہے ـــ خیر ـــ اب آپ مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ میں اسے آخری ٹچ دیکر مکمل کر دونگا۔

مرزا جی :- (شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہاں ہاں بے شک جلدی کرو

(مہرالدین تصویر بنانے لگتا ہے)

فخرالدّین:۔ (منہ بسور کر) فخرو۔ فخرو۔ فخرو! ابا جان مجھے فخرو مت کہئے۔ بڑی انسلٹ ہوتی ہے۔ آج سے مجھے مرزا فخرالدّین پھیپھڑا کہہ کر پکارا کیجئے

بیگم:۔ پھیپھڑا۔۔؟ ہائے اللہ! اللہ پاک سلامت رکھے تمہارے پھیپھڑے کو یہ کیا کہہ رہا ہے بیٹا؟

فخرالدّین:۔ ماں تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی۔ مرزا فخرالدین تو میرا نام ہے لیکن تخلّص ہے پھیپھڑا

مرزا جی:۔ پھیپھڑا۔۔؟ لو جی اور سنو۔ یہ کیا بے تکا سا تخلّص رکھا ہے برخوردار کوئی اچھا سا رومان پرور تخلّص نہیں رکھ سکتے۔۔؟

فخرالدّین:۔ کیا کروں ابا جان۔ میں بھی تو مجبور ہوں۔ یوں تو دِل اور جگر ہی رومان پرور تخلّص کہلاتے ہیں۔ لیکن دِل لکھنوی اور جگر مراد آبادی سے خدا سمجھے۔ اُنہوں نے دِل اور جگر کا پہلے ہی بٹوارہ کر دیا۔ اب یہ بچا کھچا پھیپھڑا ہی رہ گیا ہے۔ سوائے غنیمت سمجھ کر میں نے جھٹ ریزرو کر لیا۔

مرزا جی:۔ بہت خوب! الفاظ کی قلّت اور وقت کی نزاکت سمجھ کر تم نے بہت اچھا کیا جو بروقت پھیپھڑا تخلّص رکھا۔

فخرالدّین:۔ ہاں تو غزل ہوئی ہے

مرزا جی:۔ (چارپائی پر بیٹھ کر) ارشاد! ارشاد!

فخرالدّین:۔ (کاپی کے اوراق اُلٹ کر۔ گلا صاف کرتے ہوئے) ؎ (ترنّم سے)

گوارا مجھے یہ جُدائی نہیں ہے — کہ مدّت سے چھٹی بھی آئی نہیں ہے

مرزا جی:۔ سُبحان اللہ! (ترنّم سے دہراتا ہے) گوارا مجھے یہ جُدائی نہیں ہے) واہ واہ سنتی ہو بیگم کیسا وجد آور مطلع کہا ہے تمہارے پھیپھڑے نے

بیگم:۔ ہائے میں اس کی بلائیں لوں

فخرالدّین:۔ شعر عرض ہے

مرزا جی:۔ ارشاد ! ارشاد

فخر الدّین:۔ اس زیست کے غم میں تلخی بڑی ہے۔ کہ املی میں مطلق کھٹائی نہیں ہے

مرزا جی:۔ لاحول ولا قوت ! کیا کھٹاس ہے

بیگم:۔ اجی دونوں کے ابا ـــ آج گھسیٹو نے بینگن لائے ہیں۔ اگر اُن میں اِملی ڈالی جائے تو کیا رہے ؟

مرزا جی:۔ لو جی اور سنو۔ تمہارے بھیبھڑے کے شعر نے ہمیں کیا کم کھٹا کر دیا تھا جو تم بینگن میں املی ڈالنے کی سوچ رہی ہو

فخر الدّین:۔ ایک جاندار شعر عرض ہے۔ اِس شعر کے لئے خاص طور پر آپ حضرات کی توجہ چاہوں گا۔

مرزا جی:۔ اِرشاد ! اِرشاد

فخر الدّین:۔ ؎ کرسی کا کیا ذکر حسرت کدے میں۔ یہاں بیٹھنے کو چٹائی نہیں ہے

بیگم:۔ (سسکیاں بھرتی ہے) ......

مرزا جی:۔ (بگڑ کر) لو جی اور سنو۔ اِدھر مشاعرہ جوبن پر ہے اور اُدھر تم ٹسوے بہانے لگیں۔

بیگم:۔ (رندھی ہوئی آواز میں) ٹسوے نہیں بہا رہی ہوں۔ میں تو اپنے مقدر کو کوس رہی ہوں۔ جِس نے بے شرم کو جنم دیا۔ کیا خبر تھی یہ گھر کا بھیدی ایک روز لنکا ڈھائے گا۔ سُنا نہیں گھر کی مجبوریاں کس طرح گا گا کر بیان کر رہا ہے۔ (ہچکی کے) یہاں بیٹھنے کو چٹائی نہیں ہے

فخر الدّین:۔ ماں تم سمجھتی کیوں نہیں۔ یہ شاعری ہے۔ شاعری میں ہر چیز جائز ہے

بیگم:۔ آگ لگے تمہاری ایسی شاعری کو گھر کا بھید فاش کرنا بھی جائز ہے کیا اور وہ بھی چٹخارے لے لے کر

فخر الدّین:۔ تمہیں کون سمجھائے ماں۔ اسے مبالغہ آرائی کہتے ہیں۔ مبالغہ آرائی شاعری کی رُوح ہے۔

مرزا جی :- لو جی اور سنو- مشاعرے کا مزا کر کرا کر دیا- اس بھاگیہ وان نے- ہاں تو میرے پھیپھڑے آگے سناؤ- بخدا مزا آ گیا

فخرالدین :- رہا جاگتا ہوں میں اُلّو کی مانند - مجھے ہجر میں نیند آئی نہیں ہے

مرزا جی :- سبحان اللہ

فخرالدین :- بینک بیلنس لٹایا ہے راہ وفا میں - بٹوے میں اب ایک پائی نہیں ہے

بیگم :- دیکھا آپ نے؟ کس طرح شکایت کر رہا ہے- کہتی تھی نا اسے بلا ناغہ جیب خرچ دیا کریں- ورنہ کسی روز خاندان کی ناک کٹوا دیگا-

مرزا جی :- تم چپ رہو بیگم- اس وقت مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہے- واہ واہ- سبحان اللہ کیا شعر ہے ؎ بینک بیلنس لٹایا ہے راہِ وفا میں

فخرالدین :- مقطع عرض ہے

مرزا جی :- ارشاد ! ارشاد !

فخرالدین :- پھیپھڑا یاد کرتا ہے لنچ اور ڈنر پر
تمہیں کیا کبھی چھینک آئی نہیں ہے

مرزا جی :- (اُچھل کر) مکرر مکرر

فخرالدین :- پھیپھڑا یاد کرتا ہے لنچ اور ڈنر پر
تمہیں کیا کبھی چھینک آئی نہیں ہے

مرزا جی :- (فخرالدین کو گلے لگا کر) مرحبا مرحبا- سبحان اللہ! کیا غزل کہدی ہے- واقعی اسکا ایک ایک شعر شاہکار ہے- مجھے تم سے یہی اُمید تھی برخوردار! تم ضرور مرزا بلند اختر کا نام روشن کروگے-

فخرالدین :- (تصویر کو ایزل سے اتار کر مرزا جی کے سامنے لاتا ہے) یہ لیجئے ابا جان- میرا شاہکار بالکل تیار ہے

مرزا جی :- مبارک ہے- مبارک ہے-

بیگم :- (خوش ہو کر) میں دونوں کی بلائیں لوں- نظر بد دور (دروازے

کی جانب منہ کر کے) ارے او گھسیٹو!
گھسیٹو :۔ (پس منظر سے) جی مالکن : (فوراً ہی سٹیج پر آ جاتا ہے)
بیگم :۔ گھسیٹو! جا اپنے چھوٹے سرکاروں کے لئے چائے لے آ
گھسیٹو :۔ ابھی چائے نہیں ملے گی مالکن
بیگم :۔ (بگڑ کر) کیوں نہیں ملے گی۔ خیر تو ہے ؟ جانتا نہیں کہ میرے دونوں
لال تھک گئے ہیں۔
گھسیٹو :۔ کیا کروں سرکار۔ سارا دودھ بلی چٹ کر گئی
مرزا جی :۔ لو جی اور سنو۔ رسوئی چھوڑ کر کہیں گھوڑے بیچ کر سویا ہوگا۔ کام چور
موقعہ غنیمت جان کر بلی دودھ نہ پی جائے تو کیا بھوکوں مرے گی
بے چاری ؟
مہرالدین :۔ (بات کاٹ کر) رہنے دیجئے ابا جان۔ اب اس گھسیٹو کو کون
منہ لگائے (گھسیٹو سے) اب چھوڑ دو یہ چائے والے کا سلسلہ
یہ لو میری بنائی ہوئی یہ پینٹنگ اکیڈمی میں دے آؤ (ایک کاغذ کے پرچے
پر لکھ کر) یہ رہا اکیڈمی کا پتہ
فخرالدین :۔ لگے ہاتھوں میری یہ غزل بھی دیتے آنا
گھسیٹو :۔ (دونوں چیزیں بغل میں دبا کر) بہتر سرکار۔ یوں گیا اور یوں آیا
مرزا جی :۔ اور سنو۔ اکیڈمی والوں سے دونوں شاہکاروں کی رسیدیں بھی الگ الگ
وصول کرنا۔
گھسیٹو :۔ بہتر سرکار ! (جاتا ہے)
مہرالدین :۔ (اونچی آواز) بھئی سنبھال کر رکھنا تصویر کو۔ یاد رہے یہ شاہکار ہے
فخرالدین :۔ میری غزل بھی
مرزا جی :۔ (مونچھوں کو تاؤ دے کر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے) ذرا حساب لگانا
بیگم۔ کل ملا کر کتنا انعام ملے گا ہمیں۔ مبلغ ایک ہزار روپیہ مہرالدین

کا، اور پانچ سو اپنے فخر الدین کے؟

بیگم :- (سوچ کر) پندرہ سو

مرزا جی :- یعنی ڈیڑھ ہزار روپیہ

بیگم :- روپے آتے ہی میرے لئے دو جوڑے کنگن لیتے آنا۔ رسوئی میں برتن مانجھ مانجھ کر پرانے کنگن بالکل گھس گئے ہیں۔

مرزا جی :- لو جی اور سنو! میں تو ساہوکار کا قرضہ اور دودھ والے کا بل چکانے کا پلان بنا رہا ہوں، اور تمہیں کنگن یاد آئے۔

فخر الدین :- ابا جان! میں مشاعرے میں جانے سے شرماتا ہوں، اب کی بار میری اچکن ضرور سلوا دیجئے گا۔

مرزا جی :- (کروٹ بدل کر مسکراتے ہوئے) ضرور! ضرور

مہر الدین :- مجھے بھی ایک واسکٹ مخمل کا۔ ایک کوٹ ٹویڈ کا۔ ایک سوٹ ٹریلین کا۔ ایک بوٹ فلیکس کا۔ ایک ٹوپی ......

مرزا جی :- بس بس! پچاس عدد چیزوں کی فرمائش فی منٹ کی رفتار سے کئے جا رہے ہو۔ تم باضابطہ اپنی مطلوبہ چیزوں کی فہرست بنا کر پیش کرو بعد ازاں ہم اُس پر غور فرمائیں گے۔

بیگم :- میرے لئے ریشمی دھاگے کا ایک پراندا بھی یاد رکھئے گا۔

مہر الدین :- میرے لئے ایک عدد رسٹ واچ بھی ضرور منگوا دیجئے گا۔

فخر الدین :- ارے! باپ رے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ مجھے بھی تو ایک عدد ٹوپی کی اشد ضرورت ہے۔

بیگم :- (ناز و ادا کے ساتھ) دیکھئے کہیں میری سینڈل نہ بھول جانا۔

مرزا جی :- ہاں! ہاں! میں تمہارے سینڈل کبھی بھول سکتا ہوں؟ لو جی اور سنو۔ اجی دونوں کی اماں مجھے تو تمہارے سینڈل مرتے دم تک یاد رہیں گے

بیگم :- (مسکرا کر) مجھے آپ سے یہی اُمید تھی۔

مرزا جی:۔ (پہلو بدل کر) کسی کو کچھ چاہئے، اور کسی کو کچھ۔ لیکن کسی بھلے مانس کو یہ بھی خیال ہے کہ آخر مجھے بھی تو ایک اوورکوٹ کی ضرورت ہے

بیگم :۔ ضرور لائیے۔ کون کہتا ہے مت لائیے۔ لیکن ساتھ میں میرے لئے پیلے رنگ کی شلوار بھی ضرور لیتے آنا

مرزا جی:۔ تمہاری شلوار جائے جہنم میں۔ کتنی چیزیں بیک وقت تم سب کے لئے منگاؤں؟ فضول خرچی کی بھی حد ہوتی ہے۔ آخر ڈیڑھ ہزار ہی تو ہے

فخر الدین:۔ (گھسیٹو کو دیکھ کر) وہ رہا گھسیٹو

مہر الدین۔ دے آیا اکیڈمی میں میری تصویر

گھسیٹو:۔ جی ہاں سرکار

فخر الدین:۔ میری شاہکار غزل دیکھ کر کیا کہا اکیڈمی والوں نے؟ پڑھ کر اُن کے رونگھٹے کھڑے ہوئے ہوں گے؟

گھسیٹو:۔ آپ کی غجل (غزل) پڑھ کر اکیڈمی والوں نے بڑے جور (زور) کا قہقہہ لگایا

مرزا جی:۔ لو جی اور سنو۔ قہقہہ نہ لگاتے تو کیا رو دیتے؟ آخر چیز بھی تو شاہکار تھی۔

گھسیٹو:۔ وہاں کے بڑے صاب (صاحب) نے اُس غجل کو دیکھا، اور ناک بسور کر دیر تک چھی چھی کی، اور جو میز کے نیچے ٹوکری ہوتی ہے نا جھٹ اُسی میں ڈال دی

فخر الدین:۔ ہائیں! یعنی ردی کی ٹوکری میں (لڑکھڑا کر گر جاتا ہے) اور ہائے ہائے کرتے ہوئے غش کھا جاتا ہے۔

مرزا جی:۔ (متحیر ہو کر) ردی کی ٹوکری میں؟

مہر الدین:۔ (گھبرا کر) لیکن میری پینٹنگ کے بارے میں کیا رائے قائم کی اُنہوں نے۔؟ جلدی بتاؤ گھسیٹو بھائی میرا دل بیٹھا جا رہا ہے

گھسیٹو:- مجھ سے تو کچھ بھی نہیں کہا سرکار۔ البتہ حسین صاب (صاحب) نے آپکی تصویر اُٹھا کر کوڑا دان میں پھینک دی۔

مہرالدین:- (تعجب سے) پھینک دی

گھسیٹو:- جی ہاں وہ صاب کہہ رہا تھا کہ نہ جانے یہ تصویر بنا کر کس گدھے نے وقت ضائع کیا ہے؟

مہرالدین:- میں نے وقت ضائع کیا

گھسیٹو:- اور بڑے صاب نے مجھے بتایا کہ یہ تصویر نمائش میں رکھنے کے قابل ہی نہیں۔ تو انعام کیا ملے گا۔

مہرالدین:- (رندھی ہوئی آواز میں) یعنی میرا شاہکار ریجکٹ کر دیا گیا۔

مرزاجی:- (ماتھے پر ہاتھ مار کر) لو جی اور سنو

مہرالدین:- (سر پکڑ کر روتے ہوئے) ساری محنت ضائع ہو گئی۔ کتنے ناز سے تصویر بنائی تھی۔ خیر جائیں گے کہاں؟ —— سمجھ لوں گا اُن ظالم اکیڈیمی والوں سے

مرزاجی:- (غصے میں لاٹھی زمین پر ٹیکتے ہوئے) لو جی اور سنو۔ اب کیا سمجھے گا۔ گدھا کہیں کا۔ بنانے سے پہلے سوچ لینا تھا۔ کہ گدھے کی تصویر بناؤں یا کہ اپنی۔ لو جی اور سنو۔ گدھا بھی کہیں شاہکار ہو سکتا ہے؟ اور یہ کمبخت فخرو بڑا شاعر بنا پھر رہا تھا۔

بیگم:- (بے ہوش فخرالدین کو سہارا دیتے ہوئے) ہائے اللہ میرے لال۔ میرے فخرو بیٹا

مرزاجی:- (طنزاً) اسے فخرو مت کہو۔ اس کی انسلٹ ہوتی ہے۔ یہ حضرت مرزا فخرالدین پھیپھڑا ہے۔ ہونہہ۔ لو جی اور سنو میں بھی کن گدھوں کے جھانسے میں آگیا۔ سارا پلان ملیا میٹ کر دیا اِن گدھوں نے (دل پر ہاتھ رکھ کر) ہائے ہائے مر گیا

(جھکا کر پلنگ پر لیٹ جاتا ہے)

بیگم :- ہائے اللہ! ارے او گھسیٹو - جا دوڑ کر ڈاکٹر صاحب کو فوراً لے آ - تمہارے سرکار کو آج پھر دل کا دورہ پڑ گیا ہے

گھسیٹو:- بہت اچھا سرکار - یوں گیا اور یوں آیا (جاتا ہے)

بیگم :- (ہاتھ ملتے ہوئے) ہائے اللہ! اب میں کیا کروں

(پردہ گرتا ہے)

بنسی نردوش

ایک رات کا مہمان

آوازیں

وارڈ نمبر ۱	ہیڈ وارڈ
قیدی نمبر ۱	نوہ سانگ
قیدی نمبر ۲	مسافر
وارڈ نمبر ۲	عورت
داروغہ	بھاشاں

قیدخانے کی آہنی سلاخوں کے درمیان ایک راستہ سا نظر آتا ہے۔ اس راستے پر کسی کے قدموں کی آہٹ۔ کسی کے سانس کا تیز تیز اُتار چڑھاؤ جیسے کوئی ہانپ رہا ہے جیسے کوئی ڈر رہا ہے۔ جیسے کوئی بھاگ رہا ہے۔ ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی جا رہی ہیں۔ ان ہواؤں کی آوازوں میں سانسوں کا زیر و بم رُک جاتا ہے۔ اور اُس پر یہ آواز اُبھرنے لگتی ہے۔

وارڈ نمبر ۱ جاگنے والے سو جاؤ —— جاگنے والے سو جاؤ

(آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتی ہے اور ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے)

قیدی نمبر ۱۔ (بارک کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر) ہا ہا ہا ہا ہا ہا۔ جاگنے والے۔ جاگنے

والے سو جاؤ جیل کی تنگ و تاریک بارکوں میں انسان کے بیدار ضمیر سے
خوف کھانے والے حکمران ہمیں سلانے کا پیغام دے رہے ہیں بنتے
ہو (دوسرے قیدی سے مخاطب ہو کر) جاگنے والے سو جاؤ۔
سو جاؤ ——— ہاہاہا ——— سو جاؤ...... سو جاؤ

قیدی نمبر۲:۔ لی چانگ۔ کیا یک بک لگا رکھی ہے۔ رات کی تاریکی میں اپنا یہ
فلسفہ کیا اِن دیواروں کو سنا رہے ہو۔ سو جاؤ بھائی۔

قیدی ۱:۔ ہاں سو جاؤ ——— تم بھی یہی کہتے ہو ——— سو جاؤ۔ اپنے
۔ ذہن کے تہہ خانوں سے ابھرنے والی آواز کو سلا دو۔ لیکن یہ
(ذرا ٹھہر کر) سوئے گی۔ (سوالیہ انداز میں) نہیں سوئے گی۔ وارڈر
کے چیخنے اور چلانے کے باوجود نہیں سوئے گی جیل کے اس ذلیل
تہہ خانے میں بھی یہ آواز اُبھرے گی..... ہاہاہاہا

وارڈر نمبر۲:۔ لی چانگ فلسفی چانگ ——— تمہاری یہ سچائی تمہیں بہت
مہنگی پڑے گی۔ تمہیں تو مرنا ہے لیکن ہمیں سونے دو۔ ہمیں کیوں
اپنے ساتھ لے ڈوبتے ہو۔

قیدی ۱:۔ تم نہیں ڈوب سکتے۔ قیدی تم ساگر کی لہر ہو۔ تم ایک موج
ہو۔

قیدی نمبر۲:۔ موج بیکراں ——— تم یہی کہو گے ——— مگر یہ سب بکواس ہے۔
لی چانگ

قیدی نمبر۱:۔ تم موج بیکراں ہو جو ساگر میں ہو کر بھی ساگر سے بلند ہوتی ہے۔ تمہیں
ڈوبنے کا ڈر کیسا۔ ڈرتے نہیں بھائی۔ ڈرنا تو اُن کو چاہیے جو ساگر
کے ساحل پر تمہارے بانکپن کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ مگر تمہاری اُڑان
دیکھ کر اندر ہی اندر خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں اور تبھی تو یہ
آواز بھی دے رہے ہیں۔ لہروں کو سلانے کی آواز

(واڈر نمبر ا کی آواز اونچی ہو جاتی ہے)

واڈر ۱:۔ جاگنے والے سو جاؤ ـــــ رات آدھی رہ گئی

قیدی ۲:۔ سنتے ہو۔ رات آدھی رہ گئی

قیدی ۱:۔ کون کہتا ہے رات آدھی رہ گئی ہے۔ اس رات کی سیاہی تو ابھی اتنی گہری ہے اور اتنی کالی میرا دل نہیں مانتا کہ یہ رات اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر۔ کسی ہلچل کے بغیر۔ کسی ہنگامے کے سوا۔

(واڈر نمبر ۱ کی آواز دور ہوتی ہے، اور کسی کے دوڑنے کی صدا سنائی دیتی ہے اور فوجی لباس میں واڈر نمبر ا نمودار ہوتا ہے۔)

واڈر ۱:۔ کون ہو ـــــ؟ ..... میں پوچھتا ہوں تم کون ہو

واڈر ۲:۔ میں ہوں (ہانپتا ہے) میں ...... (سامنے آتا ہے)

واڈر ۱:۔ تم کون ــ؟

واڈر ۲:۔ موشانی۔ موشانی۔ بارک نمبر بارہ کا واڈر ـــــ موشانی

واڈر ۱:۔ موشا کیا بات ہے۔ تم اس قدر ہانپ رہے ہو

واڈر ۲:۔ ہاں (سانس پھولتا ہے اور قریب آتا ہے)

واڈر ۱:۔ ادھر کہاں جا رہے ہو

واڈر ۲:۔ (لکنت کے انداز میں) ہیڈ واڈر کے پاس۔ قیدی نمبر ۲۱ فرار ہو گیا

واڈر ۱:۔ (حیرت سے) کیا کہا ـــــ!

واڈر ۲:۔ ہاں ہاں بارہ ویں بارک کا قیدی نمبر ۲۱ اپنی سیل میں موجود نہیں ہے۔

واڈر ۱:۔ بکواس بند کرو۔ کوئی سن لے گا

واڈر ۲:۔ (آہستہ سے) میں سچ کہتا ہوں۔ میں ابھی ابھی خود دیکھ آیا ہوں

وارڈر ۱:۔ سیل کے دروازے پر قفل نہیں ہے کیا

وارڈر ۲:۔ ہاں تالے پڑے ہیں۔ مگر اندر کوئی نہیں ہے

وارڈر ۱:۔ بے ہودہ بات۔ اندر کوئی نہیں ہے۔ آج تک اونچی اونچی دیواروں کے گھیرے میں گھرے ہوئے اس قید خانے سے کسی نے بھاگنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ جو وہ منحنی سی صورت والا آدمی کرسکتا ہے

وارڈر ۲:۔ تمہیں یقین نہیں آتا

وارڈر ۱:۔ تم نے اپنی طرف سے پوری طرح اطمینان کرلیا کیا

وارڈر ۲:۔ ہاں ہاں میں نے ٹارچ سے سلاخوں کے اندر جھانک کر دیکھ لیا (روتی سی آواز) اس کی کھاٹ خالی تھی ــــــ کونے کے ایک طرف اوڑھنے کو چادر پڑی تھی اور اندر کوئی نہیں تھا ــــــ کوئی نہیں

وارڈر ۱:۔ تو سمجھو اپنی شامت آگئی۔ وہ حکومت کا خطرناک مخالف تھا۔ اس کے فرار کی خبر سن کر ساری حکومت لرز اٹھے گی۔ چین میں زلزلہ آئیگا سمجھے زلزلہ

وارڈر ۲:۔ میں جانتا ہوں مگر اب کیا کروں۔ اب کیا کروں، کچھ سوجھتا نہیں

وارڈر ۱:۔ ہیڈ وارڈ کو خبر دی۔

وارڈر ۲:۔ وہیں تو جارہا ہوں، او میرے خدا

وارڈر ۱:۔ خدا کا نام لیتے ہو رجعت پسند کہیں کے

وارڈر ۲:۔ نہیں نہیں یہ تو میری زبان سے یوں ہی نکل گیا۔ دراصل ــــ دراصل میں خوف کے مارے کانپ رہا ہوں۔ کسی سہارے کی تلاش میں ہوں۔ کسی مددگار کی ضرورت ہے مجھے۔ میں کہاں جاؤں۔ اب میں کیسے کہوں۔ ہیڈ واڈر سنے گا تو میری کھال کھینچ لے گا۔ ــــــ مجھے ہر بار تاکید کی جاتی تھی کہ قیدی نمبر 21 کا خاص خیال رکھوں۔ اسے زمین کھا جائے گی یا آسمان نگل جائے گا۔ یہ

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ورنہ میں ...... میں تو اس بارک
کے باہر ہی ڈیرا ڈال دیتا۔

وارڈر ۱:۔ ہیڈ وارڈر کو اطلاع دئے بغیر چارہ نہیں۔

وارڈر ۲:۔ ٹھہرو پہلے مجھے آواز لگانے دو .... جاگنے والے سو جاؤ
.... سو جاؤ .... سو جاؤ

وارڈر ۱:۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔ میں خود دیکھ لوں .... تم کہیں پی کر
تو نہیں آئے ہو

وارڈر ۲:۔ میں پی کر آیا ہوں۔ میں نے پی لی ہے۔ یہاں تو کھانے کو پوری
غذا نہیں ملتی اور تم پینے پلانے کی بات کرتے ہو۔ مجھے تو اپنی
حالت پر رحم آتا ہے۔ نہ جانے کیا گناہ کئے تھے میں نے جو
مجھے اس جہنم میں پہرے دار کے کام پر لگا دیا گیا۔ میں ہل
جوت سکتا تھا۔ شٹل چلا سکتا تھا۔

وارڈر ۱:۔ بس بس رہنے دو .... سنانے لگے اپنا دکھڑا اوروں کی طرح
(چلنے کی آواز ساتھ ساتھ جاتی ہے)

وارڈر ۲:۔ (سلاخوں کو بجاتا ہے) یہ دیکھ لو۔ اندر گھپ اندھیرا ہے۔ کم از کم
اس کے سانس لینے کی آواز تو آسکتی تھی۔

وارڈر ۱:۔ ٹارچ ذرا ادھر کر دو۔ ارے ہاں یہاں تو کوئی نہیں ہے۔

قیدی ۱:۔ تم کسے ڈھونڈ رہے ہو پالتو کتے؟

وارڈر ۱:۔ یہ کون ہے؟

وارڈر ۲:۔ قیدی نمبر ۲۰ بول رہا ہے

قیدی ۱:۔ نہیں۔ ایک ضمیر بول رہا ہے۔ ایک لہر جاگ رہی ہے۔ ایک موج
بول رہی ہے۔

وارڈر ۲:۔ پاگل بکواس بند کر ـــــ نہیں تو تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔

قیدی ۲:۔ کھینچ لو بھائی ـــــ یہی تو کسر رہ گئی ہے اس فلسفی ہیں۔ رات بھر یہ اپنی بک بک سے نیند اچاٹ کر دیتا ہے۔ اپنی ....

واڈر نمبر ۱:۔ (سلاخیں پیٹنے لگتا ہے) خاموش ۔ خاموش ہو جاؤ تم دونوں

قیدی ۱:۔ سونے والے سو جاؤ ـــــ مجھے نیند آ رہی ہے۔ اور تم مجھے سلاخیں پیٹ کر کیا ڈراتا ہے۔ تو میری زبان کھینچ لے گا۔ اسے تو نہیں کھینچ سکتا۔ قیدی نمبر ۲۱ کو بھی تم نے ایک دن یہی کہا تھا۔ یاد ہے۔

واڈر ۱:۔ میں نہیں بھولتا۔ مجھے یاد ہے تم دیکھ لینا۔ وہ جہاں بھی جائے گا۔ حکومت کے شکنجے سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

واڈر ۱:۔ میں نہیں بھولتا۔ مجھے یاد ہے تم دیکھ لینا۔ وہ جہاں بھی جائیگا ـــــ حکومت کے شکنجے سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

قیدی نمبر ۱:۔ اپنے حاکموں کی جھوٹی ہڈیوں پر پلنے والے کتے۔ جا........ اپنی خیر منا۔ ابھی تمہاری جواب طلبی ہو گی........ ہا ہا ہا........ ابھی تم خود اس سیل میں بے بس اور مجبور نظر آؤ گے۔ (ہنستا ہے اور یہ ہنسی الارم بجنے تک پس منظر میں رہتی ہے)

واڈ نمبر ۲:۔ یہ سچ کہتا ہے موشا۔ اگر قیدی نہیں ملا تو ہم دونوں کو اس بند کمرے میں سڑنا ہو گا۔

واڈر ۱:۔ قیدی کہاں جا سکتا ہے ۔ لوہے کے دروازے بند ہیں۔ یہ بارھویں بارک ہے۔ اُسے باہر نکلنا ہو گا تو گیارہ بارکوں کے لوہے کی سنگینوں سے نکل کر جانا ہو گا۔

واڈر ۲:۔ ہو سکتا ہے اس نے دیوار پھلانگ دی ہو

واڈر نمبر ۱:۔ ارے نہیں........ مریل سے آدمی میں یہ قوت کہاں سے آئی.... پچاس گز اونچی دیوار پھلانگنا آسان نہیں

واڈر ۲:۔ اب تم کہاں جا رہے ہو

واڈر نمبر ۱:۔ میں الارم کر دوں گا
(الارم کی آواز گونج اٹھتی ہے۔ بارکوں میں قیدی شور مچانے لگتے ہیں واڈر دوڑتے پھرتے ہیں۔ نیا سین شروع ہوتا ہے۔ داروغہ کمرے میں چکر کاٹ رہا ہے۔
داروغہ :۔ (کانپتے ہوئے) کہیں ملا۔
ہیڈ واڈر :۔ کہیں بھی نہیں۔ دروازے اندر سے مقفل ہیں۔ اس لئے اس کے باہر جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
داروغہ :۔ پھر کہاں گیا۔ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ میں کچھ نہیں جانتا میں آدھ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ ساری بارکوں اور ساری سیلوں کی تلاشی لی جائے۔ اگر قیدی ابھی ابھی میرے سامنے پیش نہیں ہوا تو میں حکم دیتا ہوں کہ بارہ ویں بارک کے تمام واڈر برف خانے میں ڈال دئے جائیں۔ منجمد برف کی یخ بستہ سلوں پر ان کے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔
ہیڈ واڈر :۔ بارہویں بارک کا واڈر نمبر ایک موشانی کہاں ہے
واڈر ۱ :۔ جناب والا۔ آپ کی ہدایت سے پہلے ہی گرفتار ہو چکا ہے۔
ہیڈ واڈر :۔ کہاں ہے وہ اسے میرے سامنے پیش کرو۔
نمبر ۱ :۔ جناب والا۔ واڈر موشانی حضور میں پیش ہے
داروغہ :۔ کم بخت کام چور۔ نکمے۔ بتاؤ وہ سانگ کہاں ہے۔ کہاں ہے
واڈر ۲ :۔ (ہکلاتا ہے) حضور حضور ....
داروغہ :۔ سازشی شیطان۔ اب تمہاری زبان کیوں نہیں کھلتی۔ کیا تم نہیں جانتے وہ سانگ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے فرار ہونے کی خبر سن کر تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے فرار ہونے کی خبر جیل سے باہر نکلی تو اس جیل خانے کو اسی دم بارود سے اڑا دیا جائے گا۔

وارڈر ۱ :- میں بے گناہ ہوں حضور۔ میں نے۔ میں نے ـــــ
داروغہ :- تم نے اس کے گیت سُنے اور خوش ہو کر اُسے فرار ہونے میں مدد دی۔
تم نے اس کی دلآویز باتوں میں آکر اپنے فرائض سے غفلت برتی۔
تم نے کیا سوچ کر اُسے بھگا دیا۔ بندر کی اولاد۔
وارڈر ۲ :- مجھے نہیں معلوم وہ کہاں گیا۔
داروغہ :- تو پھر کسے معلوم ہے بتاؤ۔
وارڈر ۱ :- حضور میرے خیال میں قیدی نمبر ۲۰ سے پُرخاش کی جائے۔
داروغہ :- قیدی ۲۰۔ وہ پاگل فلسفی۔ اُسے کیا معلوم وہ لہروں اور موجوں کی زبان میں بات کرنے والا باتونی۔ وہ بتائے گا کہاں
ہیڈ وارڈر :- تعجب نہیں اُسے سب معلوم ہو۔
داروغہ :- تو اُسے فوراً لے آؤ۔ جاؤ۔ جاؤ۔ نہ آئے تو زنجیروں میں باندھ کر لے آؤ۔

(سین کی تبدیلی)

قیدی ۱ :- (ہنستا ہے) ڈر گئے۔ ایک موج اُٹھی اور ساحل کو چھو کر گزر گئی، اور تم ڈر گئے۔ تمہارے ایوان ہل گئے (ہنستا ہے) ہا ہا ہا ہا ہا ہا
داروغہ :- لی چانگ۔ تمہارا شاعر دوست کہاں ہے؟
قیدی ۱ :- میرا دوست میرا ضمیر ہے، اور وہ میرے پاس ہے۔ اُسی طرح آزاد اُسی طرح بیدار اور اُسی طرح بے داغ۔ جس طرح تمہارے کمرے میں جلنے والا یہ بلب ہے۔
داروغہ :- لی چانگ۔ تم فلسفیوں کی زبان میں میرے ساتھ بات نہ کرو۔ میں جو پوچھتا ہوں اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ اگر وہ سانگ نہیں ملا تو تمہیں چین نہیں مل سکتا۔
قیدی ۱ :- چین مل رہا ہے۔ چین میں چین بھی کوئی شے ہے۔ داروغہ صاحب

چین کی جنتا کا چین تو اُسی دِن لُٹ گیا تھا جب ایک آندھی آئی
اور ساگر کی خاموش لہروں میں ایک تلاطم پیدا کر کے ساحل سے دُور بہت
دُور جا کر اُس دھول کے ساتھ مل گئی جو ابھی تک اس وسیع اور عریض
خطّے کے آکاش پر کالے بادلوں کی طرح منڈلا رہی ہے۔ اب تُم لہر سے پوچھتے
ہو کہ وہ بے قرار نہیں۔ بے چین نہیں۔ تم اس لہر کا چین چھین لوگے۔ یہ کیوں
کرتے ہو تم اسے چین ہی کہاں ہے۔

داروغہ:- لی چانگ - ذرا تحمل سے بات کرو بھائی۔ میں تمہارا دُشمن تو نہیں۔ میں
ماؤ کی حکومت کا ایک معمولی سا ملازم ہی تو ہوں۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم
کیا کرتے ——— بتاؤ۔ مجھے حکم ملتا ہے قیدیوں کے ساتھ سختی کرنے
کا۔ میں کرتا ہوں۔ مجھے ہدایت مِلتی ہے قیدیوں کو صرف ایک وقت کا کھانا
دینے کا ——— میں ایک وقت کا کھانا دیتا ہوں۔ دو وقت کا دوں تو
راشن کا کوٹہ کیسے پُورا کروں۔ یہاں پائی پائی کا حساب دینا پڑ رہا
ہے۔ اور اس حالت میں اگر وہ سانگ جیسا ملزم فرار ہو جائے تو
تم ہی سوچو۔ میری جگہ کہاں ہے۔ میرے ساتھ کیا حکومت انسانوں کا
سا سلوک کرے گی۔

قیدی ۱:- تُم سب اس نظام کے کل پُرزے ہو۔ جس نے انسانی ذہن کو بالکل
تنگ دائرے میں قید کر رکھا ہے۔ تم سب اسی برتاؤ کے مستحق ہو۔

داروغہ:- میں نے کیا کیا ہے لی چانگ

قیدی ۱:- تم ——— تُم نے کیا نہیں کیا۔ اپنے آقاؤں کی خوشی اور خوشنودی
کے لئے تم نے لوہ سانگ کو انگاروں کی طرح تپتی ہوئی گرم سلاخوں
کے بند کمرے میں ڈالا۔ تب بھی تمہاری تسلّی نہیں ہوئی۔ تم نے
یخ بستہ برف کی سلوں پر اُسے ننگے بدن لٹایا۔ تب بھی تمہاری
رُوح نے تمہیں ملامت نہیں کی۔ اب پوچھتے ہو میں نے کیا کیا۔

داروغہ:- اس میں میرا کیا دوش۔ اُس کا ایک گیت جیل سے باہر پہنچا۔ چند ہی دنوں میں سارے چین میں مقبول ہوا۔ جب حکومت کو اس کی خبر پہنچی تو مجھے پھٹکارا گیا۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں یہ پتہ کروں کہ یہ گیت لوہ سانگ نے لکھا کیسے، اس کے پاس کاغذ اور قلم کہاں سے آیا، اور یہ گیت ان چار دیواروں سے باہر پہنچا کیسے۔

قیدی نمبر ۱:- ہوا لے گئی۔ تم ہوا کو قیدی تو نہیں کر سکتے۔ ضمیر کی آواز لے گئی تم ضمیر کو کچل نہیں سکتے۔ لہر لے گئی تم ساگر کی لہروں کو زنجیروں میں ڈال تو نہیں سکتے۔ تم اِنسان کو مار سکتے ہو لیکن اس کی عظمت، اس کی اِنسانیت اور اس کے اخلاق کا جوہر اُس سے چھین نہیں سکتے۔

داروغہ:- لی چانگ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تمہیں بھی میرے ساتھ ہمدردی ہونی چاہئے —— آخر ہم بھی اِنسان ہیں۔ پابند اور مجبور! بتاؤ لوہ سانگ کہاں ہے۔ میں بہت فکرمند ہوں۔ اگر قید خانے کے آدھے سے زیادہ قیدی بھی بھاگ جائیں تب بھی مجھے اتنا خدا نہ ہوتا کیونکہ یہ لوگ میری نظروں میں اتنے خطرناک نہیں۔ اُنھوں نے صرف بیگار پر کام کرنے سے انکار کیا ہے مگر لوہ سانگ کی بات اور ہے۔

قیدی نمبر ۱:- اِس لئے کہ وہ ادیب ہے۔ ایک شاعر ہے۔ اس کی آواز میں جادو ہے۔ اثر ہے۔ سچائی ہے۔ تم اس کی سچائی سے خوف زدہ ہو۔ خائف ہو۔

داروغہ:- یہ میں نہیں کہتا۔ یہ حکومت اور ماؤ کہتے ہیں، اور کوئی ایسی بات نہ ہوتی تو لوہ سانگ کی کتابوں پر پابندی نہ ہوتی۔ اس کے گیتوں پر پابندی نہیں ہوتی۔

قیدی نمبرا:۔ پابندی ۔شاعر کی آواز پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ یہ آواز تمہاری اور میری طرح ہوا میں تحلیل ہوتی۔ جب یہ آواز اُبھرتی ہے تو ہوا کے پر آتے ہیں۔ اور اپنے پروں پر اٹھا کر ہوا ان گیتوں کو اُن کی سچائی کی آواز کو دور بہت دُور لے جاتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس جو اس آواز کو کانوں سے پی جاتے ہیں، اور دل کے گوشوں میں چھپا لیتے ہیں، جو سچائی اور امن کے متوالے ہیں۔ مگر جو آج بھوک اور تنگدستی کا شکار ہیں۔ جنہیں تمہاری حکومت نے ایک ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔ جس کا ذکر بھی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔

داروغہ:۔ تو۔ تم نہیں بتاؤ گے وہ سانگ کہاں ہے

قیدی ۱:۔ میرے بتانے یا نہ بتانے سے کیا ہوگا۔ اب وہ تمہاری بستی سے بھی بہت دُور نکل گیا ہوگا۔ تم اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس بات کی مجھے پوری تسلی ہے ہاہاہا۔ لہر اُٹھی، موج بنی اور پھر ساگر بھی مل گئی۔ اب لہر کہاں ملے گی۔ اس ساگر کو کھنگالو گے تم

داروغہ:۔ خاموش ہو جاؤ، مکار باتونی۔ لوشا۔ لوشا کہاں مر گئے تم لوگ

ہیڈ وارڈر:۔ حضور۔ حضور

داروغہ:۔ (غصہ سے) جاؤ۔ سپاہیوں کی ایک ٹکڑی لے کر بستی کا گوشہ گوشہ چھان مارو۔۔۔ گھر گھر کی تلاشی لو۔ زندہ یا مردہ اُسے پکڑ لے آؤ۔۔۔ اور اگر وہ اس بستی سے نکل چکا ہوگا۔ تو مجھے خبر کر دو تاکہ میں ہیڈکوارٹر کو اطلاع پہنچا دوں تاکہ مُلک کے کونے کونے میں اس کو تلاش کیا جائے۔ اور ہاں لی چانگ کے کپڑے اتار کر اُسے ننگے بدن سرد خانے میں ڈال آؤ۔ جاؤ۔۔۔ سنو۔۔۔ بارکوں کے سارے پہرے دار بدل دو۔ جو اس وقت ہیں انھیں میرے حضور میں پیش ہونے کا حکم دو۔ میرا ہنٹر کہاں ہے، ٹھیک ہے۔ لے آؤ

ادھر اور تم جاؤ —— جب تک تُم واپس آؤ گے۔ میں اس ھنٹر کی مار سے
پہرے دار کی کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔
(سیچے کو ہوا میں اُچھالنے کی آواز)
اور آہیں سُنائی دیتی ہیں۔ (ریل گاڑی کا ایک ڈبہ۔ ریل چلنے کی چھک
چھک پس منظر میں سُنائی دیتی ہے)

وہ سانگ :- گاڑی رُک رُک کر چلتی ہے۔

ایک مسافر :- نیا سٹیشن جو آتا ہے۔

وہ سانگ :- یہ میں بھی دیکھ رہا ہوں بھائی۔ اب تک کتنے ہی سٹیشن آ گئے نہ
کوئی مسافر نہ کسی کو چڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر گاڑی روکنے کا مطلب

ایک مسافر :- تلاشی جو لی جا رہی ہے۔

وہ سانگ :- کس بات کی۔

مسافر :- تم سوئے تھے کیا —— ؟ تم نے دیکھا نہیں۔ پولیس بھوکے گدھوں
کی طرح ڈبوں کے اندر جھانک جھانک کر ایک ایک مسافر کو تاکتی رہتی
ہے۔

وہ سانگ :- کس کو ڈھونڈ رہے ہیں یہ لوگ —— ؟

مسافر :- کہتے ہیں۔ ایک شاعر جیل سے بھاگ گیا ہے۔

وہ سانگ :- اچھا۔ میں سمجھا تھا کوئی قاتل فرار ہو گیا ہے۔

مسافر :- (ہنستا ہے) اب زمین میں جو آدمی انسانی آزادی کے راگ الاپتا ہے
وہ رہزن سمجھا جاتا ہے۔

وہ سانگ :- اچھا

مسافر :- اور کیا۔ بڑا بے وقوف ہے یہ بھی

وہ سانگ :- یہ کون —— ؟

مسافر :- وہی شاعر جیل سے بھاگ گیا۔ بھاگ کر جائے گا کہاں —— کیا

ہم سب جیل خانے میں نہیں۔ اِس بڑے جیل خانے سے کوئی
بھاگنا بھی چاہے تو کہاں بھاگ سکتا ہے۔

وہ سانگ:۔ تم بڑی بے باکی سے باتیں کرتے ہو

مسافر:۔ کیونکہ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں انہیں دعوت دوں گا کہ وہ
آئیں اور میری بوٹی بوٹی نوچ لیں۔ اِس زندگی پر تو موت بھی
شرمسار ہے۔

وہ سانگ:۔ تم بڑے سُلجھے ہوئے آدمی لگتے ہو۔ تم نے کبھی کسی شاعر کا کلام سنا ہے

مسافر:۔ سُنا تو ہے مگر اب نہیں سُنتا اب شاعر شاعر نہیں رہے کاربنٹر بن گئے ہیں۔

وہ سانگ:۔ کیا مطلب

مسافر:۔ اب ان کی شاعری میں دِل کو چھونے والی بات نہیں ہوتی۔ اب تم
ہی بتاؤ۔ کسی پارٹی لیڈر کے زکام پر بھی بھلا کوئی شعر لکھتا ہے۔

وہ سانگ:۔ (ہنستا ہے) لکھواتے ہونگے بڑے بڑے لیڈروں کے زکام پر شعر۔

مسافر:۔ اور یہ ؟ یہاں تو ہر چیز فارمولے کے تحت لکھی اور سوچی جاتی
ہے۔ اپنی اُپج کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جس طرح سے بڑھئی نقشے کے
مطابق مکان بناتا ہے۔ اسی طرح سارے شاعر اور ادیب حساب
جوڑ جوڑ کر شعر تراشتے ہیں اور کہانیاں بُنتے ہیں۔ بے رس اور بے جان

وہ سانگ:۔ تمہیں جو شعر پسند ہو وہ سناؤ

مسافر:۔ نہیں سنا سکتا

وہ سانگ:۔ تم کس سے ڈرتے ہو

مسافر:۔ یہی سمجھ لو۔ میں تم سے بھی ڈرتا ہوں۔ یہاں ہر آدمی دوسرے سے
خائف رہتا ہے۔ ایک بار میں نے شہر میں راہ گیر سے گرجا گھر کا پتہ
پوچھ لیا۔

وہ سانگ:۔ تو پھر ؟

مسافر:- وہ مجھے پولیس چوکی لے گیا۔ جہاں سے دن کے بعد مجھے آدھ موا کرکے
چھوڑ دیا گیا۔
لوہ سانگ:- اپنے خدا سے زیادہ کرنے جا رہے تھے کیا۔
مسافر:- نہیں تو۔ وہ ایتوار کا دن تھا۔ میں گاؤں سے نیا نیا شہر آیا تھا۔ سوچا
گرجا گھر میں لوگ آئیں گے۔ شاید کوئی سر چھپانے کے لئے جگہ دے سکے
لوہ سانگ:- تمہارے گاؤں میں گرجا گھر اب بھی موجود ہے۔
مسافر:- پہلے تھا، اب نہیں ہے۔ اب اس میں پارٹی کا دفتر ہے۔
لوہ سانگ:- تم شہر کیا لینے گئے تھے...... روزگار کے لئے
مسافر:- ہاں
لوہ سانگ:- ملا —— ؟
مسافر:- نہیں پہلے کہنے لگے شہر چلو...... صنعتیں بڑھانی ہیں۔ جب کھیت ویران
ہوئے لوگ دانے دانے کو ترسنے لگے تو اب لوگ گاؤں واپس بھیجے جا رہے
ہیں۔
لوہ سانگ:- تم بھی گاؤں جا رہے ہو —— واپس ؟
مسافر:- ہاں
لوہ سانگ:- وہاں کھیتی کرو گے — کیا کرو گے
مسافر:- کام ملا تو کام کروں گا۔ نہیں تو فاقے ...... کام دینا نہ دینا پارٹی کی
مرضی پر منحصر ہے
لوہ سانگ:- تمہاری بیوی ہے ؟
مسافر:- تھی اب نہیں ہے
لوہ سانگ:- کیا مر گئی ؟
مسافر:- اپنے گاؤں کا ایک کامریڈ اُسے اپنی زوجیت میں لے گیا۔ پہلے شادیاں
گرجا گھر میں ہوتی تھیں۔ بودھ وہار میں ہوتی تھیں۔ اب پارٹی دفتر میں۔

ہوتی ہیں۔ اور یہ پارٹی کی مرضی ہے کہ وہ کس سے کس کی شادی کراتی ہے۔ بعض حالتوں میں شادی کی اجازت نہیں بھی دیتی یا پُرانی شادیوں کو توڑ دیتی ہے۔

لوسانگ :- جیسے تمہاری ـــــ لگتا ہے تمہاری بیوی خوبصورت تھی۔

مسافر :- یہی تو افسوس ہے۔

لوسانگ :- گاؤں والوں نے تمہاری کوئی مدد نہ کی۔

مسافر :- وہ کیا کرتے۔ سبوں کو اپنی اپنی فکر کھائے جارہی تھی۔ کسی کی بیوی چھن گئی۔ کسی کے بچے۔ پارٹی کامریڈ کہتے ہیں تمہارے بچے بھی تمہارے نہیں۔ حکومت کی ملکیت ہیں۔ حکومت انہیں جس طرح چاہے گی استعمال کرے گی۔ اب تم ہی بتاؤ یہ بیگار نہیں تو اور کیا ہے۔ (گاڑی تیزی سے سیٹی بجاتی ہے ـــــ لوسانگ ڈبے کے دروازے پر آتا ہے)

مُسافر :- تم اسی سٹیشن پر اُتر رہے ہو ـــــ ؟

لوسانگ :- ہاں

مسافر :- گھر آگیا کیا ـــ ؟

لوسانگ :- نہیں .... میرا گھر اس قصبے میں نہیں۔ یہاں کبھی میرے سسرال والے تھے۔ خود مجھے سال ہا سال سے اپنی بیوی کی کوئی خبر نہیں ـــــ دیکھتا ہوں شاید اس کے میکے میں کوئی ہو۔ اور اُس سے خبر مل جائے۔

مسافر :- تو تم جا رہے ہو۔

لوسانگ :- ہاں

مسافر :- سنو .... تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟

لوسانگ :- ہاں اُس وقت چھ سال کا تھا۔ جب ہم بچھڑ گئے تھے۔ اب کہاں ہے۔ یہ معلوم نہیں۔

مسافر :۔ اچھا جاؤ۔ مقدس مریم تمہاری محافظ ہے
لوہ سانگ :۔ آمین ——— میرے دوست الوداع
(گاڑی رکتی ہے اور کتے بھونکتے ہیں۔ کواڑ چرچرانے لگے ہیں اور اسی کے ساتھ نیا منظر شروع ہوتا ہے)
عورت :۔ کون ہے ...... (کوئی آواز نہیں آتی ——— اپنے آپ سے) جھونپڑے کے سایہ سے تو ابھی ابھی ایک سایہ سا گذر گیا۔ آخر یہ کون تھا۔ یہ کیواڑ کس نے کھول دئے۔ یہاں آنگن میں کوئی نہیں ———
(آواز دیتی ہے) بھاشان یہ تم ہو میرے بچے
لوہ سانگ :۔ یہ میں ہوں (دبی سی سرگوشی میں) میں
عورت :۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) تم کون ——— بولو ——— کون ہو تم
لوہ سانگ :۔ ——— میری آواز پر بھی تمہیں کوئی دھوکہ نہیں ہوا؟
عورت :۔ (بے اختیار حیرت) تم ——— لوہ سانگ ——— میرے مالک تم
لوہ سانگ :۔ ہاں میری جان ——— میں ہوں
[عور]ت :۔ نہیں ——— میری آنکھوں کو اب بھی یقین نہیں آتا
لوہ سانگ :۔ میری بے نوا اس صورت دیکھ کر اب بھی لوگ ٹھٹھک جاتے ہیں
عورت :۔ تم سچ مچ میرے سامنے ہو۔ میرے پاس ہو۔ تم ہی تو ہو۔ وہی آنکھیں جو میری آنکھوں میں ڈوب کر دل میں اتر جاتی تھیں۔ وہی مسکراتے ہونٹ لیکن ——— تم ——— تم اتنے دبلے تو نہیں تھے۔ میرے لوہ سانگ .... میری زندگی ...... میرے مالک ......
(روتی ہے اور سسکیاں بھرتی ہے)
لوہ سانگ :۔ پگلی ——— تم روتی ہو؟
عورت :۔ ہاں آج مجھے کوئی نہ روکے۔ مجھے رونے دو۔ میری آنکھوں میں دس سال سے آنسوؤں کا یہ بند لگا ہوا ہے۔ آج اس میں دراڑ

پڑ گئی ہے۔ اب یہ بہنے سے رُکے گا نہیں میرے سرتاج

نوہ سانگ :- حوصلہ سے کام لو پیاری وانگ

عورت :- بہت کام لیا حوصلے سے۔ اب اور کتنا برداشت کروں۔ کتنے سال کے بعد آج پہلی بار تمہاری صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ ہر آہٹ پر میرے کان لگے رہتے تھے۔ گاؤں میں رہنے والے ہر آدمی کو دیکھ کر دل ہی دل میں دعائیں مانگتی تھی کہ کاش یہ تم ہوتے

نوہ سانگ :- اب تو میں آ گیا ہوں۔ تم آج جی بھر کر مجھے دیکھ سکتی ہو۔ اور میں تمہیں ؟

عورت :- اب تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گے تو نہیں۔

نوہ سانگ :- آج کی رات میں بس تمہارے پاس بیٹھا رہوں گا۔ اپنی آنکھ بھی نہ لگنے دوں گا۔ تم سے بہت سی باتیں کروں گا۔ کتنی ہی باتیں دل کی گہرائیوں میں اس طرح چھپا رکھی ہیں جیسے کسی تاریک کنوئیں کی گہرائیاں پانی کو دوسرے کی نظروں سے چھپا رکھتی ہیں۔

عورت :- لیکن میں اب تمہیں جانے نہ دوں گی۔

نوہ سانگ :- کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جیل سے آزاد ہو گیا ہوں۔ نہیں پیاری میں بھاگ آیا ہوں

عورت :- او — اوہ میرے خدا — تم جیل سے فرار ہو گئے۔ تب کیا ہو گا۔

نوہ سانگ :- تم اتنی خوف زدہ ہو رہی ہو۔ میں جانتا ہوں کیا ہو گا۔ مجھے پھر پکڑ کر لے جائیں گے۔ شاید پھر زندہ نہ رہنے دیں۔ اب میں کسی بھی آفت کو جھیل سکتا ہوں۔ تمہیں ایکبار جی بھر کر دیکھنے کی چاہ دل میں نشتر کی طرح کچوکے دے رہی تھی۔ سو آج تمہیں دیکھ لیا۔

عورت:۔ تمہیں رستے میں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا؟
وہ سانگ:۔ کوئی دیکھ بھی لے تو۔ آج میری صورت پہچاننی مشکل ہوگی۔ کیا میں وہی وہ سانگ ہوں۔ کیا تم مجھے دیکھ کر پہلی نظر میں دھوکہ نہ کھاگئیں۔ تم بھی تو آنکھیں مل مل کر مجھے دیکھنے لگیں۔ (ہنستا ہے) پیاری وانگ ...... جو صورت تم سے پہچانی نہ گئی۔ وہ بھلا کسی اور سے پہچانی جائے گی۔

عورت:۔ آہستہ بولو میری جان مجھے ڈر لگ رہا ہے۔
وہ سانگ:۔ کس بات کا ڈر
عورت:۔ کسی کو خبر ہوئی تو میری شامت آجائے گی۔ (دروازہ کھلنے کی آواز) تمہارا بیٹا بھاشاں آگیا ہے شاید
وہ سانگ:۔ میرا بیٹا۔ میں خود اُس کے استقبال کے لئے جاؤں گا۔ میرا بچہ ..... میں اُسے دیکھوں گا۔
عورت:۔ نہیں نہیں تم اُس کے سامنے مت جاؤ۔ تم یہیں بیٹھو
وہ سانگ:۔ تم باپ کو اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے روک رہی ہو۔ وانگ!
عورت:۔ اب یہاں یہی دستور ہے میرے مالک ...... تم نہیں سمجھ سکتے میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ (آواز آتی ہے)

بھاشاں:۔ ماں۔ ماں
عورت:۔ ہاں میرے بچے۔ ابھی آئی
بھاشاں:۔ ماں تم لنگر پر کھانا کھانے نہیں جاؤ گی
عورت:۔ نہیں میرے لخت جگر ...... میرا سر دکھ رہا ہے
بھاشاں:۔ تو تم نے لنگر کو اطلاع کیوں نہیں دی۔ وہاں غیر حاضری لگ جائیگی تمہاری۔
عورت:۔ موقع نہیں ملا۔ آج ہمارے ہاں ایک مہمان آیا ہے

بھاشاں:- مہمان آیا ہے۔ کہاں ہے — کون ہے —؟
عورت:- یہ ہمارے خاندان کا بڑا غمگسار ہے - ایک لمبی مدّت کے بعد آج
میں نے اُسے دیکھا - دیکھ بیٹا اس کی ہر بات کا جواب بڑے
ادب سے دینا۔
بھاشاں:- ماں میں اتنا گستاخ تو نہیں ہوں۔ البتہ مجھے اعتقاد پسند لوگوں سے
بڑی چڑ ہے۔ یہ بڑے تو ہی ہوتے ہیں۔
عورت:- یہی تو تمہاری اور ہماری دُنیا کا فرق ہے۔
بھاشاں:- تم تو بحث کرنے لگیں مہمان کی بھی تو کچھ خاطر کرنی ہے —— میں
ابھی کمیون پر جاؤں گا۔ اور اُن سے کہوں گا کہ میری ماں آج کھانا
کھانے نہیں آئے گی - اس کا کھانا ہمارے مہمان کے لئے رکھ دو
عورت:- کیا اپنے مہمان سے نہیں ملوگے
بھاشاں:- ملوں گا کیوں نہیں - کمیون کو اطلاع بھی تو دینی ہے۔
عورت:- اتنی جلدی کیوں - کل بھی اطلاع دی جا سکتی ہے۔
بھاشاں:- نہیں ماں ..... تم مجھے فرائض کی تکمیل سے روک رہی ہو۔ میں
پہلے کمیون جاؤں گا - مہمان کے آنے کی اطلاع دوں گا۔ اور پھر
اپنے مہمان سے ملوں گا۔
لوہ سانگ:- بھاشاں
بھاشاں:- کون ہیں آپ؟
عورت:- یہی تو ہیں
بھاشاں:- اچھا تو آپ ہمارے مہمان ہیں۔ زہے نصیب
لوہ سانگ:- آپ کہیں جا رہے ہیں؟
بھاشاں:- ہاں — اطلاع دینے
لوہ سانگ:- اگر آپ کے ہاں کوئی مہمان آئے تو کمیون کو اطلاع پہنچانا آپ کا فرض

ہے۔

بھاشاں :۔ بے شک

وہ سانگ :۔ لیکن اگر آپ کے گھر میں آپ کا باپ آجائے تو ؟

بھاشاں :۔ جی میں نہیں سمجھا

عورت :۔ بیٹے اِن کا مطلب ہے کہ جو آدمی باپ کی طرح ......

وہ سانگ :۔ تم پہیلیاں بوجھ رہی ہو وانگ ـــــ میں اس سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ تم نے کیا اُسے نہیں بتایا کہ آج تمہارا باپ تمہارے گھر میں مہمان ہے۔ ایک رات کا مہمان

بھاشاں :۔ میرا باپ ـــــ آپ میرے باپ ہیں

وہ سانگ :۔ ہاں میرے بچے ـــــ

بھاشاں :۔ ماں تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا ـــ ؟

عورت :۔ میں مجبور تھی میرے بچے۔

بھاشاں :۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ ظلم کیا ہے ـــ تم نے تو ماں بتایا تھا کہ اب میرا باپ اِس دُنیا میں نہیں۔

عورت :۔ میں نے تم سے نہیں اپنے آپ سے ظلم کیا ہے۔ تمہارے رہنماؤں اور تمہاری پارٹی کے ڈر سے ایک گمنام سپاہی کی بیوہ بن کر اِس گاؤں میں چلی آئی ـــــ اس لئے کہ تم سے بھی بے انصافی نہ ہو۔ جو میرے خاوند سے ہوئی ـــــ اگر میں یہ بتاتی کہ میں اُس عظیم شاعر وہ سانگ کی بیوی ہوں جسے محض اِنسانی آزادی، دردمندی اور امن کے گیت گانے کی پاداش میں سنگینوں کے اندر بند کر دیا گیا ہے تو تمہیں میرے بچے نہ جانے کتنی ابتر زندگی بسر کرنا پڑتی

(سیٹیوں کی آواز ـــ موٹر سائیکل دوڑتے ہیں۔ لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے)

بھاشاں :۔ تو کیا میں اب بہتر زندگی بسر کر رہا ہوں
لوہ سانگ :۔ میرے بچے تم غم زدہ نہ ہو۔ تمہیں اب کمپوں پر اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پولیس نے مکان کو گھیرے میں لے لیا ہے
عورت :۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا ــــ میں تمہیں ان جلادوں کے ہاتھ نہ پڑنے دوں گی۔
لوہ سانگ :۔ پیاری ۔ تم ناحق ملال کرتی ہو۔
عورت :۔ میں اب تمہارے بغیر جی نہ سکوں گی۔
لوہ سانگ :۔ حوصلہ رکھو میری جان ۔ میں ہمیشہ تمہارے پاس ہوں۔ جب تمہیں میری یاد آئے تو میری بے ربط ادھوری کہانیاں پڑھ لینا جب تمہیں میرے ساتھ بولنے کی چاہت ہو تو میرے اُن گیتوں کو گنگنا جن میں انسانی جد و جہد ہے ــــ جو میری زندگی میں ہے۔ اچھا الوداع ــــ
عورت :۔ بھاشاں ــــ میرے بچے
بھاشاں :۔ ماں
عورت :۔ اپنے باپ کے گلے لگ جاؤ میرے لال
لوہ سانگ :۔ میرے قریب آؤ میرے بچے (دونوں بغل گیر ہوتے ہیں اور روتے ہیں) تم اپنی ماں کو معاف کر دینا۔ کہو میں نے معاف کر دیا۔ کہو بھاشاں
بھاشاں :۔ ابّا ــــ میرے ابّا حضور
لوہ سانگ :۔ وانگ تم اس طرح اُداس میرا مُنہ کیا تک رہی ہو۔ مُسکراؤ...... اور مجھے مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہو۔
عورت :۔ خُدا حافظ میرے مالک ــــ میری زندگی ...... خُدا حافظ
(سپاہیوں کے پیدل مارچ کی آواز آتی ہے ۔ الا ئے رائٹ ......
(پردہ گرتا ہے)

داغِ جگر سوختہ

غزلیں

۱ میر غلام رسول نازکیؔ
۲ شہ زور کاشمیری
۳ شوریدہ کاشمیری
۴ کمال احمد صدیقی
۵ غ۔ م۔ طاؤس
۶ تنہا انصاری
۷ ڈاکٹر حامدی کاشمیری
۸ عبدالحق برقؔ
۹ مہندر ریز
۱۰ سیف الدین سیفیؔ
۱۱ جسٹس مرتضیٰ افضل قزلباشؔ
۱۲ امرچند ولیؔ
۱۳ صادق علی امیر
۱۴ نشاط انصاری
۱۵ حکیم منظور
۱۶ شہزادی کلثوم
۱۷ تق[illegible] محمد
۱۸ شجاع سلطان
۱۹ حبیب کامران
۲۰ تسنیم کاشمیری
۲۱ اشرف ساحلؔ
۲۲ ایرج کاشمیری

میر غلام رسول نازکی



وہ خلوص ہے مرے ناز میں، مری بندگی کے گداز میں
کہ میں نورِ دیدۂ حور ہوں تو ابھی ہے صیغۂ راز میں
یہ ظہورِ نورِ سحر نہیں یہ فروغ شمس و قمر نہیں
شبِ غم اُچھل کے سمٹ گئی خم و پیچ زلفِ دراز میں
مرے ذکر و فکر کو کر عطا وہ اَبد کہ تا بہ اَبد رہے
مرا ذکر شام و عراق میں، مرا فکر روم و حجاز میں
وہ شہیدِ ناز و فا ہوں میں وہ نیاز مندِ جفا ہوں میں
شب و روز جس کے بسر ہوئے تب و تاب ناز و نیاز میں

نہ سرور میرے رکوع میں، نہ حضور میرے سجود میں
نہ نظام میرے قیام میں نہ گداز میری نماز میں

شہ زور کاشمیری



چمن شگفتہ میرا داغدار کیوں ہو
میری حسرتوں پہ آخر اثر بہار کیوں ہو

نہ قرار و قول کوئی نہ یہ اُن کی رہگزر ہے
میں ہوں منتظر الٰہی مجھے اِنتظار کیوں ہو

ٹھہر اے سکون کوشی وہ اگر یہ پوچھ بیٹھیں
کہ تو بے قرار کیوں ہے مجھے پھر قرار کیوں ہو

تجھے اور مرا تصوّر بھری بزم دل میں لائے
ترے جبر کل میں اتنا مجھے اختیار کیوں ہو

مرا گوہر سخن جو ترے کان تک نہ پہنچا
مرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

گلِ لالہ کو یہ ساون کی جھڑی نکھارتی ہے
ترا دل نگار ورنہ اشکبار کیوں ہو

ہے چمن ہی دل کا ایسا کہ جسے بہار اُجاڑے
تجھے خود سے بدگمانی غم لالہ کار کیوں ہو

یہ خزاں بجا مگر کل تھی جو وجہ رنگ گلشن
وہی کل دلِ چمن میں سبب غبار کیوں ہو

شب وعدہ میں تو دم ہے ابھی آ مری تمنا
ہے ضیا دیئے میں اب بھی بھلا سوگوار کیوں ہو

رگ جاں سمجھ نہ شہ زور یہ تو ہے گریباں
وہ اگر ابھی سلامت ہے یہ تار تار کیوں ہو

شوریدہ کاشمیری



خاکِ پاکِ وطن ہے مردم خیز — یہی شیراز ہے یہی تبریز
بلبلِ باغ ہے ترنم ریز — جلوۂ گل ہے ولولہ انگیز
ہے نسیمِ بہار لے آمیز — اس چمن کی خزاں بھی ہے گل ریز
دلِ ناداں کہاں کہاں پرہیز — لاکھ فرعون ہوں لاکھ ہوں پرویز
کس نے کھوئے ہیں پیچ زلفوں کے — کب ہوا اس قدر تھی عنبر بیز
مے نشاں ہے وہ نرگسِ مخمور — چشمِ عاشق ہے جس طرح خونریز
خلوتی ہو تو دل ہے اک محفل — جلوتی ہو تو سخت کم آمیز
بارہا زخمِ دل کریدے ہیں — بارہا ہو گئے ہیں ناخن تیز
دلِ دیوانہ کا علاج بھی ہو — ہے وہ زنجیرِ زلف دل آویز
صورتوں نے بدل دئے ہیں رنگ — وقت بھی اک طرح کا ہے رنگریز
حادثاتِ حیات اے غافل — دل کو کرتے ہیں مہمیز

ہو جو شوریدہ حق کا سودائی
وہی خطرات کو کرے انگیز

کمال احمد صدیقی



سُورج آخر سُورج ہے گرہن میں رہے بھی تو کب تک
جو تم نے دبانا چاہا تھا وہ نقش نُمایاں ہو کے رہا
تنہائی میں ہی معراج خودی، تنہائی ایک بھنور بھی ہے
جو اپنا مرکز آپ بنا، وہ خود سے پریشاں ہو کے رہا
جو غنچہ شاخ سے ٹوٹتا ہے بے رنگ و بو ہو جاتا ہے
دُنیا سے گریزاں ہونے والا، خود سے گریزاں ہو کے رہا
کھیل ہی کے رہی سرمایہ پرستی، راون راج کا آخر کار
ہر سازشِ باطل فاش ہوئی، ہر مکر نُمایاں ہو کے رہا
ہر رنگِ چمن، ہر رنگ جہاں، انوارِ سحر سے کھلتا ہے
جب صبح ہوئی تو محنت کش کا خون نمایاں ہو کے رہا
وہ دیش کی جنتا جاگ اُٹھی، زنداں کی فصیلیں ٹوٹ گئیں
ہنگامہ سحر جو ہونا تھا، اے گردشِ دوراں ہو کے رہا
ہیں ایک ہی صف میں محنت کش تنظیم بھی ہے ترتیب بھی ہے
کل تھا جو بیاباں تھا سا بھی وہ آج گلستاں ہو کے رہا

غ۔م۔طاؤس



وہ فکر کیا ہے میرے معزز سخنورو
جو محورِ شباب سے آگے نہ بڑھ سکے

پُر درد ہو تو ہو مگر زہراب ہے وہ شعر
جو اک خمارِ خواب سے آگے نہ بڑھ سکے

بس نالۂ فراق ہے یا نغمۂ وصال
ہم بے خبر سراب سے آگے نہ بڑھ سکے

دِل خون، جگر چاک، کبھی ہائے کبھی وائے
افسردہ پیچ و تاب سے آگے نہ بڑھ سکے

جس شعر کا سبب حُسن ہے یا نوح یا طن
وہ کاش احتساب سے آگے نہ بڑھ سکے

تارے جو توڑ توڑ کے لائے ہیں آپ نے
بے سوز آب و تاب سے آگے نہ بڑھ سکے

مجبوریٔ حیات مسلّم مگر نہیں
ایسی کہ مئے ناب سے آگے نہ بڑھ سکے

یاروں نے جا کے ڈال دی تاروں پہ بھی کمند
ہم برج کے حساب سے آگے نہ بڑھ سکے

تحسینِ ناشناس سے جن کو گلہ ہے وہ
اندیشۂ عتاب سے آگے نہ بڑھ سکے

میری تلخ نوائیوں کو معاف کیجئے
ہم آج تک آداب سے آگے نہ بڑھ سکے

تنہا انصاری



خبر اوراقِ گُل پر آج یہ شبنم نے لکھ ڈالی
"چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمایش ہے"
گلستاں در گلستاں کوئے جاناں بنتی جاتی ہے
وہاں سرو و گلاب و یاسمن کی آزمائش ہے
بکھیرے بُلبُلوں نے نالہ ہائے شوق ہیں ہر سو
چمن میں جلوۂ گل پیرہن کی آزمایش ہے
نہ لے آ قصۂ مجنون و لیلیٰ بزم میں میری
یہاں تو عاشقِ تیغ و کفن کی آزمایش ہے
کہا قطرے نے خاموشی سے کل کنول کے کانوں میں
تلاطم کو ترے نیروئے تن کی آزمائش ہے
حُسینیت ہے میری فطرتِ بے باک میں شامل
تجھے ناحق مرے کرب و محن کی آزمائش ہے

لگا دے آگ گلدستوں کو اے مستِ گل و لالہ
زمانے کو تو دستِ تیغ زن کی آزمایش ہے
چمن میں آج تک کیا ہم پہ بیتی یاد ہے مجھ کو
چلو اک بار پھر چرخِ کہن کی آزمایش ہے
کھرا کھوٹا بتا دے گی حقیقت کی کسوٹی اب
نئے مسلک پہ شیخ و برہمن کی آزمایش ہے
تو شاعر تو نہیں تنہا مگر احباب کو پھر بھی
ترے فکر و نظر، طرزِ سخن کی آزمایش ہے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری



زیست کے آداب اوروں کو سکھاتے ہی رہے
زخم کھاتے ہی رہے اور مسکراتے ہی رہے

زندگانی کی حقیقت ایسے دیوانوں سے پوچھ
جو سمجھ کر بھی فریب زیست کھاتے ہی رہے

آندھیاں چلتی رہیں بجھتے رہے دل کے چراغ
حسرتوں کے داغ لیکن جھلملاتے ہی رہے

اِن کا حسن آرزو تھا یا بہاروں کا طلسم
پھول کھلتے ہی رہے وہ یاد آتے ہی رہے

چھیڑ لیتے کیوں کبھی ہم بادہ و ساغر کی بات
وہ ہمیں مخمور نظروں سے پلاتے ہی رہے

تیری زلفوں کا تصوّر اور شب ہائے فراق
ظلمتیں اپنے مقدر کی بڑھاتے ہی رہے

تو نہ آئی کتنے تارے جھلملا کر بجھ گئے
ہم مگر اشکوں کی شمعوں کو جلاتے ہی رہے

ہم تو مدّت سے تجھے بھولے تھے حامدیؔ
ہاں ترے اشعار کچھ کچھ یاد آتے ہی رہے

عبدالحق برق



منزلِ دل میں قدم رکھا ہے دیوانوں نے
محفلِ سوز میں پر مارے ہیں پروانوں نے

جام و ساغر کو یہیں آیا ہے طوف و سجدہ
رقص سیکھا ہے اسی بزم میں پیمانوں نے

دیدہ و دل کو کرے خیرہ جہاں حسنِ جمیل
لطف پایا ہے وہیں سوختہ سامانوں نے

رنگِ میخانہ کچھ ایسا ہے کہ کہتے نہ بنتے
رنگ بدلا ہے حقیقت نے کہ افسانوں نے

محوِ حیرت ہے خدائی تو پریشاں ابلیس
شعبدے ایسے دکھائے ہیں کچھ انسانوں نے

آپ محفل سے جو اٹھنے کے ارادے سے اٹھے
ایک انگڑائی سی لی ہے مرے ارمانوں نے

خیر ہو برق شرر میں چمنِ الفت کی
آنکھ وہ بدلی ہے بدلی میں نگہبانوں نے

مہندر رینہ



صرف خوابوں کی پرستش کے گنہگار ہوئے
ایک موہوم سی خواہش کے گنہگار ہوئے
لوگ کہتے ہیں وہ مائل بہ کرم ہیں ہم پر
کیسی نادیدہ نوازش کے گنہگار ہوئے
یوں تو سو بار غمِ دل کو سنانے بیٹھے
اور نہ اک بار گذارش کے گنہگار ہوئے
ذکر چھیڑا جو وفاؤں کا تو رو بیٹھے ہم سے
خواہ مخواہ اپنی ستائش کے گنہگار ہوئے
آپ کے حُسن پر تنقید کی جُرأت نہ ہوئی
گو نئی طرزِ نگارش کے گنہگار ہوئے
داغِ دل، اشکِ ستم، نذر کئے تو جانا
کس قدر طرفہ نمائش کے گنہگار ہوئے

سیف الدین سیفی سوپوری



مری نگاہ پہ کھلنے لگا فریبِ جمال / کہ تیرے حسن میں پہلی سی دلکشی نہ رہی
بتا چکی ہے مجھے وہ نگاہِ حیلہ طراز / کہ اب اُن سے اب کوئی امّید خیر کی نہ رہی
کب آ گئی نہ خزاں اپنی تلخیاں لے کر / بہارِ چمن چمن میں کب عارضی نہ رہی
مٹے گی دل سے نہ بیتے ہوئے دنوں کی یاد / اگرچہ زندگی اپنی وہ زندگی نہ رہی
گزر چکے ہیں مرے دل پہ ایسے بھی لمحے / الم الم نہ رہا جب خوشی خوشی نہ رہی
تمہارے جاتے ہی بدلا بہار کا عالم / کسی بھی پھول میں گویا شگفتگی نہ رہی
کبھی جو مایۂ صد ناز تھی جوانی میں / وہ خود سری ہوئی رخصت وہ سرکشی نہ رہی

نثار جس پہ تھی رنگینئ بہار کبھی
دیارِ حسن میں سیفی وہ سادگی نہ رہی

جسٹس سید مرتضیٰ فضل علی دلؔ



تیرا غم سلامت مجھے کیا کمی ہے
یہی میری دولت یہی زندگی ہے

جلایا ہوا میں چراغِ وفا ہے
محبّت میں شامل عجب سادگی ہے

مجھے روزِ طوفاں کی پرواہ نہیں ہے
تلاطم میں گزری ہی میری زندگی ہے

رہِ زندگی کی مسافت کا عالم
اندھیرا کہیں ہے کہیں روشنی ہے

جہاں سے شروع ہم سفر کر چکے تھے
پتہ یہ چلا کہ منزل وہی ہے

میری زندگی ہے اُمیّدوں کی دنیا
الم بھی ملے تو پیامِ خوشی ہے

ستاروں نے گوندھا ہے دِل کو سراپا
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر روشنی ہے

۹

امر چند ولی



موئے مژگاں کے قلم کی شوخیٔ تحریر کا
خونِ دل سے رنگ نکھرا پیکرِ تصویر کا

شامِ غم کی صبح کرتے جانِ شیریں ہم نے دی
موت کا پیغام تھا انجام جوئے شیر کا

جذبۂ شوقِ شہادت کی کشش کو دیکھئے
دم سے میرے موجزن ہے آج دم شمشیر کا

وحشتِ دیوانگی میں بھی جنونِ نارسا
بج رہا تھا جل ترنگ زنجیر سے زنجیر کا

شامِ فرقت میں جلائے اشکِ پیہم کے چراغ
قطرہ قطرہ خونِ ناحق تھا مری تقدیر کا

آ گئی روشن ضمیری داد دیتی اے ولی
کاش غالب دیکھتے عالم مری تقریر کا

نشاط انصاری



موجِ صبا چمن میں گُل افشاں ہے آج کل
پھر بلبُل سرمست غزل خواں ہے آج کل
کشمیر میں بفیضِ نسیم گل آفرین
گلخن مثالِ گلشن خنداں ہے آج کل
ہر رندِ گردے کدہ محوِ طواف ہے
زاھد حریم زھد میں رقصاں ہے آجکل
خاکِ وطن پہ چھایا ہے ہر سمت انبساط
خاکِ وطن نصیبِ بہاراں ہے آج کل
پھر جنتِ نگاہ کا سامان عام ہے
پھر لطف بے کراں فراواں ہے آج کل
پھر ہر قدم پہ حُسن گراتا ہے بجلیاں
حشر آفرین یہ شہر نگاراں ہے آج کل
شکوہ کریں کیا گردشِ تقدیر کا نشاط
گردش میں خود تو گردشِ دوراں ہے آج کل

صادق علی اسیرؔ



آیا ہے دمِ نزع مگر چین بہ جبیں ہے
اس کی تو ہر اک بات زمانے سے حسیں ہے

کچھ بھی نہ اُسے میری وفاؤں کا یقیں ہے
اب جان کا خواہاں وہ غارت گرِ دیں ہے

اُلجھے ہیں کئی بار میرے دست و گریباں
یہ عشق کا سودا بھی کچھ آساں نہیں ہے

تم یاد جو آتے ہو تو بھر آتی ہیں آنکھیں
کچھ اس کے سوا مجھ کو بھی معلوم نہیں ہے

بھرپور جوانی پہ وہ انگڑائیاں اُن کی
اے ضبط تیری خیر کہ محشر بھی قریں ہے

ہنس ہنس کے وہ آئینے کو سمجھاتے ہیں کیا کیا
اب اپنی جوانی پہ اُنہیں خود ہی یقیں ہے

آباد تصور میں گلستاں ہیں ہزاروں
وابستہ ہر اک یاد جو تم سے ہے حسیں ہے

کچھ دیر ذرا بیٹھ کے دم لیتے کہیں ہم
صحرائے جنوں میں کوئی سایہ بھی نہیں ہے

دل توڑنے والوں سے کوئی اتنا تو پوچھے
تم جوڑ سکو ایسا کوئی دل بھی کہیں ہے

حکیم منظور



ظاہراً نقطہ ہوں اک سمٹا ہوا
غور سے دیکھو تو ہوں بکھرا ہوا

اِس قدر مایوس ہوں چہروں سے میں
اپنا چہرہ بھی لگے بدلا ہوا

تیرگی کا خوف اب تک ہے محیط
یہ اُجالا جیسے ہو مانگا ہوا

ذہن میں کچھ دِن ہے کوئی خیال
ایک کانٹے کی طرح چبھتا ہوا

جانے کیوں یہ سوچتا رہتا ہوں میں
کل کو یہ سورج اگر اندھا ہوا

اپنے چہرے پر بھروسہ ہو جسے
آئینہ سے کیوں پھرے چھپتا ہوا

ہم تو اے منظورؔ تنہا ہو گئے
خون پانی سے بھی کچھ پتلا ہوا

شہزادی کلثوم



کعبہ بنائیے نہ کلیسا بنائیے
دِل کو تصوّرات کی دنیا بنائیے
تصویرِ حُسن کھینچئے مجنوں کے بھیس میں
آئینۂ خیال کو لیلا بنائیے

حرص و ہوائے دارِ فنا سے غرض نہیں
دُنیا سے کھوئیے مجھے اپنا بنائیے
دیوانگیٔ عشق کو رُسوا نہ کیجئے
لیلیٰ کو قیس، قیس کو لیلا بنائیے

ہے فطرتِ نظر کا تقاضا یہ بار بار
موسیٰ بنائیے مجھے موسیٰ بنائیے
کیوں نظمِ حسن و عشق کو تبدیل کر دیا
کس نے کہا تھا قیس کو لیلے بنائیے

پہلے نظر کو طاقتِ نظارہ دیجئے
پھر اختیار ہے مجھے موسیٰ بنائیے
صدق و صفا کے سانچے میں پھر دل کو ڈھال کر
مہر و وفا کا گوہرِ یکتا بنائیے

جل کر بھی سوزِ عشق میں اُف تک نہ کیجئے
دِل کو سکون و ضبط کا پتلا بنائیے
کلثوم زندگی کا گزرنا محال ہے
دُنیا کو اِک حسین تماشا بنائیے

قاضی غلام محمدؔ[۵]



جوانوں میں محبّت نیم جاں معلوم ہوتی ہے
بڑے بوڑھوں میں لیکن نوجواں معلوم ہوتی ہے

ٹھکانے کا کوئی فقرہ یہ فرماتی نہیں ورنہ
تری ماں تو بڑی معقول ماں معلوم ہوتی ہے

دیا ہے حق نے میری ساس کو کیا پھول سا چہرہ
بروزِ عید بھی یہ نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

مرے محبوب تیرے حُسن کا یہ اک کرشمہ ہے
ہماری مُفلسی اب جاوداں معلوم ہوتی ہے

الف نے بے کے غم میں زہر کھا کر خودکشی کر لی
بڑی پوچ اور پرانی داستاں معلوم ہوتی ہے

کنارہ میری کشتی کا مقدر میں نہیں شاید
نحوست ناخدا کی بے کراں معلوم ہوتی ہے

جنابِ شیخ! اِس سے روز ہی بے نقط سُنتے ہیں
یہ شیخانی کوئی اہلِ زباں معلوم ہوتی ہے

قُطب مینار سے گر کر مرا تو ڈاکٹر بولے
کہ اِس کی موت ہم کو ناگہاں معلوم ہوتی ہے
بلا سی یہ گھسیٹی جا رہی ہے راہِ اُلفت میں
تری زلفوں کی لمبائی کہاں معلوم ہوتی ہے
بچارے ریل کے انجن نے بھی کانوں میں اُنگلی دی
غمِ جاناں کے ماروں کی فغاں معلوم ہوتی ہے
بیاں کیا ہو نزاکت وہ تو وہ نازک بدن نکلا
گراں جس کی سماعت کو اذاں معلوم ہوتی ہے
بہ ایں طوفانِ گل اور دائمی شورِ سگاں قاضی
مجھے اُس کی گلی باغِ جناں معلوم ہوتی ہے

شجاعؔ سُلطان



فضا کے تن میں نئی زندگی سی لہرائی
یہ رات چہرے سے کس نے نقاب سرکائی
ہر اک لمحۂ دوراں اب ایک محشر ہے
کہاں وہ خلوتِ یکسر وہ لُطف تنہائی
نہ جانے کیوں شب اندوہِ غم رہی غافل
تری نِگاہ میں لیتی تھی صبح انگڑائی
مرا اُداس تبسّم ذرا کُرید کے دیکھ
جمی ہوئی ہے کسی سطحِ سنگ پر کائی
کلی سے صُبح نے یُوں ماجرائے شب پوچھا
کہ لب تو کھُل نہ سکے اور آنکھ بھر آئی
روِش روِش پہ ہیں مسلے ہوئے گلوں کے ہجوم
کہاں ہیں رُوحِ گلستاں وہ تیرے شیدائی
کہیں شجاعؔ کوئی یادِ رفتگاں تو نہیں
اُداس دشت میں بجتی ہے جو یہ شہنائی

حبیب کامران



گِلہ تو میں نہیں کرتا مگر تجھ کو خبر بھی ہے
جہاں ناوک فگن تو ہے وہیں میرا جگر بھی ہے

ترا لطف و کرم ساقی بہت ہی عام ہے لیکن
نگہ اِک اس طرف کو بھی کہ اِک پیاسا اِدھر بھی ہے

سبھی آہیں تو بھرتے ہیں اثر کِس نے دیکھا ہے
پر اتنا سنتے آئے ہیں کہ آہوں میں اثر بھی ہے

چلو مانا کہ بربادی لکھی تھی اپنی قسمت میں
مگر اِلزام تو تیری نگاہِ ناز پر بھی ہے

رہیں سرخوش ابھی ظلمت کے متوالے مگر سن لیں
کہ تاریکی کے بعد آتی تو اِک رنگین سحر بھی ہے

تسنیم کاشمیری



سایہ تیرے جمال کا شمس و قمر میں ہے
ہاں تیری نغمگی نسیمِ سحر میں ہے
اے کاش اس کا ایک ہی جرعہ نصیب ہو
توبہ شکن شراب جو اُن کی نظر میں ہے
ٹھہرے گا جا کے موت کی منزل پہ جانے کب
سانسوں کا کارواں جو پیہم سفر میں ہے
ساقی حدیثِ جام سے منکر نہیں ہوں میں
لذت ہی اور کچھ مگر خونِ جگر میں ہے
موتی خیال کے ہیں نگارِ سخن کی مانگ
تسنیم تیرا نام بھی اہلِ ہنر میں ہے

اشرف ساحلؔ



ہر صُبح لے کے آئی نئی خواہشوں کے دام
ہر شام لے کے آئی نئے حادثوں کے جام
مجھ سے سفر حیات کا تنہا نہ کٹ سکا
چلتا ہے میرے ساتھ سوالوں کا ازدہام
اک بار بن گئی تھی کبھی فکر کا جمال
اب کر رہی ہے میرے خیالوں کا قتل عام
ٹکرا کے مجھ سے گردشِ دوراں بھی رُک گئی
اب تھک گئی ہے مجھ سے یہ لے لے کے انتقام
شاید یہ میری پیاس کا ہے آخری مقام
ہاتھوں میں جام اور زباں پر خدا کا نام

ایرجؔ کاشمیری



اِس عالم نفسا نفسی میں ہم چاک گریباں کیا ڈھونڈیں
آداب سخن معلوم نہیں، انداز سخنداں کیا ڈھونڈیں

احساس کے سانچے میں برسوں پستے آئے جذبے اپنے
دُنیا میں سکون کی بزم کوئی اے گردشِ دوراں کیا ڈھونڈیں

ہر پھُول ہے انگارہ جیسا ہر شاخِ چمن سوکھی سوکھی!
آغاز گلستاں ٹھیک نہیں انجام گلستاں کیا ڈھونڈیں

ہر زخمِ جگر دہکا دہکا ہر داغِ وفا اُجلا اُجلا!
اِس برق و شرر کے طوفاں میں اک شمعِ فروزاں کیا ڈھونڈیں

ہر گوشہ سُونا سُونا ہے ہر سمت برستی ہے وحشت
ویرانی گھر کی کم تو نہیں ہم دشت و بیاباں کیا ڈھونڈیں

اک دورِ تلاطم ہے برپا جذبات کے گوشے گوشے میں
کیوں ہنگاموں کی فکر کریں اور شورشِ زنداں کیا ڈھونڈیں

ایرجؔ سب شیخ و برہمن کے جھگڑے ہیں، دکھاوے کی باتیں
ہندو بن کر بھی کچھ نہ ملا اب ہو کے مسلماں کیا ڈھونڈیں

فروغِ فکر

۱. فیض احمد فیضؔ کے ساتھ ایک شام — شمیم احمد شمیمؔ
۲. مثنوی سندر بدن اور سالک کاشمیری — پروفیسر عبد القادر سروری
۳. صفۂ شعرائے سرینگر — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
۴. ۱۹۶۰ء کے بعد کشمیری شاعری — محمد یوسف ٹینگ
۵. محمد رضا مشتاق — پروفیسر شمس الدین احمد
۶. کلام مہجور کا تاریخی ارتقا — عبد الاحد آزاد
۷. حبہ خاتون — محمد امین کامل
۸. علامیت اور قصّے — ڈاکٹر شکیل الرحمان
۹. کشمیری لوک ادب کا خاکہ — پروفیسر محی الدین حاجنی
۱۰. مہجور اور آزاد — پروفیسر رحمان راہی
۱۱. صحائف اور ادب العالیہ کے کاشمیری تراجم — عزیز کاشمیری
۱۲. خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے — خواجہ ثناء اللہ بٹ
۱۳. سرشار اور اودھ پنچ — پروفیسر اکبر حیدری

شمیم احمد شمیم

فیض کے ساتھ ایک شام

لاہور میں میری رہبری اور رفاقت کا فرض میرے چچازاد بھائی اعجاز کے سپرد ہوا تھا۔ وہ انگریزی اور پولیٹیکل سائنس میں ایم، اے کرنے کے بعد پی۔سی۔ایس (پاکستان سول سروس) کا امتحان دے چکا تھا اور اب نتیجے کے انتظار میں اردو ادب سے شناسائی کر رہا تھا۔ اعجاز کی عمر مشکل سے ۲۵-۲۶ برس کی ہوگی لیکن اس کی ذہانت، گہرے مطالعے اور زبان پر غیر معمولی قدرت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ پاکستان پہنچنے تک مجھے اس کے وجود کا بھی علم نہیں تھا۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اعجاز سے میری بہت پرانی دوستی ہو۔ اس احساس کی تہہ میں خون کے رشتے سے زیادہ وہ فکری اور ذہنی ہم آہنگی تھی جو اجنبیوں کو دوست اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے کچھ ہی دیر بعد جب اعجاز نے مجھ سے پوچھا کہ لاہور میں آپ کس سے ملنا چاہیں گے؟ تو میں نے جواب دیا اقبال اور فیض سے۔

اقبال سے تو میں آپ کو کل ملا دوں گا۔ لیکن فیض سے ملنا مشکل ہے وہ لاہور نہیں کراچی میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھار لاہور آجاتے ہیں۔ کراچی کا ویزا میرے پاس نہیں تھا اور ویسے بھی ان دنوں لاہور سے کراچی جانا آسان نہ تھا۔ اس لئے میں اپنی بدقسمتی پر ماتم کر کے بیٹھ گیا۔ فیض احمد فیض سے ملنے کی خواہش

نے تو اُسی دِن جنم لیا تھا جب فیض کا یہ شعر سُنا تھا ؂

ادائے حُسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے اور میں پہلی بار فیض کے کلام سے متعارف ہوا تھا۔ اس کے بعد نقشِ فریادی۔ دستِ صبا۔ زنداں نامہ۔ میزان دست تہ سنگ کے ذریعے اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن ان شاہ کاروں سے جھانکتی ہوئی دل آویز شخصیت کو قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے ہی ساتھ جوان ہوتی گئی اِس دوران میں وہ کئی بار ہندوستان آئے لیکن میری خواہش پُوری نہ ہو سکی اب میں پاکستان میں تھا — ان کے بہت قریب — لیکن ملاقات کے امکانات خاصے تاریک تھے۔ راول پنڈی میں اپنے پندرہ روزہ قیام کے بعد جب میں لاہور سے لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا تو کراچی میں کچھ کشمیری دوستوں کا پیغام موصول ہوا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے راول پنڈی آنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر میں کراچی جانے کے لئے تیار ہو جاؤں تو وہ ہوائی جہاز سے آنے جانے کا خرچہ بھی برداشت کریں گے۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں — میں نے فوراً ہاں کر دی اور کچھ دِن بعد جب میں کراچی کے ہوائی اڈے پر اُترا تو مجھے فراق کے اِس شعر پر معنویت اور حسنِ معنی کا احساس ہوا۔

فضا تبسّمِ صُبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پر آنکھ بھر آئی

۱۸ر فروری کی وہ شام کتنی خوب صورت شام تھی۔ میں اپنے میزبان میر قیوم۔ میر منان اور امان اللہ کے ساتھ فیض احمد فیض کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ فیض نے ٹیلیفون پر اپنی کوٹھی کا پتہ بتا دیا تھا اور قیوم صاحب کی گاڑی کچھ اس رفتار سے منزلِ مقصود کی طرف جا رہی تھی کہ جیسے اُسے بھی میری بے قراری کا علم ہو چکا ہو۔ کچھ دیر بعد ہم ایک عالی شان کوٹھی کے سامنے رُک

گئے۔ معلوم ہوا کہ فیض کوٹھی کی اُوپر والی منزل میں رہتے ہیں۔ ہم یہ دریافت کرنا ہی چاہتے تھے کہ اُوپر کون راستہ جاتا ہے کہ میری نظر کچھ مجسموں اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں پر پڑ گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ فیض تک پہنچنے کا یہی راستہ ہو سکتا ہے۔ میرا فیصلہ صحیح تھا۔

زینوں کے دونوں طرف مٹی سے تراشے ہوئے چھوٹے چھوٹے آرٹ کے نمونے سجے ہوئے تھے اور دیواروں پر مشہور مصوّروں کے شہپارے۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور سامنے فیض تھے۔ لمحہ بھر کے لئے میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں؟ اتنے میں مہر منان صاحب نے میرا تعارف کرا دیا۔ اب ہم سب لوگ اندر داخل ہو گئے تھے۔ اور میرے سامنے ایک خوب صورت، باوقار اور بلند قدر خاتون مونڈھے پر بیٹھیں مطالعہ میں کچھ اس طرح غرق تھیں کہ جیسے انہیں ہماری آمد کا علم ہی نہ ہو۔ یہ ایلس فیض تھیں۔ فیض نے اُن سے ہمارا تعارف کر دیا اور اُنہوں نے نہایت شستہ اور شائستہ اُردو میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر ہم سب لوگ بیٹھ گئے۔ فیض کے سامنے (SOVIET LITARTURE) کا تازہ شمارہ پڑا ہوا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے وہ اس میں سے کوئی مضمون پڑھ رہے تھے۔ سلسلہ کلام شروع کرنے سے پہلے میں نے کمرے کا ایک سرسری جائزہ لیا یہ غالباً فیض کا سٹڈی روم تھا۔ پورے کمرے میں کتابوں کی الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں لینن کی تصویر تھی اور دیواروں پر ایبس ٹریکٹ آرٹ کے کچھ شاہکار آویزاں تھے۔ ایک Rack پر منیزہ اور سلیمہ (فیض کی دو صاحب زادیاں) کی اپنے شوہروں کے ساتھ تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں نہ ریڈیو تھا نہ ٹیلی ویژن۔ کبھی کبھار ٹیلی فون کی گھنٹی اُس پُرسکون ماحول میں خلل انداز ہوتی تھی۔

آپ کب سے ہیں پاکستان میں؟

فیض نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی شگفتگی چھائی رہتی ہے۔ اس شگفتگی کا احساس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے
"میں اب ایک مہینے سے یہاں ہوں۔ آپ سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ شیخ صاحب اور صادق صاحب دونوں نے ہی آپ کو یاد کیا ہے"
فیض کو جیسے کئی بھولی بسری کہانیاں یاد آگئیں۔
"جی ہاں! صادق صاحب سے تو کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن شیخ صاحب سے ۱۹۴۶ء کے بعد ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ خیال تھا کہ ۱۹۶۴ء میں ان کی پاکستان میں آمد پر اُن سے ملاقات ہوگی لیکن پنڈت نہرو کی موت نے سارا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔" اور پھر اُن کے ہونٹوں پر ایک حیات آفریں مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ کہنے لگے:
"آپ کو معلوم ہے کہ شیخ صاحب نے میرے نکاح پڑھے ہیں اور نکاح نامے پر صادق صاحب۔ بخشی صاحب اور ڈاکٹر نور حسین جو کے ایم۔ خورشید کے سسر تھے کے دستخط گواہوں کی حیثیت سے ثبت ہیں۔ اس لحاظ سے میرا نکاح نامہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔
"آپ آخری بار کشمیر کب گئے تھے" میں نے دریافت کیا۔
"میں آخری بار ۱۹۴۷ء میں گیا تھا۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک تقسیم ہوا تو میں وہیں تھا۔ میں ۲۴۔ اگست کو سرینگر سے چلا تھا اس کے بعد ہی کشمیر کا جھگڑا شروع ہوگیا جو سلجھنے کی بجائے روز بروز اُلجھتا ہی جا رہا ہے۔"
آپ کے خیال میں اس اُلجھن کا حل کیا ہو سکتا ہے؟ میرے اندر کے اخبار نویس نے مجھے پوچھنے پر مجبور کر دیا۔
بھئی مسئلہ اتنا اُلجھا ہوا ہے کہ اس کا کوئی آسان حل تجویز کرنا مشکل ہے بدقسمتی سے دونوں طرف سے EXTREME POSITION لی گئی ہے۔ اور نتیجہ یہ کہ بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو سلجھانے کے امکانات روز بروز کم ہوتے

جا رہے ہیں۔ دونوں ملکوں کی حکومتیں انتہا پسندی میں ایک دوسرے سے بازی لینا چاہتی ہیں۔ ان حالات میں کوئی حل تجویز کرنا بے معنی بھی ہے اور مشکل بھی۔ ایک بات ہو سکتی تھی کہ دونوں حکومتیں اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہنے کے بعد بھی باہمی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھ سکتی تھیں جس طرح چینی اور امریکی شدید اختلاف اور تضاد کے باوجود وارسا (پولینڈ) میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں اسی طرح ہندوستان اور پاکستان بھی کسی غیر جانبدار ملک میں مفاہمت اور مصالحت کی کوششیں جاری رکھ سکتے تھے۔

لیکن موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کا جھگڑا حل کرو۔ ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر کا کوئی جھگڑا ہے ہی نہیں۔ پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کے علاوہ کوئی جھگڑا ہے ہی نہیں۔ تو در اصل ہندوستان کا یہ کہنا کہ جھگڑا ہے ہی نہیں اصل جھگڑا ہے۔ جھگڑے کے وجود سے انکار کرنا غلط ہے۔ اور میں نے ہندوستان میں اپنے اکثر دوستوں سے یہ کہا کہ یہ پوزیشن غلط ہے۔ ابھی ہندوستان میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران بعض دوستوں نے مجھے کہا کہ ہم کشمیریوں کو مطمئن کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ کشمیریوں کو مطمئن کر دو۔ لیکن خود کشمیری تو کہیں کہ وہ مطمئن ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ پاکستان پھر بھی مطمئن نہ ہوگا۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان پھر بھی مطمئن نہ ہوگا لیکن پھر پاکستان کے مؤقف میں پہلی جیسی قوت باقی نہیں رہے گی

فیض بڑے سکون سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے لہجے کی معصومیت اور آواز کی موسیقیت نے ان کی شخصیت کو اور زیادہ دِل آویز بنا دیا تھا۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے تھے۔ لیکن کچھ اِس انداز سے کہہ رہے تھے کہ جیسے کسی گہرے راز سے پردہ ہٹا رہے ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ فیض کے دِل میں کشمیر کا درد ہے۔ ان کی زبان سے میں نے کشمیر کے متعلق ایک ایسی بات سُنی جو کہ کسی دوسرے پاکستانی کی زبان سے سُننے کو نہیں ملی۔

کشمیر کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں ممالک کشمیر کو الگ چھوڑ دیں، اور کشمیر ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے دونوں ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ بالآخر یہی ہوگا لیکن بڑی خرابی کے بعد۔ آپ لوگوں کو دونوں طرف سے مشترکہ طور پر یہی مطالبہ کرنا چاہئے۔

موجودہ انقلاب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس وقت تو اتھل پتھل ہے۔ اس کے بعد شاید کوئی حل نکل آئے۔ دراصل موجودہ انقلاب اُس گھٹن اور زباں بندی کے خلاف ردِ عمل ہے جو پچھلے دس گیارہ برس میں روا رکھی گئی ہے۔ صدر ایوب کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے احتجاج اور اختلاف رائے کے سبھی دروازے بند کر دئے اور اب انہیں بیک وقت دس سال کی گالیاں کھانا پڑ رہی ہیں۔

اِدھر آپ نے کچھ لکھا ہے؟ میں نے موضوع بدل دیا۔ میں شعر و ادب کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔

لکھتے رہتے ہیں۔ پھر جیسے معاً انہیں کوئی بات یاد آ گئی ——
"ٹھہرئے میں دیکھوں کہ کوئی میری کتاب یہاں ہے یا نہیں۔ شیخ صاحب کے لئے لیتے جائیے ——" یہ کہہ کر وہ ساتھ والے کمرے میں گئے اور میں سوچنے لگا کہ نقشِ فریادی۔ دستِ صبا اور زنداں نامہ کے خالق کو اِس بات کا احساس ہے یا نہیں کہ وہ کتنا بڑا شاعر، کتنا عظیم فن کار اور کتنا محبوب انسان ہے؟ اس کی نرمی اس کے انکسار اور اس کی سادگی کو دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اُسے اپنی عظمت کا احساس ہی نہ ہو۔

فیضؔ کتاب کی تلاش میں اندر گئے تو میں نے بیگم فیض سے پوچھا کہ بچیاں کہاں ہیں؟ دونوں لڑکیوں کی شادی ہو گئی ہے۔ ایلس فیض نے کہا اور اس کے بعد اُنہوں نے ریک پر سجی ہوئی دونوں تصویریں اُٹھا کر مجھے دکھانا شروع کر دیں۔ یہ سلیمہ اور ان کے شوہر کی تصویر ہے سلیمہ مُصَوِّر ہے۔ بڑی اچھی

تصویر بناتی ہے۔ یہ جو دیوار پر تصویر آویزاں ہے یہ سلیمہ ہی کی ہے ـــــ بیگم فیض نے بڑے فخر کے ساتھ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

منیرہ ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر ہے۔ یہ دونوں چھوٹی بچیاں تھیں جب شیخ صاحب راولپنڈی میں ہمارے گھر آیا کرتے تھے ـــــ بیگم فیض نے شیخ صاحب کا ذکر کچھ اس عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے دل میں آج بھی شیخ صاحب کے لئے بے حد عزت اور احترام ہے۔ اتنے میں فیض آئے اور اُنہوں نے کہا کہ بڑی تلاش کے بعد بھی کوئی کتاب نہیں ملی ہے اب میں شیخ صاحب کے نام اپنی ایک غزل دوں گا۔ اس کے بعد وہ قلم لے کر غزل لکھنے لگے۔ وہ غزل لکھ رہے تھے۔ بیگم فیض چائے بنا رہی تھیں اور میں فیض کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر کاروان عمر رفتہ کے نشان تو نظر آتے ہیں لیکن ان کے چہرے کی دائمی شگفتگی کو دیکھنے والے ان کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ وہ جوانی میں بڑے وجیہہ صورت اور آن بان والے رہے ہوں گے۔ کیونکہ ان کی شخصیت کی رعنائی اور دل کشی کچھ آج بھی کم نہیں ہے۔ وہ غزل لکھ کر فارغ ہو گئے تو بیگم صاحبہ نے چائے لا کر رکھ دی اور اس کے بعد پوچھا کہ آپ کتاب کس لئے ڈھونڈھ رہے تھے۔ فیض نے کہا شیخ صاحب کو کتاب بھیجنا تھی مل نہیں رہی ہے

"شیخ صاحب کے لئے بھیجنا ہے کو ٹھرے میں خود تلاش کروں گی۔" بیگم فیض نے کچھ اس انداز سے کہا کہ جیسے وہ شیخ صاحب کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ نقش فریادی اور انتخاب فیض کا ایک پرانا نسخہ لے آئیں۔ میں نے کچھ تصویروں کا بھی مطالبہ کیا۔ ایک تصویر پر اُنہوں نے میرے لئے اپنے دستخط کر دئے ــ انتخاب فیض پر شیخ صاحب کا نام اور نقش فریادی پر میرا نام لکھ کر دونوں کتابیں دے دیں۔

فیض نے کہا کہ کشمیر میں شیخ صاحب اور صادق صاحب کے علاوہ بھی میرے بہت سے دوست ہیں۔ ابھی ماسکو میں بھی ایک دوست سے ملاقات ہوئی (ان کا اشارہ درگا پرشاد در کی طرف تھا)

"اُن سے تو بہری لڑائی ہے"۔ میں نے یوں ہی کہا۔

"وہ تو آپ سیاست دانوں میں ہوتی رہتی ہے"— فیض نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا—

"علی محمد طارق سے بھی تو آپ کی دوستی ہے؟ میں نے یاد دلایا۔

جی ہاں، وہ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے میری دو کتابیں چرائی ہیں۔ اُن کو بھی میرا سلام کہہ دینا"۔ فیض نے کہا۔

آپ کشمیر کیوں نہیں آتے، آپ وہاں ایک بار آجائیں تو کیا ہی اچھا رہتا۔

کشمیر آنے کی بڑی خواہش ہے، اپنی زندگی کے کچھ بہترین دن وہاں گزارے ہیں لیکن موجودہ حالات میں آنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے، ہاں بیگم صاحبہ آسکتی ہیں۔

تو آپ کیوں نہیں آجاتیں۔ میں نے بیگم فیض سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"میں تو آسکتی ہوں کیونکہ میرا برٹش پاسپورٹ ہے۔ جب فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تو میرا پاکستانی پاسپورٹ منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میرا برٹش پاسپورٹ ہے" ایلس فیض نے کہا۔

معلوم نہیں کہ شاعروں، ادیبوں اور کھلاڑیوں کی آمد و رفت بھی کیوں بند کر دی گئی ہے حالانکہ یہ لوگ دونوں مُلکوں کے درمیان خیر سگالی مفاہمت اور دوستی کا جذبہ بڑھانے میں بہت اہم کام کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعر و ادب اور کھیل کود پر بھی سیاست چھا گئی ہے۔ بیرڑے

ہی افسوس کی بات ہے۔ اور اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے فیضؔ نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مجھے اس کے بعد دعوت پر جانا تھا۔ ایک گھنٹے کا وقفہ کتنی جلدی بیت گیا۔ میں نے اجازت چاہی فیض مجھے رخصت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے شیخ صاحب کو میری طرف سے گلے لگا کر سلام دیجئے گا۔ میں نے کہا میں پہلے آپ سے گلے مل لوں

اس کے بعد میں نے اپنے محبوب شاعر نہیں اپنے محبوب کو گلے لگالیا اور اُس سے رخصت ہو گیا!

پروفیسر عبدالقادر سروری

مثنوی سندر بدن اور سالک کشمیری

پنڈت سالگ رام کول سالک اُردو کے اچھے شاعر تھے۔ وہ غزل اور مثنوی دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ غزلوں کے ایک دیوان اور دو مثنویوں کے علاوہ اُنہوں نے بہت سا متفرق کلام چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ وہ نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ نثر میں اُن کی تصانیف زیادہ تر نذہبیات اور قانون سے متعلق ہیں لیکن ان کے دو کارنامے ادبی اہمیت رکھتے ہیں ایک ان کے انشائیوں کا مجموعہ جو "مناظر کشمیر" کے نام سے موسوم ہے دوسری ایک نثری داستان۔ داستانِ جگت رُوپ رجب علی بیگ اردو کے فسانۂ عجائب کی طرز کا ایک طویل افسانہ ہے اُردو لغات، محاورات، ضرب الامثال اور قواعد اور کشمیری لغات اور قواعد پر بھی اُنہوں نے کتابیں لکھی تھیں۔ کشمیری قواعد پر ان کی تین کتابیں انگریزی زبان میں چھپی تھیں، لیکن اب وہ کمیاب ہیں۔ سالک کی ایک مثنوی "سندر بدن" اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

سالک کا خاندان کشمیری الاصل تھا لیکن اس کے پردادا کشمیر میں سکھوں کی حکومت کے زمانے میں پنجاب چلے گئے تھے۔ سری نگر کے محلہ ریٹنگ میں ان کی آبائی جائداد تھی۔ جو کول میراث کے نام سے موسوم تھی۔ پردادا پنڈت گوا ش کول اور دادا پنڈت مہادیو کول اپنے زمانے کے معتبر لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ پرنانا

کے بارے میں پنڈت ساگ رام سالک نے لکھا ہے کہ افغانوں کے عہد کے وہ مشہور و معروف رئیس تھے۔ والد پنڈت رام چند کول شیو فلسفہ کے اچھے عالم مانے جاتے تھے۔

پنڈت سالگ رام کے بھائی ہرگوپال خستہ بھی اُردو کے مصنّف اور شاعر تھے۔ اپنے زمانے کے مصلحین اور قومی لیڈروں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ کشمیر میں سماجی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لیے ان دونوں بھائیوں نے اہم خدمات انجام دی تھیں۔ یہ دونوں بھائی حالؔی اور شبلؔی کے معاصرین میں سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت ہرگوپال نے اپنا تخلص خستہؔ غالبؔ کے چہیتے شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے تخلص کے اتباع میں اختیار کیا تھا۔

پنڈت سالک کا خاندان کچھ عرصہ پٹیالہ میں بھی مقیم رہا تھا۔ پٹیالہ سے یہ خاندان مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت (سلسلہ تا ۱۸۵۸ء) میں کشمیر منتقل ہوا۔ پنڈت ہرگوپال خستہؔ ریاست میں اخبار نویسی کی خدمت پر مامور رہے اور پنڈت سالک کو ابتدا میں شال سازی کی ایک فرنگی فرم میں ملازمت ملی تھی لیکن بعد میں وہ ریذیڈنسی میں ملازم ہو گئے تھے۔ لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں "غرقیدگی کشمیر" کا جو مُقدّمہ چلا تھا اس میں یہ دونوں بھائی، ان کے ایک اور تیسرے بھائی پنڈت جانکی ناتھ کول بھی لپیٹ میں آئے اور کچھ عرصہ قلعہ باہو میں قید رہے۔ اِسی زمانے میں پنڈت سالگ رام سالک نے اپنی مثنوی سندر بدن تصنیف کی تھی۔

مثنوی سندر بدن سالکؔ کی طبع زاد تصنیف ہے جس پر کشمیر کی کلاسیکی دیومالا کا کافی اثر ہے۔ "ناگ" جو کشمیرکے قدیم رومان "ہیمال و ناگرائے" یا ناگ راج کا مرکزی کردار ہے۔

اس مثنوی کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ اس کی تصنیف کے بارے میں "بیان نظم کتاب" کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ باہو کی قید کے

زمانے میں ان کا دل بہت اُداس رہتا تھا۔ ایک روز اُنہوں نے کسی کو میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کے اشعار پُردرد آواز میں پڑھتے سُنا۔ اس سے ان کے دل میں ایک مثنوی لکھنے کا خیال پیدا ہوا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوگا ہے

پسند آئی از حد مجھے بحر یہ — میرے دل کو بھی آگئی لہر یہ
کہ اس بحر میں جو ہے قلزم مثال — گہر کف میں لاکر دکھا دوں کمال

مثنوی بحیثیت مجموعی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے لیکن اس کے بہت سے واقعات "سحر البیان" سے مشابہت رکھتے ہیں۔ داستان مایہ نگر کے راجہ بھوپت کی روائتی لاولدی کے غم سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی مایوسی کے عالم میں ایک فقیر اس کی رانی کو کھلانے کے لئے انبہ دیتا ہے جس کے کھانے سے رانی کو حمل قرار پاتا ہے، اور لڑکا تولّد ہوتا ہے۔ جس کا نام سندربدن رکھا جاتا ہے۔ سندر بدن جب بڑا ہوتا ہے تو ایک راجہ کی بیٹی سے جس کا نام من موہنی تھا اس کی شادی کی جاتی ہے۔ ایک رات جب وہ کوٹھے پر سویا ہوا تھا رتنوں پری اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور اپنی خدمت گار پریوں کے ذریعے اس کے پلنگ کو اٹھوا کر پرستان منگواتی ہے۔ سندر بدن جب جاگتا ہے تو اجنبی مقام میں اپنے آپ کو پاکر بہت پریشان ہوتا ہے۔ پری اس کو دلاسا دیتی ہے۔ مگر باپ کو خبر ہونے کے ڈر سے اسے مور کی شکل میں تبدیل کر کے اپنے پاس رکھتی ہے اس کا غم غلط کرنے کے لئے اسے باغ میں دُور ایک چشمے پر سیر کے لئے جانے کی اجازت دیتی ہے۔ ایک روز وہی فقیر جس نے راجہ بھوپت کو انبہ عطا کیا تھا اس جگہ سے گذرتا ہے۔ مور کو دیکھتے ہی اپنے کشف سے پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی راجہ بھوپت کا بیٹا سندر بدن ہے۔ اس کو دلاسا دیتا ہے اور ایک ماشہ کا دانہ عطا کرتا ہے جس کو کھاتے سے سندر بدن آدمی بن جاتا ہے۔ اور اپنے وطن کو روانہ ہوتا ہے۔

سندر بدن کی فراری کے بعد رتنوں پری نہایت غضبناک ہوتی ہے اور اپنی پریوں کو ہر طرف اس کی تلاش میں روانہ کرتی ہے

وہ پھر گرفتار ہوکر پرستان پہونچتا ہے۔ اس دفعہ پری سندر بدن کو ایک چاہ عمیق میں قید کرتی ہے۔

اُدھر من موہنی اس کے فراق میں نہایت غمگین ہے۔ آخر اس کی ایک سہیلی سکھی نامی اس سے اجازت لے کر سندر بدن کی تلاش میں نکلتی ہے۔ سحرالبیان کی نجم النساء کی طرح اس نے بھی جوگن کا بھیس اختیار کیا تھا وہ گھومتی پھرتی ایک صحرا میں چاہ کے کنارے ستانے کے لئے رہتی ہے۔ اتفاق سے یہ کنواں ایک ناگ کا مسکن تھا جو ناگوں کے راجہ کا ملازم تھا راجہ ایک بھیانک خواب دیکھتا ہے۔ لیکن اس کے درباری اس کی تعبیر نہیں بتا سکتے۔ آخر کنوئیں کے ناگ نے جوگن کا پتہ اسے بتایا اور کہا کہ تیرے خواب کی تعبیر وہی بتا سکتی ہے وہ جوگن بہت خدا رسیدہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ سُن کر راجہ اپنے خدمت گار ناگوں کو اُس کو بُلانے کے لئے بھیجتا ہے۔ ناگ سجی سجائی پالکی لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں وہ پہلے تو جانے سے انکار کرتی ہے لیکن پھر اس خیال سے کہ شاید ناگ راج کی مدد سے اس کا مقصد بر آئے، جانے کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔

راجہ اس کا بڑے احترام سے خیر مقدم کرتا ہے اور اپنے خواب کی تفصیلات سُناتا ہے۔ یہ خواب ایک مشہور تمثیل ہے جس سے سالک نے اس موقعہ پر بڑا اچھا کام لیا ہے۔ راجہ کہتا ہے: "میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوں جس کی جڑیں ایک عمیق کنوئیں کے اندر پہنچی ہوئی ہیں۔ درخت کی جڑوں کو دو چوہے، ایک سیاہ ایک سفید کاٹ رہے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوف ہوا۔ نیچے دیکھتا ہوں تو ایک بڑا سانپ پھن پھیلا کر بیٹھا ہے۔ ایسے میں میری نظر اُوپر اُٹھی۔ وہاں شہد کا چھتا تھا جس سے شہد کی بوندیں ٹپک رہی تھیں ایک بوند میری زبان پر گری اس کا ذائقہ ایسا شیریں تھا کہ میں چوہوں اور مار کا خوف بھلا کر اس مزے میں

مگن ہوگیا۔ اس حالت میں درخت کی شاخ جس پر بیٹھا ہوا تھا ٹوٹ گئی اور میں نیچے گر پڑا تو مارِ سیاہ مجھے دبوچنے کے لئے دوڑ پڑا۔ اس کی ہیبت سے میری آنکھ کھل گئی۔

جوگن نے یہ خواب سُن کر راجہ کو دلاسا دیا کہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہ خواب تیری زندگی کی تمثیل ہے۔ سفید اور سیاہ چوہے رات اور دن ہیں جو تیری عمر کی بنیادوں کو کاٹ رہے ہیں۔ شاخ جس پر تو بیٹھا ہوا تھا وہ زندگی ہے۔ مارِ سیاہ ملک الموت اور شہد زندگی کے مزے ہیں۔ جن میں مگن ہوکر انسان اپنی عاقبت سے بے خبر ہوجاتا ہے۔

تعبیر سُن کر راجہ کو اطمنان ہوا۔ اُس نے جوگن سے پُوچھا اگر تیری کوئی خواہش ہے تو میں اس کی تکمیل کروں۔ جوگن پہلے تو کترائی آخر مدّعا ظاہر کردیتی ہے۔ ناگ راج کے حکم سے اس کے خدمت گار ناگ اس کنویں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور پتہ چلا کر سندر بدن کو نکال لاتے ہیں۔

سکھی سندر بدن کو لے کر مایہ نگر آتی ہے اور دونوں بچھڑے ہوئوں کو ملاتی ہے۔



ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

صُفّۂ شعرائے سرینگر

کشمیر کو جنّت نظیر کہا جاتا ہے۔ گذشتہ سات سو سال سے ایرانی اور ہندوستانی شعراء نے طرح طرح سے اس کی تعریفوں کے گیت گائے ہیں۔ خاص کر جہانگیر اور شاہ جہاں کے درباری شعراء تو اس کو واقعی جنت سمجھتے تھے۔ اور یہ بادشاہ جب کبھی کشمیر آتے تو اپنے دربار کے خاص امراء کے ساتھ شعراء کو بھی ضرور اس جنّت میں اپنے ساتھ لاتے تھے۔ اور بعضوں کو تو محض بڑی کتاب یا نظم کی تکمیل کے لئے اس فردوس ارضی میں روانہ کرتے تھے تاکہ یہاں کی آب و ہوا اور مناظر ان کی تخلیقی قوتوں کے لئے ممد و معاون ثابت ہوں۔

عرفیؔ شیرازی کا یہ شعر اس سرزمین مینو سواد کے بارے میں اب تک مشہور ہے کہ ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید!

گر مرغ کباب است ہموں بال و پر آید

لیکن اس سے بہت پہلے ہی ایک عربی رباعی پر اہل کشمیر کو فخر ہے۔ یہ رُباعی شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدّین سہروردی سے منسوب ہے کہ ؎

کان الکشمیر لساکینہا
جنّات عدن ھی للمومنین
قد کتب اللہ علی بابہا
ادخلہا کان من الامین

اصل میں یہ رباعی کشمیر ہی کے ایک صوفی حضرت بابا نصیب کے اس رسالے میں شامل ہے جو اُنہوں نے حضرت شیخ سہروردی کی خدمت میں اُن ہی کے نام منسوب کر کے روانہ کیا تھا۔

بادشاہ نامہ شاہ جہانی کے مشہور مُصنّف مرزا ابو طالب کلیم ہمدانی نے ایک شعر میں کشمیر کے چشمۂ ویرناگ کا ذکر خاص شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ یہ شاعر بیجاپور اور گولکنڈہ میں قیام کر چکا تھا اور شاہ جہاں نے اس کو بطور خاص کشمیر روانہ کیا تھا۔ وہ کہتا ہے :

انتخابے کردہ ام از گرم و سرد روزگار
اشک چشم خویش و آب چشمۂ ورناگ را

چشمۂ ویرناگ کو جھیل ڈل کا مخزن سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دریائے جہلم بھی اس سے نکلتا ہے۔ جہانگیر نے اس کو دوازدہ پہلو حوض کی شکل میں پختہ بنا دیا تھا اور اس کے اطراف میں شاہی قیام کے لئے نہریں اور وسیع باغ بھی بنوائے تھے۔ بانہال سرنگ پار کر کے جب وادیٔ کشمیر میں داخل ہوتے ہیں تو دائیں جانب کی سڑک ویرناگ تک پہنچاتی ہے۔ اس کی دیواروں پر جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد کے سنگ مرمر کے کتبے نصب ہیں۔ اس کا پانی بہت سرد اور شیریں ہے اور اسی سردی سے کلیم نے اپنے شعر میں استفادہ کیا ہے۔

ابو طالب کلیم کے حالات اور کلام پر کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کی لیکچرر فارسی ڈاکٹر شریف النساء انصاری نے ایک مبسوط کتاب مرتب کی تھی۔ جس کو

حکومتِ ہند کی امداد سے کُتب خانہ خواتین دکن کی طرف سے مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب چھپوا رہے ہیں۔ اس میں شامل کرنے کے لئے ڈاکٹر شریف النسأ کو چونکہ کلیم کی تصویر نہیں مل سکی ہے اس لئے اُنہوں نے راقم الحروف سے خواہش کی کہ کلیم کی قبر کی تصویر روانہ کروں۔

میرا خیال ہے کہ کلیم کی تصویر بھی میری نظر سے گذری ہے جو دربارِ شاہ جہاں کے کسی موقع میں تھی اور اس کی اطلاع میں نے ان کو دی تھی۔ مگر وہ تصویر ان کو اب تک نہ مل سکی۔

ڈاکٹر شریف النسأ نے لکھا تھا کہ کلیم دوسرے دو شاعروں کے ساتھ چشمہ ڈل کے کنارے دفن ہے، اور میں نے ان کی خاطر ڈل لیک کے اطراف واکناف کے قبرستانوں کی تلاش شروع کی۔ اور اس سلسلہ میں ۱۱۴۵ھ میں تالیف کی ہوئی خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری کی تاریخ کشمیر کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کا نام تاریخ اعظمی ہے۔ اور اس کو مُفتی محمد شاہ سعادت کشمیری نے ۱۳۵۵ سنہ ہجری میں خواجہ غلام محمد تاجر کتب مہاراج رنبیر گنج بازار کی فرمائش پر مُفید ضمیموں اور حاشیوں کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ اور غالباً اسی سنہ میں وہ چھپی تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ ابو طالب کلیم مقبرہ شعراء میں دفن ہیں۔ مقبرہ شعراء کے محل وقوع کی بابت اسی تاریخ میں دوسرے شاعروں کے حالات دیکھنے پڑے تو محمد قلی سلیم کے ذکر میں لکھا ہوا ملا ہے

"در صُفہ شعرائے ما تقدم مدفون گردید"

اور ملّا ظفر مشہدی کے بارے میں معلوم ہوا کہ:

چوں رحلت نمود بر صُفہ مقبرہ شعراء کہ بر سر بلندی پُل درگجن واقع است آسود۔

اس سے قبل کے صفحات میں قدسی مشہدی کے ذکر میں یہ عبارت ملی ہے

" در کشمیر رحلت نمود۔ بالائے بلندی متصل خانقاہ درگجن بہ چبوترہ کہ نزدیک پُل است در مقبرہ شعراء آسود "

یہ تو آج سے دو سو تینتیس سال قبل کی تحریر ہے۔ دریافت سے پتہ چلا کہ اب پل زرگجن کو ڈل گیٹ برج کہتے ہیں۔ قدیم تاریخی محلہ زرگجن تو اب بھی موجود ہے اور اس محلے کے سامنے جنوب کی طرف جھیل ڈل اور اس خوبصورت بولوارڈ کا آغاز ہوتا ہے جو اس کے کنارے کنارے کشمیر کے سابق مہاراج ہری سنگھ نے تعمیر کرائی تھی۔

صفۂ شعراء کی تلاش میں شعبہ اُردو کے ایک کشمیری پروفیسر اسد اللہ کامل اور ایک طالب علم غلام احمد شرقی اور ڈاکٹر شکیل الرحمان کے ہمراہ میں نے محلہ زرگجن کا معائنہ شروع کیا۔ مختلف اصحاب سے پوچھ گچھ کی، دو ڈھائی سو سال کے طویل عرصے میں کشمیر کے حالات اور جغرافیہ اتنا بدل چکا ہے اور یہاں کے موسم کی طرح یہاں کی سیاست نے ایسے ایسے پلٹے کھائے ہیں کہ موجودہ ارباب کشمیر قدیم تاریخ اور آثار کو بھول چکے ہیں کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ پتہ دیا۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس محلے میں قبریں تو ہیں مگر بعد کو محلے والوں نے ان کے پتھر اکھیڑ لئے اور اپنے مکانوں کی تعمیر میں لگا لئے ہیں۔

میرے کشمیری ساتھی ابھی گلی کوچوں اور دکانوں پر محوِ استفسار تھے۔ میں اور ڈاکٹر شکیل الرحمان تھک کر بولوارڈ کے فٹ پاتھ پر جھیل ڈل کے کنارے موٹر میں سوار ہونے پہونچے ہی تھے کہ میری نظر ایک ٹیلے پر پڑی جس پر متقی الدین کو روانہ کیا یہ لوگ بحث و مباحثہ اور استفسار چھوڑ کر واپس ہوئے تو اس کوچہ تک پہونچنے کے لئے تنگ و تاریک اور غلیظ گلیوں میں کچھ دیر بھٹکنا پڑا اور آخر کار بلندی پر چڑھتے ہوئے ہم ایک ایسے سر بلند میدان میں پہونچے جہاں چند لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ ابھی ہم نے اس سبزہ زار پر قدم ہی رکھا تھا کہ لوگوں سے پوچھا کہ وہاں کس کی قبر ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ غنی کاشمیری کی۔ ہم نے کہا کہ اس کو ہم دیکھیں گے۔ مگر وہاں تو مشہور ایرانی شاعروں کی قبریں ہوں گی۔ لیکن اس پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بمشکل تمام اُو پر چڑھ سکے اور وہاں پہنچنے معلوم ہوا کہ نیچے کی گلیوں میں لوگوں نے جو کہا تھا وہ صحیح تھا کہ قبروں کے اور غالباً ٹیلے کی سیڑھیاں

کے بھی بتھر اہلِ محلہ نے اکھیڑ لئے تھے۔ اور اب وہاں صرف چار تعویذ بالکل بے ترتیبی کے عالم میں آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک تعویذ پر درود اثنا عشری اور اس کے اطراف کچھ فارسی شعر کندہ نظر آئے۔ چونکہ یہ تعویذ زمین میں دھنس گیا ہے اس لئے اس کے حاشیے کے شعر صاف پڑھے نہیں جاتے۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید کلیم ہمدانی کی وفات کا وہ قطعہ جو باربیخ اعظمی میں درج ہو - یہ کتاب موٹر میں ہی رہ گئی تھی۔ اس کو منگا کر اشعار کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پتہ چلا کہ یہ کوئی دوسرے ہی شعر ہیں ممکن ہے کہ حاجی محمد جان قدسی کی قبر کا تعویذ ہو جو شاہ جہاں کے عہد میں ملک الشعرا تھے اور یہ کتبہ اسی کے حکم پر کندہ کرایا گیا ہو۔ مگر اس سے نہ تاریخ وفات کا پتہ چلتا ہے اور نہ صاحب قبر کا نام معلوم ہوتا ہے۔ دوسری قبروں کے تعویذ بالکل سادہ ہیں اور ان میں بھی یک رنگی نہیں۔ کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا اور تقریباً ہر تعویذ قبر کی اصلی جگہ سے ہٹا دیا گیا ہے ان سے اتنا ضرور واضح ہوا کہ یہاں صرف چار اصحاب دفن ہیں۔ زیادہ قبروں کی اس ٹیلے پر گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہاں سے جنوب کی طرف چشمہ ڈل اور اس کے شکاروں اور ہاؤس بوٹوں کا منظر بہت ہی خوش نما اور دل فریب نظر آتا ہے۔

میرا قیاس ہے کہ اس ٹیلے پر سب سے پہلے ملک الشعراء قدسی کو شاہ جہاں کے حکم سے دفن کیا گیا تھا اور ان کے بعد محمد قلی سلیم اور ابو طالب کلیم دفن کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا طاہر غنی کشمیری نے کلیم کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ لکھا تھا جس میں ان تینوں شاعروں کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا طغرا نے ان کے بعد وفات پائی ہے، اور وہ ان کے سرہانے ذرا نشیب میں جو قبر ہے اُس میں دفن کئے گئے ہیں۔

محمّد یوسف ٹینگ

۱۹۶۰ء کے بعد کشمیری شاعری

نظم[1] ایک علیٰحدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے ہمارے ادب کے لئے مغرب کی ایک سوغات ہے لیکن ہماری زبانوں نے اسے کچھ ایسی اپنائیت سے گلے لگا لیا ہے کہ یہ اُن ہی کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد معلوم ہونے لگی ہے۔ مگر کسی زبان کی کسی بھی صنفِ سخن کو اس زبان کی روایات سے الگ کر کے اور کسی روایتی تصوّر کی کسوٹی پر پرکھ کر اُس کے رنگ و کیف و سرور کا صحیح لطف حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

کشمیری نظم اِس حیثیت سے اپنے سلسلہ نسب کی آن بان پر اِترا تو نہیں سکتی لیکن کشمیری زبان کی خود رو اصناف میں اس کے چہرے بُشرے سے ملتی ہوئی چیزیں اِبتداء ہی نظر آتی ہیں۔ اگر نظم میں کسی خیال یا موضوع کو احساسِ تعمیر کے ساتھ اور تاثر کی وحدت کے پیکر میں پیش کرنے کا نام ہے تو ہمیں شیخ نورالدّین نورانیؒ (وفات: ۱۴۳۸ء) مقبول شاہ (وفات: ۱۸۷۶ء) سوامی پرمانند (وفات: ۱۸۷۵ء) وہاب پرے (وفات ۱۹۱۴ء) کے یہاں اس نوع کے بہترین نمونے ملتے ہیں لیکن میں رحمان ڈار (وفات: ۱۹۰۰ء) کی مجیر العقول "شش رنگ" کو نظم کا انتہائی کامیاب نمونہ سمجھتا ہوں۔ اس میں آفاقی جذبات، متلاطم اور متموّج احساسات کی اس غضب کے پیرائے میں تصویر کشی کی گئی ہے کہ اسے کشمیری کی کسی جدید سے جدید ترین نظم کے مقابلے میں اعتماد ہی کے ساتھ نہیں بلکہ افتخار کے ساتھ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

[1] یہ جائزہ کشمیری نظم کا ہے۔

اس میں جذبات کا وہ کشف انگیز گداز، خیالات کا وہ پُرکار لیکن پُرخلوص ارتفاع اور انداز بیان کی وہ تازہ کاری اور نزاکت و بلاغت ملتی ہے کہ ۱۸۶۰ء کے بعد کی چند بہترین نظمیں اس کی تقلید میں لکھی گئی ہیں اور اس کا اعجاز ہمارے کشمیری شاعروں کی تخلیق کی بعض پُراسرار سم سم[1] کوٹھریوں کے بند دروازے کھولنے میں ممد و معاون رہا ہے۔ جدید کشمیری شاعری کے بشیرِ و ہجور (وفات: ۱۹۵۲ء) نے اگرچہ ہیت کے معاملے میں کشمیری گیت (وژُن) اور غزل کے کلاسیکی پیمانوں سے انحراف نہیں کیا لیکن اس نے اپنی بعض تخلیقات کا عنوان "نظم" تحریر کرکے ایک معنی خیز رجحان کی شعوری طور پر آبیاری کی۔ اِن نظموں کے روایتی اسلوب کے باوصف ان میں نظم کی بُنیادی شرط یعنی موضوع کا تعمیری ارتکاز موجود ہے۔ ایسی نظموں میں "کاشُر زنانہ" اور "گریسی کور" جیسی سنجیدہ لیکن غنائی تخلیقات اور "آزادی" اور "گلابس گُن" جیسی طنزیہ منظومات شامل ہیں۔ اِس روایت کو عبد الاحد آزاد (وفات: ۱۹۴۸ء) نے اگر معیار کے لحاظ سے نہیں مگر مقدار کے لحاظ سے ضرور آگے بڑھایا۔ اگرچہ اس کی نظموں میں تعمیر کا شعور زیادہ نمایاں ہے لیکن وہ مُروّجہ اسلوب برتنے کے باوجود اُکھڑے اُکھڑے لہجے کا شاعر ہے۔ اسی لئے نظم کے اِرتقا میں اُس کی فنی کامرانی سے زیادہ اُس کی تاریخی حیثیت زیادہ اہم ہے۔

۱۹۴۷ء کشمیر کی سیاسی تاریخ کے لئے نہیں بلکہ اس کے تمدنی احیا کے لئے بھی ایک حدِ فاصل (WATERSHED) کا حامل سال ہے۔ ریاست پر پاکستان کے حملے اور ریاست میں عوامی راج کے قیام جیسے معرکہ انگیز اور ہنگامہ خیز واقعات نے ظاہر و باطن کو زیر و زبر کر دیا۔ صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کے ہنگامۂ نشور نے جوش و جنون کے سرچشموں کے بند کھول دئے۔ کشمیری زبان کی شاعری میں ایک ایسا انقلاب عظیم رونما ہوا جس کی نظیر اس کی طویل تاریخ کے ہزاروں سال میں نظر نہیں آتی۔ اس نشاۃ الثانیہ کے ہراول دستے میں دینا ناتھ نادمؔ، نور محمد روشنؔ، مرزا عارفؔ، رحمان راہیؔ، امین کاملؔ

---

[1] ۔ الف لیلہ کی علی بابا چالیس چور کی مشہور تلمیحاتی کوٹھری جو (کھل جا سم سم کے الفاظ سے کھل جاتی تھی۔

اور غلام نبی فراق جیسے نظم نگار شاعر تھے۔ نئے موضوعات کی تندی وُسعت اور شعلہ آشامی کے لئے روایتی پیمانوں کا ظرف تنگ ہی نہیں بلکہ ناموزوں بھی بن گیا تھا۔ اِس لئے ہئیت کے نئے سانچے ڈھالے گئے۔ زبان اور ذخیرۂ الفاظ کا ایک حیرت انگیز کرشمہ سامنے آگیا۔ کشمیری شاعری کا عام لہجہ اِنفعالیت اور نسوانیت کا تھا۔ نئے اِرتعاش نے اس کی چولیں ہلا دیں۔ مردانہ آہنگ، جنگجو یانہ جلال اور خطیبانہ رجز کے نئے سُر گونج پیدا کرنے لگے اِس دور کی شاعری کا کیفیاتی تجزیہ کرنا ۱۹۶۵ء کی شاعری کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس حیثیت سے لازمی ہے کیونکہ میرے خیال میں آج کل کی نظمیں بڑی حد تک اس شاعری کے ردِّ عمل میں لکھی جارہی ہیں۔ جس نے پچھلی دہائی (FIFTIES) میں کشمیری شاعری کے ذہن وضمیر کو ایک ایک تشنج میں مُبتلا کر کے اس کی تخلیقات کو کیفیاتی طور پر یک آہنگ، فنی طور پر بے سُر اور تاثیر کے لحاظ سے غیر مستجاب بنا کے رکھ دیا تھا۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں جذبات کی لو اُونچی تھی اور کشمیری تحریکِ آزادی کے کٹے ہوئے (ISOLATED) اور محدود پس منظر میں ایک غیر واضح اور جذباتی سوشلزم کے نعرے کا آہنگ باقی مُلک سے کچھ زیادہ بے ہنگم طور پر شور انگیز تھا۔ سیاسی میدان میں اس کی مثال کشمیر کی جسارت آمیز اور کسی حد تک اِشتعال انگیز زرعی اصلاحات ہیں اور شاعری میں اس کے بولتے ہوئے نمونے دینا ناتھ نادمؔ کی گرجتی اور کڑکتی نظمیں ہیں۔ کشمیر پر جنوب مشرق سے یلغار، سلامتی کونسل میں اس مسئلے پر بحث، عالمی طاقتوں کی اس میں معنی خیز دل چسپی اور کچھ بڑی طاقتوں کی اس انتہائی حساس محلِ وقوع رکھنے والے خطّے پر حریصانہ نظریں سارے کشمیریوں کے لئے اندیشہ ہائے دُور دراز اور تشویش آمیز اضطراب کا باعث تھی۔ لیکن جذباتی تناؤ سے بھرپور شاعر ان سے کچھ زیادہ ہی جھنجھلا جاتا اور بھڑک اُٹھتا تھا۔ اور اس کے ردِّ عمل میں حقائق کے ساتھ ساتھ کچھ توہمات وتعصّبات کا بھی دخل رہتا تھا۔ نادمؔ، راہیؔ اور

روشن کی نظموں کے موضوع اس وقت گھوم پھر کر سیاسی معاملات ہوا کرتے تھے۔ ان کی ذہنی بساط پر اشتراکی رجحان کا اثر گہرا اور اردو کی ترقی پسند تحریک کی گرفت بے حد سخت تھی بلکہ ایک باقاعدہ تنظیم "کلچرل کانگریس" کے نام سے قائم تھی جہاں فنی موشگافیوں کو سلجھانے کی بجائے سیاسی صف بندی (REGIMENTATION) کی ہدایات جاری ہوتی تھیں اور تعزیر و احتساب کے ادبی طریقوں کی ورزش ہوتی تھی۔ اس زمانے کی نظم میں مزدور اور سرمایہ دار کی نام نہاد آویزش (کیونکہ کشمیر میں ابھی تک طبقات کا یہ نقش مارکسی معیاروں کے مطابق موجود نہیں) جنگ باز کو انتباہ، ان کے سطحی قصیدے اور آنے والے مستقبل کی مبالغہ آمیز نوید، خاص موضوع تھے، فکری اور فنی حیثیت سے یہ نظمیں آج ہیجان انگیز اشتہار بازی کا نمونہ بن کر رہ گئی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس دور میں ہیئت اور فارم کے جتنے تجربے کئے گئے وہ ہر لحاظ سے تحیر انگیز ہیں۔ نظم معریٰ۔ نظم مرجز۔ آزاد نظم۔ سانیٹ۔ مسدس۔ رباعی۔ قطعے اور دوسری کلاسیکی اور غیر کلاسیکی اصناف میں منظومات کے انبار لگ گئے۔ اس سے قبل کشمیری شعر تقریباً لامحالہ طور پر سماع کی شے ہوا کرتا تھا۔ شعر پرانی تان اور فرسودہ آہنگ سے نباہ کرنے کی رغبت رکھتا تھا۔ نئے شاعر نے ساز اور ترنم کی بیساکھیاں استعمال کئے بغیر بڑے بڑے تہلکے برپا کر دئے۔ نئی نظموں کی روانی، ان کے جذبۂ دروں کی دہک، ان کے لہجے کا رجزیہ انداز، اُن کی روشن اور شاداب امیجری اور اُن کا تڑپتا ہوا ولولہ کشمیری شعر کے رسیاؤں کے لئے ایک انوکھا دِل دہلا دینے والا لیکن ساتھ ساتھ دِل فریب تجربہ تھا۔ امیجری کا ایک نیا نگارخانہ وجود میں آگیا۔ شاعری کے فرسودہ استعارات و علائم، رمز و کنایات اور بندھی ٹکی تشبیہات پس منظر میں ڈھکیل دی گئیں زندگی کی روزمرہ جزئیات سے نادر اور گرم گرم استعارے اور مرقعے اپنائے گئے۔ نئی آوازوں اور پیکر تراشی کا بڑا مرغوب کُن حیرت کدہ آباد کیا گیا۔ انگریزی ہندی اور اردو شاعری کی آوازوں کا رس منتقل کرنے کی دانستہ کوششیں

رنگ لائیں، اور اس طرح سے لفظیات (VOCUBELARY) اور مرقعوں (IMAGES) کا ایک بلیغ اور پُر از امکانات ذخیرہ اُبھر آیا۔ اس الکتاب کو اپنے نئے فنی تجربوں کا خام مال بنا کر ۱۹۶۰ء کے بعد شاعر نے ایک نئے رجحان کی طرح ڈال کر پچھلی دہائی کی ہیجان انگیزی کو ایک پختہ اور صائب ادبی میلان کی شکل میں صورت پذیر کر لیا ہے۔

اگرچہ تاریخی دھاروں کی ہی طرح ادبی رجحانات کی بھی واضح لکیر کھینچکر حد بندی نہیں کی جا سکتی لیکن ۱۹۵۵ء کو ممتاز طور پر کشمیری شاعری میں ایک نئے موڑ کا واضح نشان سمجھا جا سکتا ہے۔ شاعر کی داخلی واردات کا تالیف قلب اور اُس کے ذہنی آہنگ میں دُور رس تغیّر کے عوامل خارجی بھی ہیں اور داخلی بھی۔ داخلی یہ کہ آزادی کی مسند نشینی اور انجمن آرائی نے شاعر کا ابتدائی جوش ٹھنڈا کر دیا تھا خواب زار کے دھندلکے چھٹنے لگے تھے اور حقائق کی ایسی دنیا کے نقوش چشم نظارہ کے سامنے اُبھر رہے تھے جنکے رنگوں کی کیفیت طلسمی نہیں بلکہ مادی اور مانوس تھی۔ واقعات کی تیز دھوپ نے سپنوں کے شبنم زار کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ راستے کی ناہمواری نے نازک شاعرانہ احساس کے آبگینوں کو ٹھیس لگا دی تھی اور نظریں مرکزِ تمنّا کی اس خشک سامانی سے مایوس (DIS-ILLUSION) ہو کر بے کسی سے اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ خارجی عوامل میں ایک طرف کشمیر میں بیرونی طاقتوں کی مداخلت کے کم ہوتے امکانات نے شاعر کے اعصابی تناؤ کی طناب ڈھیلی کر دی تھی۔ کشمیری شاعر کے جذبات پر ایک اور شب خون رُوس میں سٹالین کی شخصیت کی بُت شکنی (DE-STALINIZATION) تھا۔ جس شخص کو آدرش اور پرچم بنا کر گیتوں کا شفق رنگ پری خانہ آباد کیا گیا تھا اس کے بے نقاب چہرے کی ہولناکیوں سے کشمیری شاعر ذہنی صدمے سے تِلملا کے رہ گیا۔ کچھ شاعروں نے کسی ایسی معصوم صفت عورت کی طرح اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا جو اپنے محبوب کو جلاد کے رُوپ میں دیکھ کر اپنی ذہنی دُنیا اُجڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ دینا ناتھ نادم جیسے راہ نما شاعر نے

تقریباً قلم ہی توڑ دیا۔ اُن کا تاثر اس قدر گہرا تھا کہ وہ عرصہ تک کچھ لکھ ہی نہ سکے اور کشمیر کے ادبی حلقوں میں یہ منحوس قیاس آرائی ہونے لگی کہ تخلیق کا یہ گونجتا گرجتا سمندر خدانخواستہ خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن عام طور پر اس ذہنی برق کے بعد معائنہ باطن کا دور شروع ہو گیا۔ اور شاعر کے ضمیر میں بے تاب تخلیقی سرچشموں کا رُخ دوسری سمتوں میں پھر گیا۔ اب اس کے فیضان کا منبع خود اس کا داخلی احساس شکست تھا۔ سنہ ۶۰ء کے بعد نئی شاعری کے نقوش واضح طور پر پہچانے جانے لگے اور اس کے سرے پر رحمان راہی کا ہیولیٰ نظر آنے لگا۔ راہی کی شاعری پر اگرچہ ابتداء سے ہی غنائیت کی چھاپ تھی۔ لیکن اُس کے پہلے مجموعے "نوروزِ صبا" (جسے ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔) کی بیشتر منظومات مقصدی تبلیغی اور نظریاتی زنجیروں کے بوجھ سے یک رُخی ہو گئی ہیں۔ اُن کی نرم موسیقی کے باوصف ان کا انجام جس کی پیشین گوئی نظم کے پہلے شعر سے ہی کی جا سکتی ہے انہیں سطحیت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ جب سنہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس اُس نے خود اپنے اظہار کی بیڑیاں قلم کر کے نئی سمتوں میں پرواز شروع کی تو اُس نے سب سے پہلے شاعری کو دروں بینی کا سلیقہ سکھایا۔ اس کی تازہ نظمیں موضوع کے کھونٹے کے گرد بے کسی سے طواف کرنے کی بجائے تصاویر کی بوقلمونی اور تجربات کی وُسعت کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان نظموں میں وہ بے لطف صراحت عنقا ہے جو اس کی نظریاتی شاعری کا خاصہ ہے لیکن ان کے گہرے معنی اس قدر خیال کی تہ داری گی سے آب و رنگ حاصل نہیں کرتے جس قدر مناظر اور کنایات کے رقصِ طاؤس سے۔ اُس میں ہمیشہ مرصع کاری کا احساس غالب رہا ہے۔ اس لئے اس کی زبان منجھی دُھلی، رنگین، کیف آور اور نغمہ بار ہوتی ہے۔ اس کی مثال کے لئے اُردو کے قاری کو فیض احمد فیضؔ کی یاد دلانا کافی ہوگا۔ راہیؔ پر دوسب سے غالب اثرات اقبال اور فیض کے ہیں لیکن اُس کی تازہ ترین نظموں میں اقبالؔ کا رجز فیضؔ کی مدھم لے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ غالبؔ کی عمیق بینی اور ایلیٹ کا التہابی لہجہ اُن پر اپنی پرچھائیاں ڈال رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کشمیری شاعری کو تاثیر کے اعتبار

سے زیادہ سرور انگیز اسلوب کے لحاظ سے بے حد خوبصورت نظمیں بھی ہیں جن میں جلوہ تہ زبور"۔ "فقر دریا سلسبیل ریٹھہ تہ رقص اور تخلیق" شامل ہیں لیکن معانی کی گہری تہوں کی تلاش اور مقصدی شاعری کی بے کیفی کا خمیازہ بھگتنے کے لئے اس نے اس نوع کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جنہیں مغربی ادب کے کچھ جدید ترین مشاہیر کی تعجیل پسندانہ صدائے بازگشت کہا جا سکتا ہے۔ ان نظموں میں یونانی دیومالا کے استعاروں اور علائم کی کثرت اُس کے کثرت مطالعہ کا ثبوت تو پیش کرتی ہے لیکن وہ ہمیشہ ان علائم کو نامانوس منظر بندی میں قابل فہم علامتوں کے طور پر جوڑنے میں کامیاب نہیں رہتا اور یہیں سے اِن نظموں پر ابہام کی شکایت کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں "گدلس تل"۔ "اکھ خاب" پےچھ ظلماتہ وُناں" شامل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں اظہار کا اعجاز اور اسرار کا طلسم کچھ اِس انداز سے مجتمع ہو گیا ہے کہ اُنھیں کشمیری شاعری کا نیا اُفق قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان نظموں کی بلیغ اشاریت، گہرا مفہوم، اضطراب موج کے ساتھ ساتھ سکون گہر والی کیفیت انہیں سمجھنے سے زیادہ کیف آور بناتا ہے۔ ان کا لطیف ابہام ایسا ہے جس پر غالب نے توضیح لکھی کو تصدق کر دیا تھا اور کسی فارسی نقاد کا کسی حد تک یہ مبالغہ آمیز قول یاد آتا ہے کہ "شعر خوب معنی ندارد" "یئب وآ ہی' اور کچھ ایسی نظمیں اس کی مثال ہیں۔ راہی کا ذکر کچھ اس لئے طویل ہو گیا کہ وہ نادم اور کامل کے ساتھ ہم عصر کشمیری شاعری کے تین خاص میلانات کا ممتاز نمائندہ ہے۔ اس کے رنگ کا خاصا اثر غلام نبی فراق پر بھی ہے فراق کی نظم نگاری کی عمر بھی طویل ہے۔ اور اس کے مطالعہ کی سمتیں بھی راہی کی مانند ہیں۔ اُن کی اختیار کی ہوئی علامتیں بھی راہی کی مانند اورورا، زیوس ہرکولیس، ہیلن وغیرہ ہیں اور اُن کی نظمیں بھی مغربی شاعروں کے اثر کے تحت لکھی گئی ہیں۔ فراق جذبے سے زیادہ تصویر کشی اور خیال سے زیادہ ابلاغ پر زور دیتا ہے۔ اس لئے اُس کی نظمیں اس لطیف ابہام سے خالی ہیں جو راہی کی خصوصیات ہیں۔ لیکن فراق کی بعض مخصوص خوبیوں کی داد دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

لیکن ان کی خلاقانہ جدّت کے باوجود ان کا معنوی ہلکا پن انہیں اس جدّت سے محروم کر دیتا ہے جو سینوں میں آگ لگا دیتی ہے۔ حامدی کاشمیری نے اگرچہ ابھی ابھی کشمیری شاعری کی طرف رُخ کیا ہے لیکن وہ صرف نظمیں لکھتے ہیں۔ راہی کی پُرکیف اور سرور انگیز لَے کے سحر میں آ کر اُنھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں ابھی انفرادیت کی آنچ نہیں نکھر پائی ہے۔ لیکن اُن کی امیجری اور آواز کے تال سم میں امتیاز کی زیریں لہر کا سراغ ابھی سے لگانا مشکل نہیں۔ موضوع کی گھمبیرتا سے شگفتگی کے ساتھ اُن کی یہ خصوصیت اُنہیں کشمیری نظم کے لئے خوش آئند بنا دیتی ہے۔ فاروق نازکی اگرچہ راہی سے متاثر ہونے کی بات کا خوش گوار خیر مقدم نہیں کریں گے لیکن اُن کی نظموں میں مرصّع کاری اور حُسنِ ادا کا جو خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے وہ انہیں اس گروہ کا ایک اُبھرتا ہوا شاعر بنا دیتا ہے۔ غلام نبی خیال ابھی اسلوب کی گہرائیوں میں اپنے آب و گل سے نکلی ہوئی کرن نہیں پیدا کر سکے ہیں۔ چند اچھی نظمیں لکھنے کے باوجود وہ راہی اور کامل کے رنگوں کے درمیان اِس انداز سے متحرک نظر آتے ہیں جسے رقص سے زیادہ بھٹکنے اور لغزشِ پا سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ صرف یونانی دیومالا کے علائم کے اُلٹ پھیر اور بعید از فہم تصوّرات کی دانستہ ترویج سے اسلوب اور آواز کا امتیاز حاصل نہیں ہو سکتا۔

نادم جیسا نظم گو اگرچہ رُوس و ہنگری کے واقعات سے کچھ عرصہ کے لئے دم بخود ہو کے رہ گیا۔ لیکن جب 'محوِ آئینہ داری' ہوش میں آیا تو یہ "نابدتہ ٹیٹھ وین"۔ "زلر زاجی" اور "کاٹھ درو ازہ بلیٹھ گرہ تام" جیسی معرکے کی نظمیں لے کر سامنے آ گیا جس نے کشمیری شاعری کے ایک مزاج کو دفعتاً پارینہ بنا دیا اور اس کی اپنی تقدیر متعیّن کر دی۔ نادم خیالات سے زیادہ جذبات اور بیان کے تعمیری ارتقا سے زیادہ استعارہ و تشبیہوں اور امیجری کی نیرنگیوں کا شاعر رہا ہے۔ اُس پر اُردو کے جوش ملیح آبادی کا اثر بڑا گہرا ہے، اور کشمیری زبان نے الفاظ کا اتنا بڑا نبض شناس جادوگر پیدا نہیں کیا ہے اس کا محبوب انداز کسی خاص تاثر کو ایک استعارے میں

پیش کرتا ہے۔ بعد میں وہ اپنے شاعرانہ نظر کے ہفت العادی شیشے کو پیمانہ رنگ کی طرح گردش میں لاکرا کیفیت کو گوناگوں اور ششدر کرنے والی تشبیہوں میں پیش کرتا ہے جو جوش کا خاصہ بھی ہے۔ "نابدِ تہ ٹیٹھ وَین" میں اُس نے اقبال کے اس مصرع کی کیفیتِ کا حُسن پہچان لیا ہے کہ "حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست"۔ نظم میں سنسکرت کے کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ یونانی اور فارسی علائم کے استعمال نے ایک ایسے حیرت کدے کو جنم دیا ہے جس کی طلسماتی فضا کشمیری شاعری میں بے مثل ہے۔ راہی کی تخلیق کی طرح اس کا مرکزی نقطہ بھی جسمانی وصال ہے۔ لیکن یہ راہی کی نظم کی بجائے شہوت انگیزی سے دامن بچانے کے بعد بھی زیادہ دیر پا اور شیرین سرور و نشاط پیدا کرتی ہے اور اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بدن کی لطافتیں ذہن کی لطافتوں سے اختلاط کے بعد ہی نرمیٔ لذت سے اُونچی ہو کر کیف اور نشہ پیدا کرسکتی ہیں۔ نادم نے صراحت سے گریز کے بعد الفاظ کی اکانوی (ECONOMY) کا جو اسٹائل اختیار کیا ہے اس سے اس کا فن نکھر آیا ہے اور اس کے پیمانِ ضبط نے ابتدائی جھجوڑے پن سے اُس کے فن کو آزاد کرلیا ہے۔ تصادیر اور رنگوں کے رقص کا یہ التہاب آسا طوفان غلام رسول سنتوش کی بعض نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ جہاں اُس نے نادم کی شعوری تقلید کی ہے لیکن وہ مختلف آویزشوں کے درمیان ابھی اپنے لہجے کے تنختی سر دریافت نہیں کرسکا ہے۔

راہی اگر مغربی ادب پر مہربان ہو کر اس کے امکانات سے استفادہ کر رہا ہے تو نادم کی تازہ ترین افتادِ طبع اُسے بالکل مخالف سمتوں میں لے جا رہی ہے۔ وہ "واکھ" کو تاریخ کے تابوت سے نکال کر اسے اپنے تجربات کی تازگی اور بے مثل فنی چابکدستی کے سہارے زندگی کے لمس سے لالہ گوں بنا رہا ہے۔ واکھ کشمیری شاعری کی قدیم ترین اور پارینہ صنف ہے جس کا استعمال للہ عارفہ (چودھویں صدی عیسوی) وغیرہ نے روحانی تجربوں اور اخلاقی درس کے بیان کے لئے کیا۔ یہ صنف اِس قدر بوسیدہ ہو چکی ہے کہ اسے اظہار کے مؤثر وسیلے کے لحاظ سے اب بانجھ

سمجھا جارہا تھا۔ لیکن ایک دیو قامت فن کار کس طرح اپنے 'نازِ گفتار' سے "کالبد صورت دیوار" کو حوصلہ خرام عطا کرتا ہے[1]۔ اُس کی نظیر اس کے تازہ ترین 'واکھ' ہیں۔ چار سے آٹھ اشعار کی اکائی میں صرف جدید تصورات کی آتشِ سیال ہی چھلک نہیں اُٹھتی بلکہ مجرد مصوری جیسی نقش کاری کے لیۓ بھی یہ پردہ زنگاری ایک روشن کینوس میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس معرکۂ بازیافت سے اندازہ ہوتا ہے مشینی سماج کے خلوت گزیدہ ذہنی اپاہج کے جذب وجنوں، کیف ومستی اور یاس وبے یقینی کے لئے اجنبی اصنافِ سخن کے علاوہ ہماری اپنی کلاسیکی صنفوں میں دست گیری اور قوت شفا کے کتنے سرچشمے پوشیدہ ہیں۔ یہ سلسلہ اب آگے کو نکل چلا ہے اور سجود سیلانی نے نادمؔ کے نقشِ قدم پر چل کر جو کوششیں شروع کی ہیں۔ اُن کے ثمر بار ہونے کے بارے میں اچھی امیدیں بندھ چلی ہیں ۔نادمؔ کی آواز کے سائے میں پلنے والے شاعروں میں چمن لال چمنؔ کا نام سرِفہرست ہے ۔عنفوانِ شباب کے سیلِ محبت میں بہنے والے اس شاعر کو اگر الفاظ کے اختصار اشاروں کے ایجاز اور زبان کی تراش خراش کا راز سمجھ میں آجائے تو اسے مجازؔ کی اردو شاعری کی طرح کشمیری ادب میں اپنا مخصوص مقام مل سکتا ہے

محمد امین کاملؔ کو اسلوب ادا اور ایروچ کے لحاظ سے کشمیری شاعری کا عہد آفرین شاعر سمجھنا چاہئے ۔ اُس کے یہاں غنائیت تلخی اور تُرشی میں بدل گئی ہے۔ راہیؔ نے کشمیری شاعری کو اگر دلبری کے انداز سکھائے تو کاملؔ نے اُسے دلبری کے دم خم عطا کئے ۔ اُس کی شاعری میں عشق اور حُسن کے مروّجہ علائم کی کمی ہی نہیں بلکہ یہ موضوعات فقط اُس کی شاعری کے متن کے لئے حاشیے کے گُل بوٹے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی نوعیت آرائشی ہے اور بس ۔ ایسے شاعروں کو میکانکی قاعدے کے بعد نظم کا مردِ میدان ہونا چاہئے تھا لیکن وہ غزل کا امام بن گیا ہے اور اس

---

[1] جس بزم میں تو نازسے گفتار میں آوے
جہاں کالبد صورتِ دیوار میں آوے (غالبؔ)

کی تقدیر ساز غزلوں نے کشمیری غزل کی ساری کائنات کی کایا پلٹ کے رکھ دی ہے
ان غزلوں کی ترچھی چتون، ان کی طنزیہ دھار اور ان کی جلال آمیز بے زاری
کشمیری غزل کو اردو کی معاصر غزل کے قریب لے آتی ہے۔ اور یہ ہمیں فراق اور
شاد عارفی کی غزلوں کی یاد دلاتی ہے۔ نظم بھی کامل نے لکھی ہے لیکن کیفیاتی طور وہاں
کوئی راہبر یا گہرا تاثر معلوم نہیں ہوتا۔ ان میں تفکر نے فن کے آہوئے رم خوردہ کو
پابہ جولاں کر دیا ہے۔ اس کی وہی نظمیں کامیاب ہیں جن میں اس کی غزل کا انداز
کارفرما ہے۔ اس سلسلے میں "نیتھ ننی مایہ"۔ "شام پیٹھ صبح تام" نہ صرف "ابدی
مسرت" اور "کاذی ویلیم" سے زیادہ فرحت انگیز، تحریک بخش اور فیضان آور ہیں،
بلکہ وہ نئے شاعروں کے لئے طبع آزمائی کی نشان منزل بھی بن گئی ہیں۔ ان لفظوں
کی کلاسیکیت اور ان کے سادہ و پرکار پیرائے بازی غزل کے مضمون و لہجے کے
زیادہ قریب کامل نے جو آزاد اور مرصع نظمیں جدت کے خیال سے لکھی ہیں انہیں ہندو
دیومالا کے استعاروں کو خواہ مخواہ کھپانے کا خبط اظہار میں اٹکاؤ پیدا کرتا ہے، اور
ندرت کا تاثر پیدا کرنے کی دانستہ کوشش نظم کی کیفیت شعری کی کلائی مروڑ دیتی ہے۔
کامل کے غزل کی ان نظموں میں زبوں حالی کا ثبوت یہ ہے کہ یہ نظمیں اب کم سے کم ہوتی جارہی
ہیں۔ اور ان نظموں میں اس کی تھکن کے نقوش نظر آتے ہیں۔ محی الدین گوہر، رشید نازکی
وغیرہ کامل کی تقلید کر رہے ہیں۔ لیکن کامل کے ستم ظریفانہ تبسم نے اسے اس لحاظ
ایک ایسی شے بنا دیا ہے جس کی تمنا تو کی جا سکتی ہے لیکن جس کا تاثر دیتے ہوئے
غالب کا یہ مصرع یاد آ جاتا ہے ؎

"ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے"

کشمیری نظم کا ذکر کرتے ہوئے میر غلام رسول نازکی کے قطعات کو بھول جانا ایک
ایسی فروگذاشت ہوگی جس کا کفارہ ممکن ہی نہیں۔ نازکی کے یہ قطعات معاصر موضوعات
کے بجائے حسن و عشق اور نعت منقبت کے روایتی موضوعات سے متعلق ہیں لیکن
شاعر نے جس تازہ کاری، نزاکت خیال اور خوبصورت فن کاری کے ساتھ یہ "نظم پارے"

آراستہ کئے ہیں۔ اُس نے انہیں چند ہی برس کے عرصے میں کشمیری شاعری کی صفِ اول میں جگہ دلادی ہے اور وہ اپنی ذات میں کشمیری نظم کا ہی نہیں کشمیری شاعری کا الگ باب بن گئے ہیں۔

مُظفرؔ عازم کو کلاسکی روایت کا شعوری علمبردار سمجھنا چاہئے۔ کاملؔ سے متاثر ہونے کے باوجود اُس کی نظم الگ شان وشوکت کی حامل ہے۔ اُس کی شاعری میں فن کے لوازم کا جس قدر التزام ملتا ہے اس نے انکا رنگ گلابی گلابی اور ان کا مزاج شبنم آگیں بنادیا ہے۔ لیکن معنی کو وہ جس طرح انگشت نُما کرنے کا روادار ہے اس سے ان کی ایجازی حیثیت ضرور متاثر ہوتی ہے اس رچاؤ اور موسیقی کا عاشق ہونے کے باوجود حسین شاعرانہ ابہام سے خوف کی حدتک احتراز انہیں ایک مرتبہ بڑھ کر باسی بنانے کا احساس پیدا کرتی ہے وہ شاذ ہی "مَنہٖ کا مَنٛ" جیسی نظمیں لکھ سکتے ہیں جو کلاسیکی رچاؤ کے باوجود نہ ابہام سے گھبراتی ہے اور نہ شاعرانہ سرور انگیزی کے فوری ردِّ عمل کا کاسۂ گدائی ہاتھ میں لئے رحم کی طالب نظر آتی ہے۔

مجموعی حیثیت سے کشمیری شاعری میں یہ دور نظم کا ہے۔ یورپی زبانوں، خاص طور پر انگریزی، اُردو اور ہندی کے لئے میلانات شعری کشمیری میں بھی صدائے بازگشت پیدا کر رہے ہیں اور یہ دعوی کرنا ہرگز خودستائی کا مظہر نہیں کہ کشمیری کی بعض نظمیں افتخار کے ساتھ اِن زبانوں کی اچھی سے اچھی نظموں کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہیں ÷

پروفیسر شمس الدین احمد

محمد رضا مشتاق

محمد رضا مشتاق ناجی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور نوشہرہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا سن پیدائش معلوم نہیں۔ اکثر خطوط نویسی اور کتابت سے شغف رکھتے تھے اور عہدِ جوانی میں شعر و شاعری کی طرف توجہ کی اور طبع آزمائی کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت اور استعدادِ سخن کی وجہ سے شاعر کا درجہ حاصل کیا اور اپنے ہم عصر شاعروں پر بھی سبقت حاصل کی۔

مثنوی مولانا روم کی نقلیں لکھ کر بیچتے اور اس طرح اپنا ذریعۂ معاش میسر کر لیتے۔ حکام و امراء کی کبھی مدح سرائی نہ کی جوکہ اُس زمانے میں شاعروں کی خاصیت رہی تھی اور عمرِ آخیر تک آزادگی اور قلندری میں بسر کی۔ مُلّا محمد توفیق نے جو بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ اُن کی شاگردی اختیار کر کے بعد میں ملک الشعراء کا درجہ حاصل کیا۔

سنہ ۱۱۵۱ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات اِس سے بھی نکلتی ہے۔

"شاہ مشتاق از سرِ دُنیا گذشت"

شعر و شاعری:

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی مُلک کی آب و ہوا کا اثر لوگوں کے خیالات اور اُن کے علوم و فنون پر پڑتا ہے۔ کشمیر کی خاک شادابی میں ایک

واحد نمونہ ہے، جس کی بدولت یہ "جنّت کا نمونہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ اور اُس نے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار آسانی کے ساتھ فارسی زبان میں کرنا مُناسب سمجھا، اور یہاں کے قدرتی مناظر نے یہاں کے شاعر کو سخندانی پر اُبھارا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعر کی زبان سے جو شعر نکلا وہ حقیقت سے لبریز اور سادہ تھا۔ کشمیر کے اکثر فارسی شعراء وطن کے مناظر سے متأثر نظر آتے ہیں لیکن ان سب میں محمد رضا مشتاق ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا کلام چمنستان اور بہارستان ہے۔ سارے کلام میں رنگینی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ کسی چیز کی خرابی یا کمال کو بیان کرتے وقت رنگ و بو سے کام لیتے ہیں۔ رنگینی کا خیال اُن کی طبیعت پر اِس قدر چھایا تھا کہ جو بات زبان سے نکلتی ہے رنگین ہوکر نکلتی ہے سردردِ عشق کے عام خیالات عام طور پر عاشقانہ رنگ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن مشتاق اس ویرانے سے بھی شادابی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

بلبل دردیم و خون مے بارد از منقار ما
الحذر ای شاخ گُل از نالہ ہائے زار ما
ریشۂ نخلِ زباں آب از دل ما می خورد
راستی شمعی بود در محفل گفتار ما

چاندنی رات کی تنہائیاں ایک فطری شاعر کے لئے زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عمر خیام کا جام و سبو فارسی شاعری میں بہت مشہور ہے۔ حافظ شیرازی کا دیوان ذکر سے بھرا ہے۔ اور شراب معرفت کے یہ دونوں متوالے شراب کا جام لنڈھاتے وقت اپنی خداداد طبیعت سے کوئی لطیف نکتہ پیدا نہ کرسکے۔ لیکن مشتاق نے شب مہتاب میں بادہ گلگوں کی نوشا نوشی کا وہ نقشہ پیش کیا ہے کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے:

ز موج بادۂ گلگوں شب مہتاب
پری در سایۂ مینای مستانہ می رقصد

بذوق نغمۂ مطرب بشوق عشوۂ ساقی
زنکیۂ شیشہ از سوی دگر پیمانہ می رقصد

مُشتاق پر رنگ و بو کا مادہ اِس قدر چھایا تھا کہ اُن کی ہر غزل لالہ زار معلوم ہوتی ہے۔ اور اُن کی تشبیہات اس قدر برجستہ ہیں کہ فطرت کی ہوبہو تصویر کھینچکر رکھ دیتے ہیں اور اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دئے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائے گا۔

کشمیر کی تعریف کرنا ایرانی شاعروں کا بھی خاصہ رہا ہے۔ عرفی۔ طالب۔ کلیم وغیرہ شاعروں نے سیاحوں کی آنکھ سے کشمیر کو دیکھ کر اس کی دل فریبیوں کا تذکرہ کیا تھا۔ مشتاق کشمیر کو دوہری حیثیت سے دیکھتے ہیں: بحیثیتِ ایک فرزند کے اور بحیثیت ایک فطری مدّاح شاعر کے، کشمیر کی شادابی، یہاں کے سبزہ زاروں، آب شاروں، چشموں، سرسبز درختوں، چہکتے ہوئے پرندوں اور لالہ زاروں کی تعریف میں لکھتے ہیں:ـ

شوخ از بس، بہار کشمیر است
مژۂ حُور، خارِ کشمیر است
چشمِ لیلےٰ کہ دِل ز مجنوں برد
داغی از لالہ زار کشمیر است
نخل طوبیٰ باآں سرفرازی
زیردست چنار کشمیر است
قامت نازپرور لیلےٰ
سروے از جویبار کشمیر است
آبروئے جہاں دہر چہ دردست
خاکِ پاکِ دیارِ کشمیر است
بحر شاہنشہ بہار طرب
ابر گوہر نثار کشمیر است

حافظ شیرازی کو آبِ رکناباد اور گلگشتِ مصلّیٰ پر بہت ناز تھا۔ اُنہوں نے کہا ہے:۔

بدہ ساقی مئی باقی کہ در جنّت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رُکناباد و گلگشتِ مصلّیٰ را

حافظ اگر رُکناباد کے کنارے پر شراب پینے کی دعوت دیتے ہیں اور اِس طرح سے وہ اس جگہ کی اہمیّت کو ظاہر کرتے ہیں لیکن مشتاق کشمیر کے دریائے بہت (ویتھ) کے کنارے پر بیٹھ کر صاف و شفاف پانی کا منظر دیکھ کر شراب کو بھی بھُلائے جانے کا یقین دلاتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

بیا کہ حاجت مئی نیست در کنارِ بہت
شراب ناب بود آب خوش گوارِ بہت
بہشت نقد ازیں خوب تر نمی باشد
نگار و سایۂ بید و مئی و کنارِ بہت
بگو بہ تشنہ لب سر لالہ زارِ بہشت
شب برات تماشہ کند کنارِ بہت

مُشتاق ایک سچے عاشق کا دِل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے عاشقانہ خیالات میں انتہائی پاکیزگی اور روانی ہے۔ عاشقانہ کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی اور شستگی ہے۔ یہ جوہر اُن کے کلام کا خاصہ ہے اور مختلف باتیں جمع ہونے سے اُن کی غزلیات زیادہ شیریں اور دلاویز ہوگئیں ہیں۔ مثلاً اُن کی یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

کردیم سیر گلشن تا ما دیار ہر دو
گشتند بلبل و گل بے اعتبار ہر دو
چشم سیاہ متش لعل قدح بدستش
از عاشقاں ربودہ صبر و قرار ہر دو

زُلفین تابدارشش بر لالہ عذارشش
خوش حلقہ حلقہ کردہ مانند مار ہر دو

مُشتاق کے کلام کی نُمایاں خصوصیت اُن کی قادر الکلامی ہے اور اِس میدان میں وہ اپنے ہم عصر شعراء سے سب سے آگے تھے۔ زبان کی قُدرت سے کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ چیز ایک وجدانی چیز ہے اور اُس کے ضروری عناصر تخیّل کی بلندی، مضامین کا زور، الفاظ کا شکوہ اور بندش کی چُستی ہے۔ مشتاق کی اکثر غزلیات میں یہ صفتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کی یہ غزل ملاحظہ ہو:ـ

کند صحراب طاعت ماہِ نونعل سمندش را
نہد زنجیر گردن حلقۂ زُلفِ کمندش را
در و دیوار بزمش شوخیٔ دارد کہ می بخشد
فریب چشم آہو حلقہ دو دسیندش را
نویدے لیلیش نخلے بتاراج خزاں رفتہ
اگر می دید مجنوں جلوۂ سرو بلندش را
کباب آتش رشک جگر گویم کہ می بخشد
نمکپاشِ تبسّم ہای لعل نوش خندش را

عبدالاحد آزاد

کلامِ مہجور کا تاریخی ارتقاء

متروکات شاعری کے بارے میں مہجور کا نصب العین ملکی ادیبوں کے نقطۂ نظر سے متضاد نہیں ہے۔ آپ بھی گل و بلبل کی شاعری کو تہذیب و تمدن کے حق میں مُضر اور نقصان دہ ماننے والوں میں شامل ہیں۔ البتہ آپ کو ادباء کے ساتھ ایک اختلاف ہے۔ ملکی ادیب غیر ملکی زبانوں کی طرف راجع ہیں اور آپ ہمہ تن یہی چاہتے ہیں کہ کشمیری زبان میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ تمام علوم و فنون سے کشمیری جمہور کو براہِ راست اور بلا واسطہ واقف کر سکے۔ لیکن حالات دگرگوں تھے۔ کشمیری زبان کی نفرت کشمیریوں کے دلوں پر نقش ہو چکی تھی۔ کشمیری اشعار کا سُننا اور لکھنا باعثِ ننگ خیال کیا جاتا تھا۔ اس نفرت کا دُور کرنا سدِ سکندری توڑنے کے مترادف تھا۔ آپ نے تخاطب کے مذاق اور زبان کی وُسعت پر غور و خوض کر کے اپنی شاعرانہ تعلیم غزل کی مزیدار تمہید سے شروع کی۔ اوّل اوّل عشق و عاشقی کے دلفریب جذبات کی چاشنی دیتے ہوئے ملکی مذاق کو کشمیری زبان کی طرف متوجہ کر دیا۔ جب اس میں کامیابی حاصل ہوئی اور آپ نے اپنے کلام کی خُوب شہرت و مقبولیت اور خاص چرچا دیکھا اور آپ کو اطمینان ہوا کہ اب کشمیری زبان کی شاعری کے قدردان پیدا ہونے لگے ہیں اور کشمیری اشعار اعلیٰ سوسائیٹیوں میں راہ پانے لگے ہیں۔ اب تو آپ خیال بندی اور مضمون آفرینی کی طرف راجع ہو کر عشق عشقیات کے فرسودہ خیالات

سے روز بروز کنارہ کش ہوتے جارہے ہیں۔ آپ کے اِبتدائی کلام کا آپ کی تازہ غزلوں سے مُقابلہ کیا جائے تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ جب اِنسان دلی جذبات یا خارجی اسباب سے مجبور ہوکر کسی مشکل کام کی انجام دہی پر مامور ہوتا ہے تو اوّل اوّل اس کے دِل میں قسم قسم کے متضاد خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ کسی مشکل کا مقابلہ کرنا پڑے تو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور اپنی عقل کو ناقص قرار دیتا ہے۔ کہ ایسا کام کیوں اپنے ذمہ لے لیا۔ کوئی خمیازہ اُٹھانا پڑے تو گھبرا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو اس کام میں ہمیشہ گھاٹا اُٹھانا پڑے۔ مہجور کا ایک اِبتدائی شعر ملاحظہ ہو۔ دیکھ لیجئے کیسے تشویشناک خیال ہے:ے

سادہ آسس وعدہ ہیتھ ے اُلفتُک سودا کریوم
رأضی تھاؤت بازی کھیأوِت گاہ پاوت نؤلہو

دوسرا شعر یہ ہے:ے

ژہ یارن سیتی رنگہ رلیہ ماران بو تنہا خونِ دِل ہاران
دوہس کوت نیرہ چھس تھاران وں ژھارت رونلے ہیرو

(عاشق کا محبوب سے یوں کہنا کہ تو دوستوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے میں تنہا بیٹھ کر روتا ہوں۔ دِن میں باہر نکلنے سے گھبراتا ہوں۔ اب تجھے رات کے وقت ڈھونڈوں گا) ثابت کردیتا ہے کہ عاشق کے طلب صادق اور اِستقلال میں نمایاں کمزوری اور نقص ہے۔ ایسے خیالات نومشق عاشق یا بوالہوس کا خاصہ ہیں۔ آگے چل کر مشقت میں آرام ملتا ہے اور مشکلیں راحت افزا محسوس ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:ے

"عاشق چھُ سُہ یُس زندگی گزراوِہ نارس منز۔" یعنی عاشق وہ ہے جو اپنی زندگی آگ میں گزارے۔

جو عشق رسوائی اور بدنامی کا باعث معلوم ہوتا تھا:

عشقن کرس بدنامہ کرۂ کھ گیہ شہرتہ گام۔ بنترنہ جھم زِ ان پامو یو شے متہ جانو

اُسی عشق پر بعد میں فخر کرتے ہیں:

دِل میٖون نمھاڑی تون مَنز پھولدان ۔ یہ پلیتو سنبلستان مَنز

اُمہ کرۂ بشہ گی غنچہ دہان

مورِ ش مٹے مو روش بو نوٚ ژالہ جُدائی

کرہ جان فِدا یان پَنُن مارہ اُتی رو ز

آپ کا آج سے آٹھ سال قبل کا شعر ہے۔ دیکھو عاشق محبوب سے جُدا ہونے کی حالت میں خودکشی پر آمادہ ہو رہا ہے۔ چونکہ کسی مُصیبت میں مُبتلا ہو کر ایسا ارادہ کرنا کمزوریٔ فطرت اور ضعف استقلال کا نتیجہ ہے۔ یہی خیال ایک تازہ غزل کے ایک شعر میں یوں ادا کرتے ہیں

بو نیرہ ژٔے پَتہ کران گدائی یو نہ جُدا آسہ زرے ہا لا و

خودکشی کہاں عاشق کے جنون کا یہ عالم ہے کہ وہ امیری، دھن، دولت، خانماں، ننگ و ناموس چھوڑ کر گدا بن کر اپنے محبوب کے پیچھے ہو لینے پر تیار ہے۔

ابتدائی ایّام میں کبھی کبھی آپ کے دِل پر مایوسی چھا جاتی ہے محبت و اُلفت کے باغِ آرزو میں خزاں کے آثار گاہ بگاہ نظر آتے ہیں پھر لڑکپن کی یاد کا بہانہ کر کے اِس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں:

۱ ژٔے زٔ لکھا بازیاہ رٔتھ بازیگار و ہو نہ بہار و میشاہ نہ کہ چار و ہو

۲ میون نہ کہ چار تولہ ون اوس گلزار سُلہ پھولمُت اوس تَتھ گُل انار

واوہ ہرِد نہ گوس لُور یارو

۳ میٖون یاد ن کھہ وُن بار شراوُن جلوہ ہا دُن تہ عالم تنبہ لاوُن

بوش پوشن تہِ رؤد نہ وہ تار و ہو

آج آپ کے گلشنِ محبّت اور باغِ اُمید و آرزو میں بہار ہی بہار ہے سبزہ زار لہلہاتے ہیں۔ آب شاریں جاری ہیں۔ فوّارے چھوٹ رہے ہیں۔ قسم قسم کے پھُول کھِلے ہیں۔ کیاریاں بہار دے رہی ہیں۔ باغبان سیرِ چمن سے مَست ہو رہا ہے۔ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں پر پرندے بول رہے ہیں۔ بھونرے چمنوں میں ساز بجاتے ہیں۔ نرگس اس کی طرف دیکھ دیکھ کر بیمار ہو رہی ہے۔ صُبح کی شبنم دِل کی تپش بجھا دیتی ہے۔ نسیمِ صُبح پھولوں سے عشق بازی کرتی ہے۔ ذیل کے گیت کے ایک ایک شعر پر غور کرو کہ شاعر کے دِل پر فرطِ مسرّت سے کیسے ولولہ انگیز جذبات طاری ہو رہے ہیں

بلبل لاگتھ اژو دِلہ باغس چھاوان لولک بہار
ڈلک سبزار لُولک آبشار لولکۍ وۄتھان فوار

لوِ لچ یٔمبرزل لولچ مسول لولک گُل تہ گُلزار
لولسان باغوان چمنن چھیران لوۄلے کران طومار

دِلہ کین کلین بیٹھ لولہ سان بولان لولک جانوار
لولچ آواز لولک پرواز لولس پیٹھ کران نثار

لولچہ پوشہ تھرہ لولچہ رنگہ زرہ لولک ونان اسرار
لولک واو دوت نِشہ لولہ پوشن لولے کران زیوہار

دِلہ بمبرا اوس منز لولہ چمنن وایان لولچ تار
تس کُن یٔمبرزلہ وچھ لولہ عجیشمو لولن کرسہ بمار

حُسنکہ پرتو نشہِ لولہ جوشن پوشن ہوش تہ قرار
لولک شبنم رو ترا وِہ صُبحدم شیتہلاوہ لولک نار

لول ہیچھ رس لول بولہ ناوان لولک کران گفتار
لولے چھُ سازس رازو نہ ناوان لولے کران اظہار

اُوپر کی مثالوں سے ہمیں یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ شاعر قنوطی جذبات کو روز بروز خیر باد کہہ رہا ہے اور اس کے خیالات میں پختگی اور متانت کے ساتھ ساتھ اُمید و آرزو کی گرمی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کہنہ مشق اور کامیاب شاعر کے کلام میں تو یہ خصوصیت (جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے) خود بخود نمودار ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ مثالیں ناظرین کو شاعر کے ماحول اور تخیل کے انقلاب سے پورے طور واقف نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا چند ایسے تازہ اشعار لکھے جاتے ہیں جو ہر پہلو سے مہجور کے ابتدائی کلام سے متفاوت ہیں تاکہ قارئین کرام پر واضح ہو کہ مہجور روز بروز فرسودہ عشق و عاشقی سے ہٹ کر اونچی سطح کے موضوعات پر شعر لکھ رہے ہیں گویا آپ کی ابتدائی عشقیہ شاعری ایک تمہید ہے اُس حقیقی شاعری کی جس پر آپ اب پہنچے ہیں۔ آپ کی ایک تازہ غزل یہ ہے:۔

۱۔ خاک دانہ دانہ بَن دُر دانہ بَن   جان بَن جان بَن جانانہ بن

۲۔ جان بن جانان چھے بینہ نُے پلہا   جان چُھک تہٕ جانان چھے سورُے جہان

ساغری خوش تھاوُک صاحبِ خانہ بَن

۳۔ بیک رنگ سینت پاتہٕ کرِاے   نولہٕ کِس حمینس منز رژھ جاے لاٹس منز ماگ لوالک شانہ بن

۴۔ باغس آسان گُل تہٕ بتیہِ خار - باغہ وان روشہٕ ژُن ہمند غمخوار - دِی تراوان ن امی انمانہٕ بن

۵۔ مہجورہٕ لُولک ساز تھو تیار - وَندہٕ ژالہٕ شین گلہٕ بتیہ بہار - گُل پھولن پانُے ژہٕ زرا بہانہ بن

یہ اشعار چُست ہوں یا پھس پھُسے برجستہ ہوں یا کچھ اور بہر حال جو کچھ بھی ہوں ہم کو شاعر کے ذہنی انقلاب سے ضرور واقف کرا سکتے ہیں۔

آپ کی آج سے چند سال پیشتر کی غزلیں عموماً سادہ جذبات نگاری اور محاورہ بندی تک محدود ہوتی تھیں۔ آج کل ایسے اچھوتے مضامین اور نادر خیالات باندھتے ہیں جن کا آپ کی سابقہ غزلوں میں شائبہ تک نہیں پایا جاتا ہے

۱۔ واوِ صُبحُک سُلہِ آو لاران - تنہِ لشوُمت کیاہ تام ژھاران - خندہٕ پوشہٕ کرُس جایہ جایہ

(صُبح کی ہوا بدحواس ہو کر کسی چیز کی تلاش میں بہت سویرے دوڑتی ہوئی آئی۔ پھولوں نے

جگہ جگہ اُس کی ہنسی اُڑائی)

۲۵۔ وژ بتھ شور یا مت، واو ہُنز موج تلت گو

اظہار تم کور زُلفہ تھتھرایہ وَنہ کیا

(شور مچ گیا جب کہ ہوا حُسن پر موج مارتا چلی گئی۔ کیا کہوں، زُلف کی تھرتھراہٹ نے اس کا اظہار کس انداز سے کیا)

۲۶ کاغذی پوشہ بنے، پوکھ چھ زنمینے لاران

اَز چھ بُلبل ترِ کران شکر گذاری ساری

(کاغذ کے پھول بنے۔ لوگ انہی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ آج ساری بلبلیں بھی شکر گذاری کرتی ہیں)

۲۷ ژایہ لارہ وُچھا، نالہ رمبہ بت دارہ وچھ بے روے

گلہ زیو مے گیم اوش ووپھم دَرہ رایہ وَنے کیاہ

(اے محبوب میں نے تجھ کو کمال اضطراب اور تعجیل میں دیکھا۔ میں تجھے گلے لگاتی۔ تیرا مُنہ اچھی طرح دیکھتی۔ تجھ اپنی بے تابی کا حال سُناتی۔ لیکن کیا کروں میری زبان میں بولنے کی طاقت نہیں۔ آنسوؤں کی دھار جاری ہے)

نالہ رنبی آرہ وتستا (جہلم) کا مشہور مغربی معاون ہے۔ اس میں برسات اور بہار کے دنوں عموماً طغیانی آتی ہے اور یہ بڑے جوش و خروش سے بہتا ہے۔ اس نالے سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں، جو کہ ارد گرد کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ بہار اور برسات کے خاتمہ پر اس میں پانی کم ہو جاتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی ندیاں سوکھ جاتی ہیں اور آس پاس کے کھیتوں کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اس حسرت ناک نظارے پر اس طرح مضمون باندھتے ہیں:۔ میون لہ کہ چارتر ژایہ ژون آب رنبہ آرہ۔ گوشہ زرتہ بچھر پتہ چھو نتوار کوہ لہ رادن تہ دیہ سبزار ہو (یعنی میرا لڑکپن رنبی آرکے پانی کی طرح بہہ گیا۔ اس کا واپس آنا مشکل ہے۔ ندیوں کے کنارے جو سر سبز تھے

اب سُوکھے پڑے ہیں)

مطلب یہ کہ میرے عہدِ شباب کو رنبی آر[ل] کی طغیانی کی طرح نشیب و فراز کچھ نہ سُوجھتا تھا۔ سب دماغی اور جسمانی قوتیں شباب پر تھیں۔ کھیت اور ندیوں کے کنارے لہلہاتے تھے یعنی دماغ اور بدن پر رونق خاصی تھی۔ جب سیلاب گھٹنے لگا پانی کم ہوتا گیا، نالے کی شاخیں خشک ہونے لگیں۔ اور ان کے کناروں کا سبزہ سُوکھ گیا۔ مُراد یہ کہ بڑھاپا آگیا اور تمام قویٰ مضمحل ہو گئے۔ اس خیال کو فردوسیِ کشمیر عبدالوہاب پرے نے بھی خُوب باندھا ہے ؎

آدی اوُسک رُنبی آرو ایرہ نالان کوہ۔ چھُے وۄن تھان وُنکین غبار دوکہ جاردہِ

(او میرے لڑکپن تو تھوڑے ہی دِن ہوئے زمانہ رنبی آر کی طرح پیڑ بھی بہائے جاتا تھا اب تو ہر طرف گرد و غبار ہی اُڑتا نظر آرہا ہے)

مہجور زمینِ گل کا پروردہ ہونے کی وجہ سے طبعاً پھولوں کے بے حد مشتاق ہیں۔ جس طرح خواجہ حافظ شیرازی مے و میخانہ کا ذکر کرتے وقت جوش میں آتے ہیں، اور میر شاہ آبادی کو زُلف وخال اور حُلیہ نگاری کا تشغف ہے اسی طرح آپ گل و گلزار کی باتوں سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ پھولوں پر شبنم دیکھ کر آپ کے دِل پر جو جذبہ طاری ہوتا ہے اس کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

یس آسہ بیماری غمچ تس تو بہ شربت شبنمچ بلہِ درچمن بیمارِ گل کرو بلبلو دیدارِ گل

(جس کو غم کی بیماری ہو اس کو شبنم کا شربت پلانا چاہیے۔ گل کا بیمار چمن ہی میں اچھا ہو سکتا ہے۔ اے بلبل گل کا دیدار کر) صُبح کے وقت باغ میں ٹہلتے ہوں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے ہوں گے۔ درخت جھوم رہے ہونگے۔ پتوں سے سرسراہٹ کے نغمے نکلتے ہوں گے۔ پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی۔ اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

بادِ صبا اُردی کران۔ پرٔ تھ جایہ وصف گل پران۔ گرمی چھ و بازارِ گلُ

(صبح کی ہوا منادی کر رہی ہے ہر جگہ پھولوں کے اوصاف بیان کرتی چل رہی ہے۔ گُل کا بازار کیا گرم ہے) بادِ صبا کے مقابلے میں گرمیٔ بازار کہنا داد دینے کے قابل ہے ؛

ل۔ شوپیاں کے متصل بہنے والا طغیانی نالہ (م۔ی۔ٹ)

محمد امین کامل

حبہ خاتون

حبہ خاتون کشمیری زبان کی ایک ممتاز شاعرہ ہے اور کشمیری موسیقی کی رُوح رواں بھی۔ اس کے گیت آج بھی کسانوں کی تھکن دُور کرتے ہیں اور راگ ورنگ کے دلدادہ ارباب ذوق کی محفلوں کو گداز بخشتے ہیں لیکن اِس کے باوجود اس کی زندگی کے حالات ماضی کے دھندلکوں میں کچھ اسطرح چھُپے ہوئے ہیں کہ تیز بینی کے باوصف ٹھیک سے کوئی پہلو اُجاگر نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال صرف اِسی شاعرہ کے ساتھ نہیں بلکہ آج سے صرف چالیس پچاس برس پہلے کے کشمیری شاعروں کے ساتھ بھی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیری عوام کی اکثریت ان پڑھ ہے۔ یہ لوگ اپنی پسند کے اشعار ایک دوسرے سے سُن کر حفظ کرتے اور انہیں سینہ بہ سینہ محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی بنیادی غرض چونکہ اپنے ذوق و وجدان کی تسکین ہوتی ہے۔ اسلئے شعرا کے سوانحی حالات جاننے سے زیادہ اشعار کے حفظ پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے اگر اِن اشعار کے مقطع میں شاعر کا نام آیا تو محفوظ رہا نہیں تو کچھ مُدت کے بعد یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس کے کہے ہوئے اور کس وقت کی پیداوار ہیں۔

حبہ خاتون کے متعلق جو تاریخی مواد ہمیں دست یاب ہوئے ہیں،

اُن میں اس قدر اختصار و اختلاف ہے کہ ان کی روشنی میں ہم اس کی زندگی پر کوئی بھرپور نظر نہیں ڈال سکتے، سب سے پرانی شہادت پنڈت بیربل کاچرو کی ہے جس نے حبہ خاتون کے کوئی ڈھائی سو سال بعد کشمیر کی ایک تاریخ لکھی ہے، اس سے پیشتر کے تمام وقائع نگار اِس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں۔ پنڈت کاچرو لکھتا ہے

یوسف شاہ چک حبہ خاتون نام کی ایک محبوبہ سے جو کہ حُسن وجمال اور لہجہ و آواز میں بے مثل تھی، صحبت رکھتا تھا، تفصیل یہ ہے کہ اُس کے آبا و اجداد پرگنہ دسو (یا نپور) کے گاوں چندہار کے رہنے والے تھے۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچی تو اس کی شادی اپنے ہی خاندان میں کر دیگئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اپنی اقتضائے طبیعت کے باعث وہ کشمیری اشعار گانے لگی جس پر اس کی سسرال کے تمام چھوٹے بڑے اس کو لعنت و ملامت کرنے لگے۔ آخر ایک دن اُس کی سر چادر کے پلّو میں خلع نامہ باندھ دیا گیا۔ اور اُسے اس کے خاوند کے ہمراہ کسی بہانے گھر سے نکال کر میکے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اثنائے راہ میں جب یوسف شاہ کے ملازموں نے اُس کی شکل و صورت کو دیکھا اور اُس کی آوازِ شیریں کو سُنا تو اُنہوں نے اُسی وقت حضور ولی نعمت کے پاس اُسے پہنچا دیا۔ وہ اُس کے "حسن صورت پر ہزار جان سے فریفتہ ہوا اور اُسے اپنی ہم بستری کا شرف عطا کیا۔"

بیربل کاچرو کا یہ بیان بعد کے تمام وقائع نگاروں سے کہیں زیادہ معتبر ہے کیونکہ روائت جتنی پرانی ہو، اُتنی ہی حقیقت کے زیادہ قریب ہوگی، بعد میں امتدادِ زمانہ سے اصل حقیقت پر

اِنسانی تعریف کی اتنی سوٹی تہیں جم جاتی ہیں کہ ان کو کریدنا ناممکن ہو جاتا ہے۔
اس تحریر کے کوئی ساٹھ ستر سال بعد حسن کویہامی اپنی مشہور تاریخ
میں چند اور باتوں کا انکشاف کرتا ہے۔

"کہتے ہیں وہ گلعذار پرگنہ دسود (پابنور) کے چند ہار گاؤں کے
ایک زمیندار کی لڑکی تھی، اُس کی شادی ایک آوارہ مزاج اور قلاش آدمی
سے ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کی اِس اوباشی کے باعث اُس کی سُسرال
والوں سے بن نہ گئی اور بات میاں بیوی کی علیحدگی پر ختم ہو گئی۔ ایک دِن
راہ چلتے یوسف شاہ کی نظر اُس پر پڑی جبکہ وہ مقام عراق پر کوئی
کشمیری گیت گا رہی تھی، اُس کے ہوش جاتے رہے۔ چنانچہ دوسرے
دن اس کے ماں باپ کو بے اِنتہا مہر بانیوں سے سرفراز کر کے اس
نازنین صورت کو اپنی ہم بستری سے عزت بخشی" (فارسی سے ترجمہ)

ان روایات پر مبنی مختصر اور متضاد بیانات کے بعد ۱۹۴۵ء
میں محمد دین فوق نے اپنی اردو تالیف "خواتین کشمیر" میں پہلی بار
حبہ خاتون کی سوانح پر تفصیل سے بات کی ہے جسکا ماحصل یہ ہے۔

چند ہار کے گاؤں میں ایک کسان عبدی راکھر رہتا تھا۔ اُسکے
یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اُس نے زون رکھا، اُس کی
خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُسے دُور دُور سے دیکھنے آتے۔
غریب باپ نے پہلے تو پانچ سال تک اُسے گاؤں کے ایک مُلّا کے
پاس "قرآن شریف" پڑھایا۔ پھر امام مسجد کو اُس کی عربی اور
فارسی تعلیم کے لیے اتالیق مقرر کیا۔ ایک ایسے گھر میں جہاں اس کے
سوا کوئی بھی شخص الف بے سے بھی واقف نہ تھا۔ اسکا مذہبی و

اخلاقی علوم پر مہارت حاصل کرنا لوگوں کی چہ میگوئیوں کا موضوع بن گیا۔ عبدی راتھر نے اپنی بیٹی کی ان علمی ترقیوں سے خائف ہو کر خاص کر جبکہ دور دور سے عالم و فاضل اُس سے ملنے آتے۔ اس کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک نوعمر لڑکے سے کر دی۔ یہ لڑکا نہ صرف ان پڑھ تھا بلکہ حد درجہ بد اخلاق بھی۔ زون نے اپنی ساس اور سُسر کے طعن و تشنیع کے باعث کتابوں کا مطالعہ چھوڑ دیا اور عملی طور پر کھیتی باڑی میں جُت گئی۔ لیکن اس کے حساس دل کو جو صدمہ پہنچا، وہ کشمیری اشعار کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک دن زون نے ایک صوفی خواجہ مسعود کو اپنے مصائب کی داستان سُنائی۔ اُس نے وقت و حال کے عالم میں اس کا نام حبہ خاتون رکھ دیا۔ ۱۵۷۰ء کی بات ہے کہ حبہ خاتون کھیت میں گوڈی کرتے ہوئے مقام عراق پر کوئی کشمیری گیت گا رہی تھی کہ یوسف شاہ کا وہاں سے گزر ہوا، وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور اُسے شوہر سے پانچ ہزار درہم کے عوض طلاق دلوا کر اپنی ازدواجیت میں لایا۔ اُس وقت یوسف شاہ کی عمر ۲۸ اور حبہ خاتون ۲۹ سال کے قریب تھی۔ اس کے بعد حبہ خاتون نے چودہ سال تک ملکہ کشمیر بن کر شاہانہ زندگی بسر کی۔

یوسف شاہ راگ رنگ اور نغمہ و سرود کا بے حد دلدادہ تھا، اسکے دربار میں کئی ماہر فن موسیقار تھے، جنکی تربیت سے حبہ خاتون نے تھوڑے عرصے میں موسیقی پر عبور حاصل کیا۔ پھر ان ہی موسیقاروں کی مدد سے فارسی موسیقی کے اصول و قواعد مرتب کئے اور اپنی کشمیری غزلیں جو کہ فارسی طرز پر تھیں، اس میں شامل کر لیں ۱۵۸۵ء میں

جب اکبر اعظم نے کشمیر کو فتح کیا اور یوسف شاہ کو گرفتار کر کے بنگال میں نظر بند کیا، اُس وقت مغل گورنر نے حبہ خاتون کی گرفتاری کا پروانہ جاری کیا تھا مگر وہ اس حکم سے پہلے ہی محلات شاہی چھوڑ اور فقیرانہ لباس پہن تارک الدنیا ہو گئی اور پاندہ چھوک کے مقام پر دریائے جہلم کے کنارے اپنی کٹیا بنالی۔ کچھ مدت کے بعد اس دُنیا سے رُخصت ہو کر اِسی جگہ دفن ہو گئی۔"

یہ حالات فراہم کرنے میں حضرت مہجور مرحوم محمد دین فوق کے معاون تھے، جسکا اعتراف مؤلف نے اِس مضمون کے تحتی نوٹ میں کیا ہے۔ مرحوم مہجور کی اِس معاونت کی اساس کسی تاریخ شہادت پر نہ تھی بلکہ جیسا بتایا گیا ہے، اُنہوں نے عام روائت کو یہ ایک خاص ترتیب دے دی تھی۔ بہرصورت مہجور مرحوم اور محمد دین فوق کی اِس ترتیب دی ہوئی کہانی کو حبہ خاتون کی سوانح کے طور پر اندرون و بیرون کشمیر میں تشہیر مل گئی۔

اِس ضمن میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی، کہ آزاد مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں اپنی کشمیری زبان اور شاعری میں حبہ خاتون کی سوانحی حالات کے متعلق حسن کو یہامی کے بیان پر صرف اتنی ایزادگی کی ہے کہ حبہ خاتون کا اصل نام زون اور اس کے شوہر کا نام عزیز لون تھا، حالانکہ اُنہوں نے اُس کی تحقیق کے سلسلے میں یہاں کا گاؤں گاؤں چھان مارا تھا۔ درحقیقت اس زون نام کی بنیاد حبہ خاتون کے اِس شعر پر رکھی گئی ہے۔

ع سی رِوان نالہ دیوان گٹہ پھپہٕ منتھ لوٗگ زوٗنہِ ستّے۔

(میرے والدین افسوس کرتے رہے کہ ہمارے چاند کو گہن لگ گیا ہے)۔
اس کے پیندہار گاؤں کی ہونے کا قیاس اس شعر پر کیا گیا ہے۔

مالِنِ مېٚون بیٚٹھی ژ ندہار چھُپیٚے

(میرا میکہ چیندہار بالا ہے)

باقی کہانی بیربل کاچرو اور حسن کھویہامی کے بیانات پر بڑے تکلفانہ انداز میں رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے جزئیاتی تفصیل کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے۔

آج سے کوئی چھ سو سال پہلے کشمیری ادب کی بنیادیں شیوست کی باکمال عارفہ للہ البنوری اور مذہب و تصوف کے بے مثال مبلغ حضرت نورالدین ریشی کے شطحات (واکھوں) سے اُستوار ہوتی ہے۔ اُن خارجی صبر آزما جھٹکوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو کشمیری زبان کو سہہ لینے پڑے نہ صرف کشمیری ادب کی ضخامت اور تنوع ہی حیران کن ہے، بلکہ یہاں کے شاعروں کی سخت کوشی اور غیر متزلزل ارادہ کی بھی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس وسیع شعری سرمایہ کا اکثر و بیشتر حصہ عشقیہ یا رومانی گیتوں اور غزلوں پر مشتمل ہے، جس کی طرح جہاں تک ہماری نظر کام کرتی ہے، حبہ خاتون نے ڈالی ہے۔

حبہ خاتون کی روح کو سمجھنے کے لئے اس تاریخی، معاشی اور معاشرتی فضا کو سمجھنا ضروری ہے جسمیں وہ رات دن سانس لیتی رہی کیونکہ ایک شاعرہ ہونے کے رشتے سے وہ اپنے وقت کی تاریخ اور ماحول کے اُتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے یہاں معیاری تاریخی معلومات کی

بڑی کمی ہے۔ جسکے باعث ہم جزئیاتی طور پر اخذ نتائج کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ پھر بھی ہم حالات کی مجموعی اثر انگیزی تک کچھ نہ کچھ راہ پا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ سولہویں صدی کے اُن پُر آشوب ایام میں تھی جبکہ کشمیر کے چک خاندان کی سلطنت زوال کی آخری ہچکی لے رہی تھی اور جس کو مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی ایک ہی یلغار نے ہمیشہ کی نیند سُلا دیا۔

مغلوں کی یہ یلغار ایک طرف سے کشمیر کی قومی آزادی کا ایک المناک مرثیہ و جنازہ تھی، دوسری جانب سے اُس وقت کے سماجی و معاشی حالات کے پیش نظر یہاں کے عوام کے لئے قدرے خوش آیند زندگی کی بشارت تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ مغلوں کے شاہی نظام کا قصر بھی جاگیرداری ہی کے ستونوں پر ایستادہ تھا لیکن ایک ملک کے قومی توازن اور حدبندی کے استحکام اور تحفظ کے لئے جس مرکزی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس میں غایت درجہ موجود تھی۔ اس کے برعکس کشمیر کی مرکزی حکومت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور بڑے بڑے جاگیردار بے پناہ اندرونی تضادات کا شکار ہو چکے تھے۔ اس اندرونی اُلجھن کے نتیجے میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں قیامت کی دھاندلی مچی ہوئی تھی۔ روز نت نئی آویزشیں، تازہ دم سازشیں اور ختم نہ ہونے والی خانہ جنگیاں اُدھم مچا رہی تھیں، کوئی سے دو جاگیردار صبح متحد ہو کر شام کو دست و گریبان ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

اسی صورت حال کی شروعات شہمیری خاندان کے سلطان فتح شاہ کے زمانہ ۱۵۱۴ء میں ہو گئی تھیں جبکہ وہ ملک کو چار حصے کرکے

تین حصے سرخیل جاگیرداروں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمد شاہ کے وقت ۱۵۲۹ء میں یہ ملکی تقسیم پانچ تک پہنچ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ نازک شاہ کے زمانہ ۱۵۴۰ء میں مرکزی بادشاہت بالکل برائے نام رہ گئی۔ چنانچہ ۱۵۵۴ء میں جب علی چک نے دربار عام میں اس خاندان کے آخری تاجدار سلطان شاہ کے سر سے تاج شاہی زبردستی اُتار کر اپنے بھائی غازی چک کے سر پر رکھا تو بادشاہ کو مجالِ دم زدن بھی نہ ہوئی۔

چکوں کے عہد حکومت میں اگرچہ یہ ملکی تقسیم اِس ڈھنگ پر باقی نہ رہی، پھر بھی قومی توازن کا وہ بگاڑ جو کہ یہاں کے سیاسی ڈھانچے کو متزلزل کر رہا تھا، اُن کے ہاتھوں سے بھی نہ رُک سکا۔ یہاں تک کہ ہر وہ تبدیلی جو کہ اِس ڈھانچے میں اصلاح کے خیال سے کی جاتی تھی زوال و انحطاط ہی کی داخلی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ ایسے نامساعد سیاسی حالات میں حبہ خاتون نے جنم لیا تھا۔

اِس گھناونی تصویر کا ایک اور بھی رُخ تھا اور وہ یہ کہ شیعہ وسُنی فسادات کے باعث سارے ملک میں ایک افراتفری اور ہل چل مچی ہوئی تھی۔ دونوں جانب سے بے شمار خون خرابہ ہو رہا تھا۔ یہ شیعہ تحریک ملک کے پانچ حصے کرنے والے سلطان محمد شاہ کے وقت ہی شروع ہوئی اور اساسی طور پر سادات کے اقتدار کے خلاف جنگو اور سلطنت میں زبردست دست اندازی تھی، ایک بغاوت تھی۔ چک بھی اِس تحریک میں شامل ہوئے اور اس کو اپنے حصول اقتدار کا ذریعہ بنانے لگے۔

سادات کا اقتدار چھن گیا اور حکومت (شاہی تخت و تاج تک) چکوں کے ہاتھ میں آگئی، لیکن ملک کا نظم و نسق اور امن و امان کسی ٹھکانے نہ لگ سکا، کیونکہ اب دوسرے جاگیردار جن میں سادات بھی شامل تھے، ان کے خلاف صف آرا ہوکر اپنے اقتدار کے خواب دیکھنے لگے۔ اس صف آرائی کا نتیجہ یہ تھا کہ یوسف شاہ چک کے وقت میں سید مبارک شاہ بیہقی نے جو کہ سادات میں ایک بارسوخ شخصیت تھی، تخت شاہی پر قبضہ کرلیا، اگرچہ یوسف شاہ چک جلد ہی اس کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایسے گلے سڑے نظام کے بدلے اُس وقت ایک ایسی حکومت کی ضرورت لاحق ہوگئی تھی جو کہ اندرونی تضاد کے شکار ان جاگیرداروں کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ کر کے ملک کو ایک مستحکم اور واحد نظام کے تحت لائے، مغلوں کی تسخیر نے بے شک یہ فریضہ انجام دیا۔

●●

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

علامیت اور قصے

قصّہ کی تاریخ انسان کے احساسات اور جذبات کی تاریخ ہے مختلف ممالک کے قدیم ترین قصّوں کے موضوعات میں جو مشابہت ملتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا تعلق انسان کی بنیادی جبلتوں سے ہے۔ شروع میں خوف، حیرت، مسرت اور دوسرے جذبوں کا سادہ اور معصومانہ اظہار ہے اور وحشی تخیّل کی ایک معمولی پرواز ــ خوف نے انسان کو فوق فطرت اور روحوں تک پہنچا دیا۔ حیرت اور خوف اور پھر ذہانت نے دیوتاؤں کے بہت سے مجسمے تراشے ۔ انسان نے حیرت سے چاند اور سورج کو چلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا ان میں بھی زندگی ہے۔ ستاروں کی روشنی میں دیوتاؤں کی آنکھوں کی روشنی نظر آئی، سات ستاروں میں کبھی ریچھ[1] اور کبھی رشی کی صورت دیکھی گئی، سمندر کی موجوں، آگ کے شعلوں اور طوفان کی آوازوں نے مختلف دیوتاؤں کے وجود کا احساس دلایا، چونکہ ان میں طاقت زیادہ تھی، ان میں زور زیادہ تھا، شدّت زیادہ تھی اس لئے انسان ان کی تسخیر نہ کرسکا۔ وہ بڑی قوتوں پر ایمان لے آیا، توہمات سے ایک پُراسرار فضا کی تعمیر ہوئی، آسمانوں میں دیوتاؤں کی جنگ، سے سمندر میں طوفان آیا۔ ان کی ناراضگی اور ان کے

---

[1] EDMUND FULLER, BULFINCH'S MYTHOLOGY (INTRODUCTION) P.14

غیظ سے زلزلے آئے۔ ہری بھری کھیتی تباہ ہو گئی، قحط سے آدمی اور جانوروں کی ہڈیاں چور ہو گئیں، دیوتاؤں کی خوشی کھیتوں میں اناج لائی، دیوتاؤں کی مہربانی سے خوفناک جانوروں کا شکار کھیلا گیا۔ دیوتاؤں نے مُردوں کو زندگی دی اور فصل کٹنے پر انسان نے رقص اور قربانیوں سے دیوتاؤں کو خوش کیا۔ یہ تمام باتیں تصوّرات اور حسی تصوّرات (Psychic Images) کی تعمیر و تشکیل کی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ خیالات کی علامتوں سے علیحدہ الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تصوف میں ابتداء سے علامتوں کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ مختلف اشاروں، استعاروں، پیکروں اور تشبیہوں کی ایک تنظیم کسی نہ کسی صورت میں ملے گی۔ اظہار کے لئے علامتیہ کا سہارا ضروری ہے۔

زبان، مذہب، دیومالا، آرٹ، فلسفہ اور انسانی زندگی کے ہر لمحے میں علامتوں کا استعمال ہوتا ہے، توہمات نے جب معمولی چیزوں کو غیر معمولی بنا دیا تو یہ غیر معمولی چیزیں بھی علامتیں بن گئیں۔ معمولی باتیں رمزیت کے ذریعہ پُراسرار بنتی رہی ہیں۔ سگمنڈ فرائیڈ[1] کا خیال ہے کہ خدا کے وجود پر اعتبار دراصل بیٹے اور باپ کے پرانے تعلقات کی تجدید ہے۔ لہذا خدا ایک علامت ہے (بیٹے میں باپ کے لئے) جو کشش ہوتی ہے وہی کشش مذہب کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے اور یہی مذہب کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین نفسیات مذہب کو انسان کی فطرت اور انسان کی بنیادی خواہشوں کو سمجھنے کی کوشش بتاتے ہیں۔ فرائیڈ تیبو (TABOO) قدیم انسان کی پرستش کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سمبل کی بنیاد لی بیڈو (Libido) ہے۔ لاشعور کی پوشیدہ خواہشوں کا اظہار علامتوں، اشاروں اور تشبیہوں میں ہوتا ہے۔ ان سے لاشعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے دیومالا، آرٹ اور مذہب، خواب اور ہذیانی کیفیتوں میں لاشعوری تمناؤں کے

[1]: S. FIREND, TOTEM AND TABOO

سمبل میں ینگ (JUNG) نے خواب کے تجزیہ میں نسلی لاشعور کے بے شمار اشارون اور علامتوں کو دیکھا ہے[۱]۔ اس نے نسلی لاشعور پر سوچتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کے بے شمار خیالات اور حسی تصورات صرف اس کے ذہن کی پیداوار نہیں یا صرف ان کے ذہن کے عناصر نہیں بلکہ پوری انسانی نسل ان کی تخلیق کی ذمہ دار ہے۔ اس خیال کے سہارے کے لئے اس نے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس نے دیومالا اور قدیم قبیلوں اور انسانی فطرت کا مطالعہ کیا تھا، اس کا خیال ہے کہ دیومالا انسانی فطرت کا ابتدائی اظہار ہے اور انسانی خیالات اور حسی تصورات کا گہرا تعلق انسان کی مختلف نسلوں سے ہے[۲]۔ حیرت انگیز خوابوں کے تجزیے کے لئے اس

[۱] ۔ ینگ نے تحلیل نفسی کے نظریہ میں بنیادی تبدیلی کی ہے۔ فرائڈ اور ایڈلر کے خیالات اور تصورات سے اس نے شدید اختلاف کیا اور بعض بنیادی باتوں کی تردید کی شروع میں فرائڈ کے خیالات سے بے حد متاثر تھا لیکن رفتہ رفتہ تحلیل نفسی میں تلازمی امتحان (ASSOCIATION TEST) کا اضافہ کیا اس نے نفسی قوت کی ہمہ گیری پر زور دیا۔ مثالی شخصیت (ARCHETYPE) کی تشریح نہایت ہی دلچسپ انداز میں کی۔ ایک فن کار فرد کی حیثیت سے اور ایک فرد فنکار کی حیثیت سے کیا درجہ رکھتا ہے۔ اس مسئلہ پر اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے —— ینگ کا نقطۂ نظر انتہائی فلسفیانہ ہے۔ ذہن ایک متحرک قوت ہے اور شخصی لاشعور کے علاوہ ایک اجتماعی یا نسلی شعور بھی ہے جس میں انسان کے تمام تاریخی تجربات کا حاصل محفوظ ہے۔ نفس کی طرف انسان کے داخلی اور خارجی رجحانات کو سمجھانے کے لئے اس نے ایسے خوابوں کی طرف اشارے کئے ہیں جن کے واقعات سے پہلے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ وہ جذباتی ہم آہنگی اور داخلی معنی کی حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے لی بیڈو (Libido) کا تصور موجودہ زندگی میں ہماری دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ نفسیاتی اعمال میں وہ وجدان فکر، جذبہ اور احساس سب کا قائل ہے۔ فن کار حسی تصورات کے سہارے گفتگو کرتا ہے۔ ینگ صرف واہمے (FANTASY) کا نہیں بلکہ واہمے کی تخلیقی اہمیت کا بھی قائل ہے
(شکیل الرحمان)

[۲] ROBERT A. CLARK, TALKS ON JUNG'S PSYCHOLOGY.

نے دیومالا اور قدیم قبیلوں کی زندگی پر نظر رکھی۔ اس کے پاس ایسے بھی بہت سے مریض آئے جن کا قدیم قبیلوں اور ان قبیلوں کی تہذیبی زندگی کے مذہبی سمبل اور حکایتوں سے کوئی تعلق نہ تھا جن کی ان سے کوئی واقفیت نہیں تھی لیکن ان کے خوابوں کا گہرا تعلق ان اشاروں اور حکایتوں سے تھا۔

سمبل اور تلمیحوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے (رابرٹ کلاک نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ بے شمار تاریخی اشارے اور سمبل خوابوں کے سہارے سامنے آئے ہیں۔ تہذیب کی رفتار سے اس کا خطرہ ہے کہ تمام مذہبی، تاریخی اور قومی اشاروں اور سمبل کی تیزی اور شدت کم ہو جائے گی) وجدانی تصور کو ینگ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، انیما (ANIMA) یعنی مرد کا وجدانی تصور اور اینی مس (ANIMUS) یعنی عورت کا وجدانی تصور۔ چونکہ وجدانی تصور سے دونوں جنس کی نفس کا مختلف طریقوں سے بھی اظہار ہوتا ہے لہٰذا اس نے انہیں اس طرح تقسیم کیا ہے، ان سے حسی تصورات کا بھی گہرا تعلق ہے مذہب، دیومالا اور مختلف حکایتوں میں عورت ہمیشہ حسن، عقل اور محبت کی دیوی بن کر سامنے آئی ہے۔ ینگ نے ریڈر ہگگارڈ کے ناول "شی" (SHE) کی مثال پیش کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں انیما کی مکمل صورت ہے۔ "وہ جس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔" یہ جملہ ہی ہمیں حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خوابوں میں ماں یا کوئی عورت ڈائن بن کر آتی ہے اور پریشان کرتی ہے۔ انیما میں کبھی زاری رجحان بھی ہوتا ہے مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلس کی کہانی "سمندر کی شہزادی" جس میں ایک نوجوان مرد ایک مچھلی نما عورت کے ساتھ سمندر کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے۔ یہی حال اینی مس کا ہے۔ عورتوں کے خوابوں میں اینی مس مردوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ خوبصورت اور بہادر مرد نمودار ہوتے ہیں۔ 'اینی مس' باپ، بھائی، عاشق اور شوہر کو خواب میں پیش کرتی ہے۔ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو بھی سامنے لاتی ہے۔ بے شمار عیسائی عورتوں نے ایسے خواب دیکھے ہیں جن

میں ان کی شادی حضرت عیسیٰ سے ہوتی ہے۔ نظم کے ہیرو اور ہر دلعزیز افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، اور شاعروں کی شخصیتیں بھی خواب میں اسی طرح آتی ہیں۔

مذہب میں دائروں، زاویوں اور مربعوں کی جو اہمیت ہے اسے ہم جانتے ہیں۔ دائرہ تو ایک عام اشارہ ہے۔ ایرانیوں نے دائروں میں مقدس آگ روشن کی، مندروں میں آج بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ مربع میں قدیم انسان کے ذہن نے بہت کچھ دیکھا۔ ہندوستان میں جب نوشہ پہلی بار سسرال جاتا ہے تو وہ ایک چوکی پر بیٹھتا ہے۔ چوکی ایک قدیم علامت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ عیسائیوں میں مقدس باپ بھی چار ہیں۔ ہوا۔ پانی اور آگ کے علاوہ مٹی کی بھی اہمیت ہے (۴ کی اہمیت) بُدھ مذہب اور خصوصاً تبت میں دائرہ اور مُربع کی قدر و قیمت پر غور کیا جائے تو قدیم اِنسان کے ذہن کے ارتکاز کو سمجھا جاتا ہے۔ بدھ مذہب نے چار سچی باتوں کی طرف اِشارہ کیا ہے۔ ایشیا میں پرستش کے صوفیانہ طریقوں میں بھی رمزیت اور سمبل کام کر رہے ہیں۔ قدیم انسان نے مختلف چیزوں کو نام دیئے، یہ نام بھی علامتیں ہیں۔ علم ریاضی اور آرٹ بھی علامتوں کے سہارے زندہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان اشاروں کی تشریح چاہیے، جذباتی اُلجھنوں کی پیش کش کے لئے کچھ تصویریں سامنے لائی گئیں۔ الفاظ جب جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو مکمل تصویریں بنتی ہیں۔ اور یہی علامیت کی معراج ہے۔

وحشی انسان کی زبان اور اظہار میں ہم سے زیادہ جذباتیت تھی، یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قدیم اِنسانی زندگی میں ایسا بھی دور آیا جب کہ انسان نے گیتوں کی زبان میں گفتگو کی ہے، آج دنیا کی جس زبان میں کم سے کم الفاظ میں بڑی بڑی حقیقتوں کا اظہار ہوتا ہے اس زبان میں علامیت کا عروج ہے۔ اِنسان کے احساسِ جمال کو سمجھنے کے لئے زبان، مذہب، دیومالا، فلسفہ اور مختلف علوم پر نظر ضروری ہے، ہر جگہ جمالیاتی علامتوں کا ہجوم ہے۔ معمولی اِشاروں اور جمالیاتی علامتوں میں جو شے فرق پیدا کر دیتی ہے، وہ ہے:

وجدانی کیفیت، جمالیاتی علامتوں میں وجدانی کیفیت زیادہ کام کرتی ہے

علامیّت (SYMBOLISM) تہذیب و تمدن کی بنیاد ہے۔ علامیت نہ ہو تو کوئی تہذیب یا کوئی تمدن پیدا نہیں ہو سکتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ علامیت کے بغیر تہذیب و تمدن کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر تہذیب اور تمدنی قدریں رمزیت اور علامیت کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہیں؟ قدیم یونان میں شہر (CITY) سے محبت کا جو جذبہ ملتا ہے اس کا تعلق دراصل دیومالا کی "ماں" سے ہے۔ "شہر" "ماں" کا ایک لاشعوری اشارہ ہے۔ لہٰذا شہر کی محبت "ماں" کی محبت کی نمائندگی کرتی ہے۔ "انجیل" اور قرآن حکیم میں تمثیلیں ہیں، حضرت سلیمان کے نغمۂ حیات اور قدیم عہد نامے میں نغمۂ داؤد کا مطالعہ علامتوں کی مدد کے بغیر نہ ہو گا۔ اس طرح یہ مطالعہ اور دلچسپ بھی نہ ہو گا۔

قدیم قصوں کا مطالعہ سمبلزم اور علامیت کا مطالعہ ہے۔ جہالت کو قبول نہ کرنے کا جذبہ، خوف و حیرت، چاند کے دھبے کو دیوی سمجھنا پھر بچوں کو بہلانے کے لئے ایک بوڑھی عورت سے تعبیر کرنا) علم نجوم، اقتصادیات، فلسفہ اور تاریخ سے دلچسپی تمام لوگوں کو نہیں ہوتی، آرٹ سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان کی تمام دلچسپی وابستہ ہے۔ حقوق کی بنیاد میں چونکہ انسانی تجربے کام کر رہے ہیں اس لیے ان کی حیثیت ابدی ہے، تاریخ فلسفہ اور اقتصادیات کو بھی ان سے مدد ملتی ہے، قصوں میں خیالات اور احساسات، تجربے اور مشاہدے، تخیلات اور نہ جانے سب ہوتے ہیں۔ یہ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ کوئی کچھ کہتا ہے، اپنا تجربہ بیان کرتا ہے تو ہم سنتے ہیں کسی قدیم انسان کو سانپ نے کاٹ لیا ہو گا تو تڑپتے ہوئے انسان سے بھی کچھ لوگوں نے واقعہ سننا چاہا ہو گا۔ سانپ نے کہاں کاٹا، وہ جنگل میں کس جگہ تھا کیوں گیا تھا۔ اس کے بعد واقعہ بیان کیا گیا ہو گا۔

اس طرح ہم سوچیں تو کہانی کی بنیاد انسان کی ابتدائی زندگی کے

دھندلکے میں گم ہے۔ غیر معمولی اور دل چسپ واقعات کو سُننے کی خواہش انسان میں پہلے سے موجود ہے، ایک فرد کے انفرادی اور اجتماعی دونوں تجربوں کی صورتیں موجود ہیں۔ قدیم قصوں میں یہ دونوں تصویریں نمایاں ہیں ایک فرد جب اپنی ذات سے نکل کر سماجی زندگی میں جذب ہو جاتا ہے۔ تو اس کے تجربوں کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ "یہ ریچھ یا یہ جانور کس نے مارا؟" جنگ میں کیا ہوا۔ اس کے بچے کی صورت کیسی ہے۔ "وہ کس طرح ہلاک ہوا۔" بیج کس طرح ڈالے گئے؟ اِس قسم کے سوالات کہانیوں کو پیدا کرتے رہے ہیں۔ اشارتی زبان میں جو کچھ کہا گیا در اصل وہ قصوں کی اِبتدائی صورتیں ہیں۔ پھر واقعات کے بیان میں تفصیل سے کام لیا گیا، ایک ایک منظر کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے الفاظ سے زیادہ سے زیادہ مدد لی گئی۔ اور پھر قصوں میں علامتوں نے حقیقتوں کو شامل کرنے میں زیادہ مدد کی۔ انسانی کلچر میں رفتہ رفتہ کرداروں کی کمزوری اور طاقت سے نقطہ نظر کا بھی اظہار ہوا۔ واقعات کے بیان میں بھی نقطہ نظر کام کرتا رہا۔ جب قصوں نے فن کی صورت اختیار کرلی ہے تو ہم قدیم ذہن کو ان کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قصوں کے واقعات کو تاریخ نے بھی جگہ دی، اس لئے کہ اس میں خارجی زندگی اور سماجی زندگی کی عکاسی ہے۔ مذہب، سیاست اور فلسفہ نے بھی ان کی اہمیت پر غور کیا۔ ذہنی کشمکش، دماغی اُلجھنیں، جذبات کے اُتار چڑھاؤ اور مختلف جذبات کے اظہار نے قصوں کو ماہرین نفسیات کی دل چسپی کا بھی مرکز بنا دیا ہے۔ قوّت اظہار نے حسیات اور ماحول کی تفصیل کو واقعات میں جذب کر دیا، انسانی کلچر میں قوتِ اظہار کا مطالعہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح قصوں کی تکنیک میں آہستہ آہستہ آہستہ تبدیلی آتی گئی ‡

پروفیسر محی الدّین حاجنی

کشمیری لوک ادب کا خاکہ

یہ تو ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر ادب ایک تہذیبی عمل ہے اور تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا رہونِ منّت نہیں۔ اس میں قوم کی زندگی کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ رائے ادب کی تمام اصناف میں سے لوک ادب پر سو فیصدی درست ثابت ہوتی ہے کیونکہ ادب کا یہی حصّہ عوام یعنی ہر ملک کی اکثریت کا ذہنی سرمایہ رہا ہے۔ اس میں ان کی اُمنگوں کی آئینہ داری اور ان کے خوابوں کی تصوّراتی تعبیر محفوظ رکھی گئی ہے۔ اسی میں ان کے ابتدائی فلسفیانہ خیالات طرزِ معاشرت اور کشمکشِ حیات کے متصادم عناصر تمثیلی رنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اسی لئے لوک ادب کے صحیح مطالعہ اور گہری تحقیق سے متعلق کہا گیا ہے کہ محقق داخلی اور روحانی معنوں میں عوام کے ساتھ مدغم ہو جائے۔ ان کی ہی سطح پر ان کے عادات و اطوار رسوم و تقریبات یہاں تک کہ اُن کے اکثر عقائد کا تجربہ کرتے وقت ان ہی کی طرح سوچتے اور ان ہی کی طرح خیر و شر اور نفع و نقصان کا معیار مقرر کرے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو حتی الامکان پیشِ نظر رکھ کر جب ہم کشمیری زبان کے لوک ادب کا ہلکا سا خاکہ کھینچنے کی کوشش کریں گے تو ہم یہاں باقی ممالک کے لوک ادب کی طرح چند ایسے خواص پا سکیں گے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ذہنی ارتقا میں ہر قوم قریب قریب ایک سی قسم کی واردات سے دوچار ہوئی ہے۔ شعوری کیفیت

بنیادی طور ایک ہے۔ اور نقوش مختلف و متنوع۔ اسی لئے آپ ہمارے ادب میں جاہلانہ وہم پرستی سے لیکر الٰہیات تک ہر قسم کا مواد موجود پائیں گے جن سے ایک طرف تو ہمارے اجتماعی شعور کی تاریخی نشاندہی ہوتی ہے اور دوسری طرف ہمارے سامنے چند ادبی قدریں آتی ہیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ بدلتی ہوئی نظر نہیں آتیں مثال کے طور پر آپ عہد قبل از تاریخ میں نیل مت پر ان کا کوئی قصہ لیجئے یا عہد تاریخی میں ہیمال۔ ناگرائے کا رومان دونوں میں اگرچہ تکنیک اور مقصد ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ لیکن دونوں غیر شعوری طور ایک ہی روایت کے پاسبان نظر آئیں گے۔ وہ یہ کہ کشمیر کا تخیل خارجیت سے زیادہ داخلیت کی طرف مائل رہا ہے۔ اغلب ہے کہ اس کی توجیہہ یہ ہو کہ یہاں کے سر بفلک پہاڑ، رنگ بدلتے ہوئے چشمے اور باقی سحر آفریں مناظر قدرت۔ سادہ لوح ذہن میں غیر معمولی رجحانات (ABNORMAL TENDENCIES) اُبھارنے کے ذمہ دار رہے ہوں اور بقول ماہرین نفسیات اُنہیں غیر معمولی رجحانات کا آخری مُرقع یہاں کے دیومالا کا تانا بانا ہو جو ہمارے لوک ادب کو ڈھانپے ہوئے ہیں لیکن یہ مانتے ہوئے بھی کہ ابتداء میں ماحول ہی نے ایک قصہ کو پیدا کیا ہو۔ جس میں کسی اجتماعی خواب کی ادبی تصویر پیش کی گئی ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان غیر تاریخی قصوں میں کائیناتی مسائل کے علاوہ علی العموم ان دنوں کے لئے یا تو مثالی زندگی کی آرزو مضمر ہوگی یا ہمیشہ جوان رہنے کا کوئی خیالی نسخہ۔ یہ بھی نہ سہی تو ظاہر و باطن کے باہمی تعلقات پر ضرور کوئی اخلاقی تمثیل ہوگی جس کا مقصد سماجی اصلاح یا ذہنی سرور آفرینی ہوگا۔

ہمارے لوک ادب میں زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر آج تک ہزاروں دیومالائی قصے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ ہر بڑی جھیل مثلاً شیش ناگ۔ کونسر ناگ۔ نیلہ ناگ یا اکثر پہاڑوں مثلاً ہرمکھ۔ ہرمکھ۔ ہاری پربت کے ساتھ ایک نہ ایک داستان وابستہ ہے۔ جس کی تصدیق کے لئے پُرانے عہد میں صرف اس قدر اشارہ ہی کافی ثبوت

تھا کہ ہندو دھرم یا بدھ مت کے کسی عقیدہ سے ان کا تعلق تھا۔ لیکن پندرہویں صدی میں اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی مجموعی طور پر ہمارے لوک ادب میں غیر طبعی عوامل کا اثر مقابلتاً گھٹتا گیا۔ بایں ہمہ چند قصے ہو بہو زبان زدِ عوام رہے۔ ان میں سے زیادہ دِل پسند قصہ جھیل وُلر سے تعلق رکھنے والا قصہ اکہ نندن اور پرگنہ شہیان سے تعلق رکھنے والے رومان ہی مال ناگرائے ہمارے ذہن میں آج بھی موجود ہیں۔ اول الذکر قصے کو کئی ایک مقامی شعراء بالخصوص بہادر گنائی اور رمضان بٹ نے اور مؤخر الذکر کو ولی اللہ نے منظوم کیا ہے۔ پندرہویں صدی کے بعد ہماری لوک کہانیوں کے نہ صرف کردار بدلتے گئے بلکہ ہماری طرزِ ادا بھی نکھرنے لگی۔ اس عہد تک ہمارے ادراک کی سطحیت زیادہ نمایاں تھی۔ اور اب ہمارے عوامی ادب میں ایک خاص رچاؤ پیدا ہونے لگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہمارے لوک ادب پر ایران کا اثر غالب رہا۔ اس ادبی اتصال نے ہمارے خیالات کو ایک نئی کسک دی اور ہم نے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے ماڈل پر ہمیوری تولری اور یوسف شاہ وحبہ خاتون کے رومان مقامی تاریخ سے ڈھونڈ نکالے۔ زبان کی کوتاہ دامنی کے سبب اگرچہ ہم تولری اور حبہ خاتون کو لیلیٰ اور شیریں کے منصب عشق تک پہنچا نہ سکے پھر بھی تاریخی شخصیتوں کے کارناموں میں رومانوی اور افسانوی رنگ بھر دینا فی نفسہٖ ایک حوصلہ افزا ادبی کاوش ثابت ہوئی۔ ایران چونکہ مافوق الفطرت امور کی انجام دہی جنات کا قائل تھا اس لئے اس سلسلے میں ہمارے لوک ادب میں کمی ہونے کی بجائے کئی جنات کا اضافہ ہوا۔ ہم نے جنگلوں میں بیہ بان، سنسان ویرانوں میں دیو، سیلاب اور مقامات پر مشران۔ دلدلی زمینوں پر دلف، برفانی میدانوں میں برم برم چوک اور دِل ربا چشموں میں کئی قسم کے بھوت تعینات کر دئے۔ علیٰ ھذا القیاس جہاں عہد قدیم کے لوک ادب میں آج کے ہیلی کوپٹر کا کام وُتھہ پژنگ کے ذمہ رکھا گیا تھا۔ وہاں اب شتر مرغ نے عام ہوائی جہاز کا کام سنبھالا۔ جہاں پہلے غیبی ہاتھوں میں سوہ ڈ بڑور بعہ ڈ بڑور نامی دو

مدت کی رو بھٹی ہوئی بلبلوں کو تصور کیا گیا تھا جو کثیر التعداد مقامی کہانیوں میں گمشدہ ماؤں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ جہاں ایرانی اثر کے بعد خضر و الیاس ہمارے لوک ادب میں آگھسے لیکن اس جناتی اثر پذیری کے بعد بھی ہمارے اکثر قصے مجموعی محض تصوراتی نہیں بلکہ عملی زندگی سے متعلق ہیں۔ یہاں تک کہ بعض داستانوں میں ہماری قومی اُمنگوں کا ایک تمثیلی ریکارڈ موجود ہے۔ مثلاً یکھے خاں نامی کہانی میں جہاں محکوم کشمیری کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعض اوقات ایک نادار محض ماحول کی اتفاقیہ ہم نوائی سے سماج کے بلند ترین منصب پر ظاہر ہو سکتا ہے۔

عوامی ادیبوں میں سے جن کی نظر "وسعت پسند" نہ تھی۔ اُنھوں نے داستانوں کے بجائے پہیلیوں اور محاورات میں عوامی ذوق کی ترجمانی کی اور جن کو ادیب ہونے کا دعویٰ ہی نہ تھا اُنھوں نے مثالی چٹکلوں کے ذریعے تفریح کا سامان بہم پہنچایا۔ اور اسی زمرے میں ہمارے کئی ایک کردار پیدا ہوئے۔ جن میں ہمارا مقامی لال بجھکڑ، بیرہ ڈار اور ہمارا مقامی مرزا کلیم "جمہ نیا یک" آتے ہیں ان کی ذات کے گرد تمام مزاحیہ و طنزیہ لطیفے جمع کر دئے گئے جو ہر ادب میں ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے لوک ادب کا نثری حصہ ہمیشہ سے منتشر رہا ہے۔ حاتم تیلوانی کی اُن کہانیوں کے بغیر جو سٹین صاحب نے جمع کیں اور رومی رسم الخط میں چھپوائیں ہمیں زمانۂ حال تک اپنے بکھرے ہوئے ادبی سرمایہ کو مرتب کرنے کی توفیق ہی نہیں ملی۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی دفعہ ہمیں اپنی غفلت کا احساس ہوا جس کے نتیجہ میں چند ایک کتابچے مثلاً کنی کتھ وغیرہ میں ہمارے لوک ادب کے نثری حصے کو مدون کرنے کی کوشش کی گئی۔

پراگندہ نثر جو داستان گویوں کی یادداشت کا رہین منت رہا ہے کے علاوہ ہمارے لوک ادب کا ڈرامائی حصہ (لوک ناٹک) آج تک صرف اُن پڑھ بھانڈوں کے رحم و کرم پر رہا ہے۔ یہ ڈرامے نہ کبھی لکھے گئے اور نہ ازبر

کئے گئے صرف ان کا پلاٹ ذہن میں رکھا گیا اور ہر زمانے میں بھانڈ ایکٹروں کو اس میں کمی بیشی کی کھلی اجازت ملی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں ان کے اندر مزاح، ہزل اور فحش کلامی کے سوا کچھ بھی نہ رہا۔ اس لئے ڈرامائی فیچروں کے عام ہوتے ہی یہ حصہ قریب قریب مدفون ہوا۔ حالانکہ ان کے تنقیدی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں یہ دیہاتی معاشرہ اور حاکم و محکوم کے باہمی تعلقات پر کافی سبق آموز ثابت ہوئے ہوں گے۔

ہاں کشمیری لوک ادب کا شعری حصہ بہت حد تک زمانے کی دست برد سے بچ نکلا ہے۔ اس میں خواتین کا حصہ ممتاز ہے۔ ان کی لوریوں میں اگرچہ دُعا اور آرزومندی کا عنصر غالب ہے لیکن شادی بیاہ کی تقریب پر ونؤن نامی گیتوں میں مدح اور فنائیت کی دل آویز آمیزش ہوتی ہے۔ ونؤن میں دیہاتی عورتیں سختی سے پرانی تکنیک پر قائم ہیں اور تاحال شہری خواتین کے جدید اثر سے محفوظ رہ (بزبان سرینگرت) نامی گیت خاص تہواروں بالخصوص رمضان کے مہینے میں دو رویہ لائن باندھ کر کھڑے کھڑے گائے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر اوقات تہواروں کی عظمت کے سلسلے میں منقبت کا رنگ غالب رہتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی خانگی امور کی معاشی استحصال بلکہ بعض اوقات ان میں جنسی اشارات بھی ملتے ہیں۔ حال ہی میں مقامی شاعروں نے رہ اور ونؤن کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے اور اگرچہ ان کی کوشش ابھی عام نہ ہو سکی پھر بھی اب ان دونوں طرزوں میں سنجیدگی، لطافت اور موسیقیت آنے لگی ہے۔

دیہاتیوں میں جو گیت چھکری کی لے پر آئے یا معنی کے لحاظ سے ہلکے پھلکے ثابت ہوئے تو فوراً قبولِ عامہ حاصل کر گئے چنانچہ موسم گرما میں اکثر اوقات برفانی پہاڑوں پر چرواہے کی نغمہ سرائی ترائی میں کسانوں کی آواز سے ہم نوا سنائی دیتی ہے۔ کڑاہارا اور گاؤں کا نوجوان بانکا

المختصر ہر کس و ناکس موسیقی اور عوامی شاعری سے یکساں محظوظ ہوتا ہے بالخصوص اگر عوامی گیتوں میں سماجی تصویر کشی ہو۔ چنانچہ اس رجحان طبع کے سبب ہمارے لوک ادب میں لڈی شاہ صنف نامی مزاحیہ طنز ہمیشہ سے پسند کیا گیا ہے۔ زمانۂ حال تک جنوبی کشمیر میں کلی شاہ اور شمالی کشمیر میں کلوسہ کے کئی گھرانے اس صنفِ سخن کے فیض سے اپنا اوزقہ بہم پہنچاتے تھے۔ ہزمیہ ہزلیات میں اگرچہ ہمارے لوک شاعر جیب ساد ھنے کے قائل نہ تھے لیکن جب وہاں صاحب سنگرامہ ایسے تیز زبان ہجو نگار منصہ شہود پر آئے تو عریاں گوئی اور ہجو میں بہت کم فرق باقی رہا۔ چنانچہ اسی لئے ہمارے لوک ادب میں وہ تمام ہزلیہ و ہجویہ منظومات وغیرہ مطبوعہ رہیں جن سے معاشرہ میں اطمینان پیدا ہونے کے بجائے اختلال کا زیادہ خدشہ تھا۔

آخیر میں اپنے لوک ادب کے مجموعی ماحصل کو دیکھ کر ماننا پڑے گا کہ جہاں تک عوامی شعور کے توضیح کا تعلق ہے ہم کسی صورت میں تہی مایہ نہیں — لیکن جہاں تک تکنیک بدلنے، نئے نقوش تراشنے، لوک ادب کو جدید فنی بلندیوں پر پہنچانے کا تعلق ہے۔ ہم ابھی ابتدائی منازل سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے نثر میں زیادہ حقیقتیں ایسی ہیں جو بقول کسے پرچھائیوں کی طرح ہیں اور یہ پرچھائیاں سب کچھ بن کر بھی ٹھوس صورت اختیار نہیں کر سکتیں۔ اور ہمارے شعری لوک ادب میں اگرچہ زندگی کے نشیب و فراز کی اچھی خاصی تفصیل موجود ہے لیکن پھر بھی اس میں دُنیا کی فانی ہستی کا خوف خطرناک حد تک چھایا ہوا ہے اور اس قسم کا منہاج عقل بہر صورت منفی نتائج کی طرف ہی مائل رہتا ہے۔ بالخصوص جب کہ ہر ملک کا لوک ادب علم کے بجائے زندگی کا زیادہ محتاج رہا ہو۔ لہٰذا جب تک ہماری نئی تخلیق موت سے زیادہ زندگی کا مقصد پیشِ نظر نہ رکھے ہمارے لوک ادب میں پختگی آ سکے گی نہ زبان میں وسعت پیدا ہو سکے گی۔ اور نہ تخیل میں متانت و دلآویزی کا عنصر بڑھ سکے گا۔

رحمان راہی

مہجور اور آزاد

مہجور ہمارے پہلے شاعر ہیں جن کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کشمیری شاعری کو تصوف کی بھول بھلیوں سے باہر نکال لانے اور رسول میر کی روایات کو بڑھاوا دیکر فطرت کے قریب لانے کی جو کوششیں کر رہے تھے ان میں ان کے شعور کا بھی دخل رہا ہے۔ مہجور کی خود اپنی شاعری معیار پسندی اور تجربہ سازی کا ایک متحرک اور غیر یکساں عمل ہے۔ مہجور کے گیتوں میں ہمیں موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے بیک وقت روایت اور جدت کی باہمی تکرار ملتی ہے۔ ایک طرف تو وہ سوچھ کرال اور احد زرگر کی قبیل کے شعرا کے صوفیانہ اور دینیاتی موضوع اور اُن کے تمثیلی رمزیہ اور ایک حد تک مبہم اسلوب بیان سے دامن بچاتے ہیں تو دوسری طرف سے اپنی جدت طرازی کے لئے رسول میر کی مجازی شگفتہ روایات کے دامن تھام لیتے ہیں لیکن جو چیز مہجور کو عظمت بخشتی ہے وہ اُن کی وسعت طلبی ہے۔ رسول میر کی شگفتگی کی ناکامی محسوس کرتے ہوئے مہجور نے کشمیری شاعری کے موضوع اور انداز بیان کو جو کشادگی عطا کی ہے اس کے پیش نظر انہیں بجا طور سے دورِ حاضر کے شعراء کا امام مانا جاتا ہے

مہجور ہماری اپنی صدی کے شاعر ہیں۔ اور یہ صدی عالم گیر پیمانے پر بے نظیر اور دُور رس انقلابات کی آماجگاہ رہی ہے۔ خود ہماری ریاست کی ان متنوع توتوں

کو اسی صدی میں پہنچنے کا موقع ملا ہے جن ہاتھوں میں آج کل ایشیا بھر میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک جوان ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کے بالخصوص گذشتہ تیس پینتیس سال کشمیری قوم کی سیاسی، سماجی اور تمدنی بیداری کے لحاظ سے نہایت اہم رہے ہیں۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں کشمیری شاعری پہلی بار سِنِ شعور کو پہنچی اور آس پاس کی دُنیا کا جائزہ لے کر اپنا مقام پہچاننے لگی اور کشمیری شعرا مجموعی طور پر اپنی شعر گوئی کو روحانی تصرّف اور وجدان والہام کے علاوہ ایک باقاعدہ فن کی صورت میں دیکھنے لگے۔

کلام مہجوؔر کی جدّت طرازی اور کشادہ دامنی کا اندازہ اِس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ اُنہوں نے شاعری کی دیوی کو اپنے پیش رَو صوفی شعراء کے تنگ و تاریک غاروں سے نکال کر وادیٔ کشمیر کی شاداب چراگاہوں اور مشک بیز پھلواریوں میں پہنچا کر عام اِنسانوں سے متعارف کرایا۔ اور اسے ان کا ہی لب ولہجہ سکھایا۔ حسن وعشق کا موضوع کشمیری شاعری میں بھی بہت پُرانا ہے لیکن مہجوؔر تک پہنچتے پہنچتے یہ ایک پھیکی اور رسمی چیز بن کر رہ گیا تھا۔ اور پھر فارسیت کے غلبے نے تو اسے اور بھی سپاٹ اور بے جان بنا ڈالا تھا۔ مہجوؔر نے اِس فرسودہ موضوع کو اپنے تجربے کی آنچ دے کر اور اپنے زِندہ جذبات کی دھڑکتی ہوئی زبان عطا کرکے ایک بار پھر حقیقی آرٹ کے قالب میں ڈھال لیا۔ اُنہوں نے رسول میر کی خارجی شگفتگی کو اپنی داخلی رومانیت سے آمیز کر دیا۔ اور حبہ خاتون ارنہ مال اور محمود گامی کی سادگی، نرم روی اور سوز میں پُرکاری، شوخی و نشاط کا اضافہ کر دیا۔ مہجوؔر نے اگرچہ پرانی عشقیہ شاعری کی اس فرسودہ رسم کو توڑنے کی کوشش نہ کی۔ جس کے مطابق اظہارِ محبت ہمیشہ عورت کی ہی زبان سے ہوتا تھا لیکن اس سے ان کے کلام کی سچائی کو ضرب نہیں پہنچتی کیونکہ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر ایک زبان اور ہر ایک زمانے کا ادب اپنی اپنی رسموں کا پابند ہوا کرتا ہے۔ مہجوؔر کی کشادہ دامنی کا احساس گیتوں اور غزلوں سے ہٹ کر

ان کی نظموں سے اور بڑھ جاتا ہے۔ موجودہ کشمیری شاعری کی ایک نمایاں بلکہ حاوی صنف مختصر نظم ہے اور نظم نگاری کا یہ سلسلہ بھی باضابطہ طور پر مہجور ہی سے شروع ہوتا ہے۔ مہجور کی نظموں میں ہمیں کشمیر کی قومی، سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی کے وہ بہت نقوش ملتے ہیں جنہیں موجودہ صدی نے اُبھارا ہے۔ اُن کی عشقیہ شاعری کا نرم آہنگ گداز ماحول اور رومانوی لہجہ ہمیں ان کی اکثر نظموں میں بھی ملتا ہے۔ مناظرِ فطرت سے متعلق نظمیں ہوں یا دیہاتی زندگی کی عکاسی سے بھرپور نغمے دونوں میں مہجور کی ارضی دِل چسپیوں کا رقص اور اُن کے رومان پرور تخیّل کی خوشبو ملتی ہے۔ کچھ نظمیں تو ایسی بھی ہیں جن میں اُن کے سیاسی افکار اور سماجی تجربات ہنگامی اظہار کے لئے اس قدر بے چین دکھائی دیتے ہیں کہ مہجور نہ تو اپنے فن پر قابو رکھ پاتے ہیں اور نہ جذباتیت کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ مہجور کی ایسی قومی اور سیاسی نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جو اِس ہنگامی جذباتیت اور نعرہ بازی کا شکار ہوکر فن کی تخلیقی وحدت، دیرپا حُسن اور عالم گیر اپیل سے محروم رہ گئی ہیں۔ ایسی نظموں میں نہ تجربے کی قربت اور گرمی پائی جاتی ہے۔ نہ کشف و الہام کی گیرائی اور نہ ہی موضوع و ہیئت کی آپسی کش مکش میں اُبھرتے ہوئے کسی متحرک وجود کا احساس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے خیالات کو بحر اور ردیف و قافیہ کی مدد سے نظم کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری خیالات اور نظریات یا عقاید وغیرہ کو محاسن شاعری اور صنایع برامع سے آراستہ کرکے نظمانے کا نام نہیں خیالات، نظریات اور عقائد بدل جاتے ہیں فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ اور بعض صورتوں میں مکروہ بھی بن جاتے ہیں لیکن شاعری ہمیشہ زندہ، توانا اور حسین رہتی ہے۔ مہجور کی مذکر الذکر نظموں میں سے متعدد نظمیں ہمیں ابھی سے باسی محسوس ہونے لگی ہیں۔ ان میں وہ ہمہ گیر ادبی صداقت نہیں جو زمان و مکان کی حد بندیوں سے بے نیاز ہوتی

ہے۔ شاعری اپنی زندگی کے لیے اپنے پیچیدہ اور مُرکّب وجود سے باہر کسی بیرونی چیز کی محتاج نہیں ہوتی ہر ایک تخلیقی فن پارہ اپنی ایک آواز اور خود مختار زندگی رکھتا ہے۔ وہ جس صداقت کا حامل ہوتا ہے اُس کی سچائی کا ثبوت خود اس کا اپنا وجود ہوتا ہے

نیتھہ گٹہ گوس بیدار کتیٔ کتیٔ جیر یوٗتُھن گوم
زُوئم زہ وندہ سوز تیوٗ یر تو نیوٗ و سونت کالن
زٲلہ لارہ وُچھکھ حال وندہ ہے وارہ ؛ چھیرہ ہے رَدے
گلہ زیوٗ متے گیمٕ اوٚنش ہوٚتُھم دورایہ ونے کیا

ہجور کے یہ اشعار کسی خیال، نظریے یا عقیدے کا پرچار نہیں کرتے بلکہ ان کے شاعرانہ تجربے اور کشف کی اس طرح سے تشکیل کرتے ہیں کہ ہم اُن کی شدّت و قربت کو محسوس کر کے ایک عجیب عالم انبساط میں انہیں خود بخود ایک ابدی حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر موضوع کے لیے استعمال کیا گیا اسلوب نہ صرف موزوں بلکہ ناگزیر دکھائی دیتا ہے۔ شاعر انفرادی تجربے اور نرالے کشف کے اسی خود بخود قائل کر دینے والے ناگزیر اور فرحت بخش اظہار و انکشاف کا نام ہے۔ برعکس اس کے جب ہجور — "نیے ترآوو ماے ہتھاوِہ یانہ وآنی" کا سبق دینے لگتے ہیں تو باوجود اس کے کہ ان کا خیال انسان دوستی حُب الوطنی اور ترقی پسندی کی نمایندگی کرتا ہے اور پھر مختلف محاسن شاعری سے آراستہ بھی ہے۔ وہ فن کی تخلیق نہیں کرپاتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی محبِّ وطن سیاست دان کی تقریر کو ذاتی ردِ عمل اور رویہ ظاہر کیے بغیر محض اِس غرض سے نظم کی ظاہری صورت دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ رباب و ساز نگ پر گائی جا سکے۔ نظم میں ذاتی تجربے کی حرارت اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ ہمیں کہیں بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ نظم میں شاعر کا اپنا وجود (INVOLVE) رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اس کے ڈکشن میں بھی شدّتِ احساس سے پیدا ہونے والی وہ خصوصیت نہیں جسے ہم اسلوب کے ناگزیر ہونے سے تعبیر کر چکے ہیں۔

واوِ صبحاک سُلہ اوس لاران
تنبہ لیژُن کستام ژھاران
خندہ پوشو کرس جایہ جایے
پایہ بڈِہ میانہِ یاوَن رایے

یوُ دِسہُ دلبر مرِش، تراٰوِ نتھ سیوُد مَتے کُن کرہ بے نظر
ژشراوِنس زن ہیٚ بو یھو لہ یادِنس ژھیوُہ مارہ ہا

٥

نوہ ہرُ تہ چھیندہ ریہژُ مَوُل ونان چھ واوس
داماٚنہ میون پیٚمی چھوُل تس زانہہ تراز آ سیا

ہم آج بھی مہجوؔر کے اِن فنّ پاروں سے محظوظ ہو لیتے ہیں حالانکہ ان میں نہ تو کوئی فلسفیانہ خیال ہی ہے نہ کوئی سیاسی سبق اور نا ہی کسی نظریئے یا عقیدے کی تبلیغ۔ اس کے برعکس

مُلکہ مُنژہ کُڈِتھ تو کھیم واہ گیرائیہ کُنژُت چھ جان
اسی سنَتا نَو گرہ پیٚنُن یم نیرِ تَن ساری نہیر
غاٚرتس سائنس کُریو تھِہ کُوت کالاہ اِمتحان
اُسی مَروِ غاٚرَن کھوژن تل زانہہ تہ نوم راوِو پنہیر

اِنتہائی بے جان، بے کیف معلوم ہوتی ہے۔ مہجوؔر کی نظم "نو کہ جار" کے بانپن میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے لیکن ان کی ایک دوسری ولولہ انگیز نظم "وَنہ لوہا باغ و انو" ابھی سے افسردہ ہونے لگی ہے مہجوؔر کی اس ننّی کوتاہی کی ذمّہ داری اُن کے سیاسی موضوعات پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ کیونکہ ایک طرف تو اُنہوں نے "گرالو یوُ دیژ اگاشں"

اور آزادی کے عنوان سے بڑی کامیاب سیاسی نظمیں کہی ہیں اور دوسری جانب "نولکی گلزار نولکی آبشار رولیس نوتھان بھنڈار" جیسی مردہ رومانی نظم بھی لکھ ڈالی ہے۔

انتخاب موضوع کی اہمیت سے انکار کئے بغیر ہم بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتے ہیں کہ فنی کامیابی کا اصل دار ومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ فن کار کسی حد تک حقیقت کو اپنے انفرادی اور نرالے تجربے کی دہکتی ہوئی بھٹی میں تپا کر احساس کی شدّت، جذبے کی حرارت اور کشف وعرفان کی تربت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کی کتنی بھرپور سعی کرتا ہے۔ فنکاری محض وجدان والہام کا نام نہیں اس میں ریاضت اور مشاہدہ بھی شامل ہے۔

ہجور کی مذکورہ فنّی ناکامی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے موضوع کو اپنے تخیّل میں اپنا ذاتی تجربہ اور نرالا کشف بنا کر اُسے ایک ناگزیر اسلوب بیان نہیں عطا کر پاتے۔ وہ حقیقت کو بیان کرتے ہیں اُس کا انکشاف نہیں کرتے۔

اس نہایت ہی مختصر جائزے میں میں نے جان بوجھ کر ہجور کے فن پر قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے ایک تو اس لئے کہ شعری تخلیق کی ماہیت اور شاعری کی کامیابی وناکامی کے بارے میں جن امور کا ذکر ہجور کے سلسلے میں آچکا ہے۔ اُن کی روشنی میں دورِ حاضر کے دیگر شعری کارناموں کو سمجھنے اور پرکھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے اور دوسرے اس لئے کہ وہاب پرے سے قطع نظر ہجور کے ہاں ہمیں اس تجربہ کار کی پہلی بار قابل توجہ پیمانے پر کوششیں نظر آتی ہیں جسے ہم دورِ حاضر کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔

ہجور نے حسن وعشق کے موضوع سے آگے بڑھ کر قومی، سیاسی اور اقتصادی موضوعات کی پیش کش کے لئے گیتوں اور غزلوں کے علاوہ ترانے اور نظمیں لکھ کر جس نوطرحی کی ابتدا کی اس کی تاریخی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی اور جب کبھی اس

ہجرت طرازی نے تخلیقی فنکاری سے فیض پایا ہے کشمیری شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اس مہجور کی جدت پسندی کے پیچھے نہ تو روایات کے ناکمتفی ہونے کا اتنا گہرا احساس تھا اور نئی سمتوں میں جانکلنے کی وہ جرأت جس کا اندازہ ہمیں عبدالاحد آزاد کی شاعری میں ہوتا ہے۔ آزاد فی الواقع کشمیری شاعری کے پہلے باغی شاعر ہیں جنہوں نے روایتی موضوعات اور ماضی کے جانے پہچانے اندازِ بیان سے ہٹ کر اپنے دور کی پیچیدہ زندگی کی ترجمانی کے لئے بڑے پیمانے پر اور بلند آہنگ بغاوت سے کام لیا۔ آزاد کی شعوری فضا میں وہ بہت ہی مختلف آوازیں گونج رہی ہیں جن سے عہد جدید کے انسان کی پُر آشوب ذہنی اور روحانی زندگی عبارت ہے۔ وہ بہت سی مختلف قدیم روایات و اقدار کی صداقت و افادیت کے بارے میں سوال بھی کرتے ہیں۔ اُنہیں شک کی نظروں سے بھی دیکھتے ہیں اور ان میں سے بعض کے خلاف کھلم کھلا بغاوت بھی کر اُٹھتے ہیں۔ ان کی حُریت پسند رُوح غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتی ہے۔ ان کا انسان دوست ضمیر مذہبی تعصّبات اور سماجی نابرابری پر کڑھتا اور احتجاج کرتا ہے۔ ان کا روشن ذہن عالم گیر انسانی مساوات اور امن و آشتی کی یقین دہانی کرتا ہے۔ یہ باتیں کشمیری شاعری کے لئے نئی تھیں۔ ان کے مناسب فنی اظہار کے لئے کوئی اعتماد آفریں روایات قائم نہیں ہوئی تھیں۔ فی الواقع کشمیری زبان کو اظہار و بیان کی ان آزمائشوں سے گزرنے کی نوبت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ لل دید سے لے کر مہجور کے زمانے تک جو موضوعات کشمیری شاعری کی فضا پر چھائے رہے ان میں اکثر صوفیانہ جذبات و تجربات، حسن و عشق کی واردات اور ایک حد تک داستان گوئی کو برتری حاصل رہی۔ آزاد کو عہد جدید کے انسان کی ترجمانی کے لئے اپنی زبان اور اپنے ادبی سرمائے کو نئے سرے سے کھنگالنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اپنی سیمابی شخصیت کے اظہار کے لئے بیان کے نئے

قالب ڈھالنے کی صبر آزما کوششیں کرنا پڑیں۔ کشمیری شاعری کی تاریخ ارتقا میں آزاد کا مقام متعین کرتے وقت ہمیں اُن کے حقیقی شعری کارناموں کی فنی عظمت پر اصرار کرنے کی بجائے ان کے تنقید شعور کی اُٹھان اور وسعت تخلیقی اُپیج اور جرأت مندی سے فیض حاصل کرنا چاہئے۔

آزاد ہمارے گلستانِ شاعری کی اُن کلیوں میں سے ہیں جو کھلتے کھلتے مُرجھا گئی ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اپنی نہایت ہی مختصر زندگی میں آزاد نے جو جدید طرز کی تخلیقات ہمارے سامنے رکھیں ان میں سے اکثر عارضی نوعیت کی ہیں۔ وہ ایک اہم اور بلند تخلیقی پرواز کے لئے اپنی تخیل کے پَر تول رہے تھے کہ بے وقت موت نے اُنہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ "دریاو" اور شکوہ ابلیس" جیسی تخلیقات گواہ بنتی ہیں کہ آزاد کی شخصیت میں کشمیری شاعری کا بہت ہی اہم شاعر پنپ رہا تھا۔ چھوڑے سے پائی ہوئی روایات کی حدوں میں رہ کر اور کبھی کبھی ان کی نوک پلک دُرست کرنے یا اُن میں اپنی توانا شخصیت کا رنگ روپ بھرنے میں آزاد جس فنی چابکدستی سے کام لے سکتے تھے اس کا ثبوت "سنگرمالہ" میں شائع شدہ متعدد غزلوں اور گیتوں اور پان ژادر، ارہ ول اور شیمہ ماتی جیسی نظموں سے ملتا ہے ؎

عزیز کاشمیری

صحائف اور ادب العالیہ کے کشمیری تراجم

کشمیر ایک پہاڑی ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور سارے کشمیر کی کوئی ایک ہی زبان نہیں ہو یا ہیں ہمہ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی روزمرہ کی زبان کشمیری ہے اور ریاست کے دوسرے حصوں میں پہاڑی، ڈوگری، پنجابی، گوجری، بلتی وغیرہ زبانیں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ کشمیری زبان کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں بلکہ یہ فارسی رسم الخط میں پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ اس کا تلفظ بھی مختلف علاقوں میں مختلف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ اردو زبان آسان، عام فہم اور ہمہ گیر زبان ہے اس لئے فی زمانہ کشمیری پڑھنے اور سمجھنے کی بہ نسبت اردو کا پڑھنا، لکھنا اور سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے، اور کشمیری زبان اپنے طور کوئی ترقی نہ کر سکی اور نہ یہ زبان صحائف اور ادب العالیہ کو وسیع پیمانوں پر پیش کر سکی۔ کیونکہ جب منظم طور اس زبان کو ترقی و وسعت دینے کی طرف توجہ ہی نہیں دی گئی تو یہ لٹریچر کیسے پیدا کر سکتی ہے؟ اور پھر یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اردو کی ترقی اور وسعت کے مقابلے میں یہ زبان ماند پڑ گئی ہے۔

پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کشمیری زبان بالکل مردہ زبان ہے۔ جس میں کسی قسم کا کلاسیکل ادب یا مذہبی صحائف کے تراجم موجود نہیں ہیں

نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ علم دوست اور صاحبِ ذوق اشخاص کے علاوہ مذہبی مشنریوں نے اسے مالامال کر رکھا ہے۔ اور بہت سی کتابوں کے باقاعدہ کشمیری ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں چند ایک کتابوں کا مختصر طور ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے:-

انجیلِ مُقدّس:

یہ وہ مشہور کتاب ہے جو حضرتِ مسیح ناصری علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے اور آپ کے حواریوں نے آپ ہی کی طرف منسوب کی ہے۔ اس میں دراصل حضرت مسیحؑ کی زندگی کے واقعات اور آپ کی تعلیمات درج ہیں۔ اناجیل اگرچہ چار ہیں یعنی (۱) متی (۲) مرقس (۳) لوقا (۴) یوحنا —— لیکن کشمیری زبان میں ۱۸۸۲ء میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور کی طرف سے جو ترجمہ شائع ہوا ہے اُس میں ان چار اناجیل کے علاوہ رسولوں کے اعمال، پولوس۔ یعقوب۔ پطرس۔ یوحنا اور یہودا کے خطوط اور یوحنا کے مکاشفہ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ سب مسیح علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ کشمیری ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے اور سوا آٹھ سو (۸۲۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ اتنی بڑی ضخیم کتاب اعلیٰ کاغذ پر نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کرنا مسیحی مشنریوں ہی کا کام تھا، کسی اور کے بس کا ہرگز نہ تھا۔

"نور العیون":

ترجمہ کشمیری عَمّ یَتَسَاءَلُونَ مطبوعہ ۱۳۲۲ھ صفحات ۴۰

(قیمت) ۴/

قرآنِ کریم کے تیسویں اور آخری پارہ "عَمّ" کا یہ لفظی ترجمہ حاجی حافظ مولانا مولوی محمد یحییٰ صاحب نے کیا ہے جو مطبع اہلِ حدیث امرتسر میں چھپا ہے۔ قرآنِ پاک کا آخری پارہ اگرچہ مطالب و معانی کے لحاظ سے بہت ہی دقیق ہے لیکن یہ ترجمہ مُستند نہیں بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہے اور

تحت اللفظ۔ شانِ نزول بھی مختصراً درج ہیں اور بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم کا ترجمہ کسی بھی جگہ نہیں، اگرچہ یہ ہر سورت کے آغاز میں آتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص محی الدین خان، آف نہال پورہ اسلامیہ ہائی سکول میں بطورِ استاد کام کر رہے تھے۔ جس نے سارے قرآن شریف کا ترجمہ کشمیری زبان میں کیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کا دماغ خراب ہوگیا، اور یہ ترجمہ میر واعظ خاندان کے ہاتھوں میں آگیا۔ جس میں سے مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم میر واعظ نے پارۂ عم ——— (زیرِ تذکرہ) شائع کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ اسی ترجمے کو اب میر واعظ محمد یوسف شاہ نے مقبوضہ کشمیر میں شائع کر دیا ہو۔

کلچرل اکیڈیمی کا بیان ہے کہ ایک سو سال پہلے ایک اور کشمیری نے قرآنِ شریف کا مکمل ترجمہ کیا ہے۔ جسے اکیڈیمی حاصل کر کے مناسب ترمیم کے ساتھ شائع کرنے کا بندوبست کر رہی ہے۔

کاشُر تفسیر:-

کلامِ پاک کے آخری پارے کا کشمیری زبان میں ترجمہ ——— مؤلفہ مولوی نورالدین صاحب قاری، ضخامت ۴۶ صفحات۔ قیمت فی کاپی ۸/

یہ بھی قرآنِ پاک کے آخری یعنی تیسویں پارے کا کشمیری ترجمہ ہے جس میں تفسیر بھی درج ہے۔ یہ مشہور کشمیری عالم مولوی نورالدین قاری کشمیری نے کیا ہے، جو اسلامی عقائد، "کاشر مسئلہ کتاب" کے بھی مؤلف ہیں۔ یہ ترجمہ مستند ہے اور مشہور پبلشر غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب سرینگر نے غالباً ۱۹۲۳ء میں شائع کیا تھا۔

آج کل اس کا دوسرا ایڈیشن بھی متذکرہ پبلشر سے مہیا ہو سکتا ہے جو موہن پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع ہوا ہے، بڑی تقطیع پر عربی متن کے سمیت شائع ہوا ہے اور زبان بامحاورہ ہے

"شریمد بھگوت گیتا":

یہ اہل ہنود کی مشہور مذہبی کتاب ہے جسمیں شری کرشن جی مہاراج نے اپنے ایک شاگرد ارجن کے سوالات کے جوابات دئے ہیں۔ اور فلسفۂ حیات بیان کیا ہے۔ اس کا کوئی مکمل کشمیری ترجمہ راقم کی نظروں سے نہیں گزرا۔ البتہ سُننے میں آیا کہ شری کرشن جُو نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اب کے مارکیٹ میں بھگوت گیتا کے کشمیری ترجمہ کے چند ایک جز چھوٹی تقطیع پر شری سروانند کول صاحب پریمی کی طرف سے شایع ہوئے ہیں۔

"مسدس حالی":

مولانا حالی پانی پتی کی معرکتہ الآرا نظم "مد وجزر اسلام" سے کون واقف نہیں؟ اُسی کا کشمیری منظوم ترجمہ پروفیسر غلام محی الدین صاحب ایم۔ اے آف حاجن نے کیا ہے۔ موصوف کو علم وادب پر کافی عبور حاصل ہے اس لئے آپ کے ترجمہ میں وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہیں جو اصل نظم میں موجود ہیں۔ اس ترجمے کے اکثر اقساط ماہ نامہ "گل ریز" سرینگر کے دورِ اول میں شائع ہوچکے ہیں۔ لیکن کتابی صورت میں شایع ہونا باقی ہے۔[1]

بہا اللہ تہٕ "نوو زمانہٕ":

ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

یہ بہائیوں کی مشہور کتاب "عصر جدید" مصنفہ جے۔ ای اسلمنٹ کا ترجمہ ہے جسے محمد امین کامل نے سلیس اور بامحاورہ کشمیری زبان میں کیا ہے اور محفل ملی روحانی ہی کی طرف سے ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا ہے۔ اس میں بہائی مذہب کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آئینہ حقیقت یعنی مختصر تاریخ فقہ وحدیث حصۂ اول:

یہ سیرۃ النعمان مصنفہ علامہ شبلی نعمانی کا مختصر ترجمہ ہے جو مسٹر

---

[1] یہ کتاب کب کی منظرِ عام پر آچکی ہے۔ (م۔ ی۔ ٹ)

غلام محی الدین صاحب ہنڈو نروری نے اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں ۱۳۴۳ھ میں طبع کرا کر شائع کیا ہے۔ ترجمہ سلیس کشمیری نثر میں ہے لیکن کتاب کا دوسرا حصہ معلوم نہیں شائع ہوگیا ہے کہ نہیں۔

مثنوی مولانا رومیؒ:-

مولانا رومیؒ (۱۲۰۷ء سے ۱۲۷۳ء) نے تصوف پر فارسی زبان میں جو مشہور و معروف مثنوی تصنیف کی ہے۔ اس کے دفتر اول کا ترجمہ جناب شمس الدین حیرت پانپوری نے کیا ہے لیکن تاحال شائع نہیں ہوا ہے۔

"گلستانِ سعدی":-

سعدی شیرازی کی مشہور ادبی و اخلاقی تصنیف "گلستان" کا ترجمہ مرزا غلام محمد بیگ صاحب آف اسلام آباد نے کرنا شروع کیا تھا اور چند اقساط جریدہ "گل ریز" سرینگر میں بھی شائع ہو گئے تھے۔ بیان کے مطابق ترجمہ مکمل نہیں ہوا ہے اور نہ ہی شائع ہونے کی سردست کوئی اُمید ہے۔

"شاہ نامہ کشمیری":-

ترجمۂ شاہ نامہ فردوسی از فردوسیٔ کشمیر عبدالوہاب پرے حاجنی

یہ ترجمہ دس حصوں میں شائع ہوگیا ہے جس کی مجموعی ضخامت ۷۲۸ صفحات ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء کے دوران یہ مشہور کشمیری پبلشر غلام محمد نور محمد کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

ترجمہ منظوم ہے۔ روانی اور الفاظ کی بندش و چستی خوب ہے موصوف نے حمید اللہ صاحب اسلام آبادی کی مشہور تصنیف اکبر نامہ کا بھی فارسی سے کشمیری میں ترجمہ کیا ہے۔ جو رزمیہ شاعری کا مثالی نمونہ ہے۔ شاہ نامہ فردوسی کے اردو اور کشمیری تراجم کشمیر کے اکثر و بیشتر دیہات میں لوگ انتہائی دلچسپی اور شوق سے پڑھا کرتے ہیں۔

"گلشن بے زوال":- سرزمین پنجاب کی مشہور داستانِ عشق "سوہنی مہیوال"

کا کشمیری ترجمہ ہے جو ۱۳۰۴ ہجری میں اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں طبع کرا کر غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب سرینگر نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ غلام محی الدین پیر نے منظوم کشمیری میں کیا ہے اور کشمیر کے اکثر علاقوں میں اشتیاق سے پڑھا جاتا ہے۔

آرائشِ محفل کا کشمیری ترجمہ "حاتم نامہ":۔

یعنی حاتم طائی کی سخاوت وغیرہ سے متعلق افسانوی کتاب جس کا ترجمہ سات حصوں میں خواجہ محمد صدیق اللہ عرف تراگ ساکنہ چرار شریف نے کشمیری نظم میں کیا ہے اور غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب سرینگر نے رفیق عام پریس لاہور میں طبع کرا کر شائع کیا ہے۔

"انتخاب الف لیلہ":۔

مشہور افسانوی کتاب الف لیلےٰ کے انتخاب کا ترجمہ بھی پروفیسر غلام محی الدین صاحب حاجنی نے کشمیری نثر میں کیا ہے جو تاحال شائع نہیں ہوا ہے۔

"ژھائے":۔

ناروے کے مشہور ناول نگار البسن کے شاہکار بھوت (GHOST) کا کشمیری ترجمہ اختر محی الدین نے کیا ہے جسے کلچرل اکاڈمی شائع کرنے والی ہے[1]

"اوتھیلو":۔

انگریزی زبان کے مشہور ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیئر کے لاثانی شاہکار اوتھیلو کا کشمیری ترجمہ شری دینا ناتھ نادم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور ایک باب کا ترجمہ اُنھوں نے "تعمیر" میں بھی شائع کیا تھا۔ لیکن پھر آپ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

---

[1] یہ ترجمہ "ساہتیہ اکاڈمی دہلی" کی طرف سے شائع ہو کر آ گیا ہے

"ترانۂ خلدان یا قمر الزمان" مُصنّفہ غلام احمد بشیر مرحوم
یہ کتاب بھی الف لیلے میں مندرج ایک عشقیہ داستان کا منظوم کشمیری ترجمہ ہے جو غلام محمد نور محمد پبلشر کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

اِن کے علاوہ ممکن ہے اور بھی کتابوں کے کشمیری ترجمے شائع ہوئے ہوں اور راقم کی نظروں سے نہیں گزرے ہوں۔

کشمیری زبان کو وُسعت و فروغ دینے کا رجحان اب روز بروز لوگوں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کشمیر کلچرل اکادمی کشمیر یونیورسٹی اور دوسرے ادارے بھی کشمیری زبان میں مشہور کتابوں کے تراجم شائع کرنے کا اِرادہ رکھتے ہیں۔ ایسے میں اُمید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں کشمیری زبان بھی گنج ہائے گراں مایہ اور بیش بہا علمی اور ادبی لٹریچر کے ذخیرے کی مالک ہو گی ✦

خواجہ ثناءاللہ بٹ

خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

(روزنامہ کالم سے اقتباسات)

بے چارے نانبائی کا جلوس نکالا گیا

اللہ جانے سچ کیا اور جھوٹ کیا، لیکن آپ نے بھی وہ کہاوت سُنی ہوگی کہ ـــــ بارہ مولہ میں ایک اُونٹ نے کسی کی کپاس کھائی تو اس کی سزا زندہ دلانِ اسلام آباد نے اپنے ہاں کے ایک دُھنیئے کو دی یعنی اس بے چارے کی ناک کاٹ لی ـــــ یہ کہاوت مجھے آج اِس واقعہ کی بنا پر یاد آگئی کہ ـــــ کل اسلام آباد میں بے چارے ایک نانبائی کے گلے میں اُس کی بنائی ہوئی روٹیوں کا ہار پہنایا گیا اور پھر اس کا جلوس نکالا گیا۔ قصور اس کا یہ تھا کہ اُس نے اپنی روٹیوں کا وزن کم رکھا تھا ـــــ تھا بڑا بد دیانت، بے چارہ آخر اس زمانے میں جبکہ کم تولنے اور جھوٹ بولنے کا رواج عام ہے اِس اسلام آبادی نانبائی کو نہ معلوم کیا سُوجھی کہ اُس نے بھی دوسروں کا مقابلہ کرنا چاہا ـــــ بھلا وہ بھی کوئی واعظ تھا کہ منبر پر چڑھ کر جھوٹ بولتا اور زندہ باد کے نعرے سنتا ـــــ کوئی لیڈر تھا کہ سٹیج پر چڑھ کر جھوٹ بولتا اور پائندہ باد کی صدائیں سُنتا ـــــ کوئی شیر گجری تھا کہ دودھ میں پانی ملا کر زیارتِ بیتُ اللہ کے لئے جاتے وقت اہلِ جلوس سے اللہ اکبر کے نعرے وصول کرتا ـــــ کوئی انجینیر تھا کہ عُمر بھر رشوت

دے کر ریٹائرمنٹ کے بعد اوقافِ اسلامیہ میں نظر آتا —— کوئی ڈاکٹر تھا کہ صدر ہسپتال میں دو برس کی نوکری پر دو عدد عالی شان کوٹھیاں تعمیر کر لیتا —— وہ بے چارہ تو نانبائی تھا —— کم از کم اپنے ذرائع، وسائل، اثر رسوخ اور اپروچ کا جائزہ لیتا —— اُسے نہ چاہئے تھا کہ وہ روٹیوں کا وزن کم رکھتا ۔

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

سُنا ہے کہ —— اپنے شہرِ ناشاد کے لوگ آج کل میچ خُوب دیکھتے ہیں، ہاکی کا میچ ہو یا فٹ بال کا سرینگر سٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے لوگوں سے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب یہاں اِسی قسم کے میچ پسند کئے جاتے ہیں۔ اب نہ تو لوگوں کو کسی سیاسی میچ سے دلچسپی ہے اور نہ سماجی بُرائیوں کے میچ کی طرف توجہ دینے کی فرصت، سیاسی کھلاڑیوں نے بھی اپنے عوام کے دِلوں کا حال بھانپ لیا ہے، اِس لئے وہ آپس میں میچ کھیلنے کی بجائے چُپکے سے تماشائیوں کی صف میں جا بیٹھتے ہیں اور جب اُن کا جی چاہے سٹیڈیم میں فٹ بال میچ دیکھنے جاتے ہیں یا پھر نمائش میں جا کر تقسیم انعامات کی رونق بڑھاتے ہیں اور کبھی کبھی مچھلیوں کا شکار کھیلنے جاتے ہیں۔ خُدا معلوم سچ کیا جھُوٹ کیا، ایک صاحب نے بتایا ہے کہ شہر میں ایک جگہ چرسیوں کو اپنے تکیے کا صدر منتخب کرنا تھا تو اُنہوں نے ایک لیڈر کو اپنی اِس تقریب پر بُلایا چنانچہ لیڈر صاحب وقتِ مقررہ پر تکیے میں پہنچے اُن کے سامنے چرسیوں نے اپنے صدر کا انتخاب کیا اور اِس لیڈر کے ہاتھ سے اپنے نئے صدر کی دستار بندی کروائی۔ اس کے بعد چرسیوں نے گشتابہ دی گریٹ سے اِس لیڈر کی خاطر تواضع کی اور مجلس برخاست ہونے کے بعد دم مارو دم کے خصوصی اجلاس میں اِس لیڈر کی جمہور نوازی کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا گیا —— میں نے جیسا سُنا، بالکل ویسا آپ کو پیش کر دیا۔ آگے حضور مالک ہیں ۔

تو کونسی بدلی میں میرے چاند ہے آجا

شہر میں سبزی فروشوں نے سبزیاں غائب کر کے اِن کے بھاؤ بڑھا دئے تو لوگوں کے لئے سبزیاں عید کا چاند ہو گئیں ـــــ اور آج جب پولیس اُن چالیس سبزی فروشوں کو جیل خانے سے گاڑیوں میں بٹھا کر عدالت میں لے آئی تو احاطہ عدالت میں اُن کے رشتہ دار، بھائی بند، دوست احباب اِس طرح اُنہیں دیکھنے کے لئے آ گئے جیسے لوگ عید کا چاند دیکھنے کو اُمڈ آتے ہیں لیکن جب ـــــ پولیس کی گاڑی اُنہیں لے کر احاطے میں آئی تو ملزم اپنا منہ کچھ اس طرح چھپا رہے تھے کہ جیسے اُنہیں پولیس کی گاڑی کی بجائے گدھے کی پیٹھ پر اور اس کی دُم کی طرف منہ کر کے بٹھا کر لایا گیا ہو



آج میں سکریٹریٹ گیا تو وہاں بھی لوگوں کا بھاری ہجوم دیکھنے میں آیا اور وہ سب بے چارے سکریٹریٹ کی طرف نظریں جمائے کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے کہ جیسے وہ عید کا چاند ڈھونڈ رہے ہوں ـــــ اور اپنی سرکار کے سر کی قسم، سکریٹریٹ میں بھی یہ حالت تھی کہ سنٹری، انجنیر اور اہلکار سب کے سب عید کا چاند ہو چکے تھے ـــــ اور ہجوم عالم بے قراری میں مجسمۂ انتظار تھا کہ شاید کسی نہ کسی چاند کی ایک چھوٹی سی جھلک دربار مُو کی بدلی سے نکلتے ہوئے نظر آئے اور سائلوں کی عید ہو جائے ۔

اے لوگو! کیا تم اُمیّد کر سکتے ہو کہ

یہ جو سرکاری ملازمین کے الاؤنس میں اِضافہ ہو گیا ہے کیا اس سے اپنے ہاں! بڑھتی ہوئی رشوت ستانی ـــــ بڑھتی ہوئی بدعنوانی ـــــ بڑھتی ہوئی ریڈ ٹیپ ـــــ بڑھتی ہوئی فرض ناشناسی ـــــ بڑھتی ہوئی

غیر ذمہ داری — بڑھتی ہوئی بے راہ روی — بڑھتی ہوئی پست اخلاقی — بڑھتی ہوئی کام چوری — بڑھتی ہوئی افسر شاہی — بڑھتی ہوئی نوکر شاہی — بڑھتی ہوئی شالہ جمعداری — بڑھتی ہوئی ہیرا پھیری — بڑھتی ہوئی گھپلے بازی — بڑھتی ہوئی سفارش سازی — بڑھتی ہوئی چور بازاری — بڑھتی ہوئی جعلسازی — بڑھتی ہوئی گراں بازاری — بڑھتی ہوئی ہوس تازی — بڑھتی ہوئی ملمع سازی — بڑھتی ہوئی آدم آزاری — بڑھتی ہوئی ملاوٹ بازی — بڑھتی ہوئی حاجت قاضی — بڑھتی ہوئی روش تازی — بڑھتی ہوئی زُلف ایازی — بڑھتی ہوئی قلت غازی — بڑھتی ہوئی رسم شیرازی — بڑھتی ہوئی عادت دست درازی — بڑھتی ہوئی فیشن نوازی — بڑھتی ہوئی سیاست طرازی — بڑھتی ہوئی افترا پردازی — بڑھتی ہوئی ناز اندازی — وغیرہ وغیرہ وغیرہم — میں کچھ کمی ہوجائے گی — ؟ یا پھر اِن ساری بُرائیوں اور بدعتوں میں بھی اِضافہ ہی ہوجائیگا ؟

چھُٹنے بوزان چھُٹنے بیتہِ روزانی

ماہِ صیام — اب گزر رہا ہے، یعنی کہ جارہا ہے، رخصت ہورہا ہے، الوداع ہورہا ہے — اور اپنے بابا لوگ جنہوں نے روزے رکھے اور اس کا احترام کیا اور جنہوں نے نہ روزے رکھے اور نہ اس کا احترام ہی کیا سب عید منانے کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں — زیادہ بے تاب وہ ہو رہے ہیں جنہوں نے عید الفطر پر صدقات اور خیرات کی اُمّید پر ماہِ صیام گزارا — جو اِس مہینہ وقت افطار اپنے گھر میں حاضر رہنے کے لئے مجبور تھے — جو عید الفطر کی خوشی میں آج کل زیادہ سے زیادہ

قیمتیں وصول کر رہے ہیں ـــــ جو دودھ میں پانی ملا کر خُوب
کماتے بھی رہے اور روزے سے بھی رہے، جو دونوں ہاتھوں مالِ حرام
بھی سمیٹتے رہے اور روزے سے بھی ڈٹ کر دُور رہے ـــــ اور آپ جب
اُن سے ماہِ صیام کا ذکر کریں گے تو وہ بڑی ڈھٹائی سے کہیں گے کہ ماہِ
مُبارک خیر و برکت کا مہینہ تھا، جو رخصت ہو رہا ہے اور جس کا اُنہیں
بڑا افسوس ہے۔ اور یہ سب بناوٹ ہو گی اور اپنے یہاں بناوٹ
بڑا متاثر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ یہاں صرف بناوٹ کے اصول خُوب
چلتے ہیں اور کاغذ کے پھول ایسی خوشبو دیتے ہیں کہ ان سے سونگھنے
والوں کا دل و دماغ معطّر ہو جاتا ہے ؏

اکبر حیدری

سرشار و اودھ پنچ

غالب کے انتقال کے آٹھ سال کے بعد لکھنؤ میں اودھ پنچ اخبار پہلی مرتبہ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا اور اسی سال پنچ نے زبان اور ظرافت کے چہرے پر سے نقاب اٹھائی یہ اخبار اردو ظرافت کا سرچشمہ تھا اور اس کے فاضل ایڈیٹر منشی سید سجاد حسین تھے۔ جنہوں نے اپنی طرز نگارش اور متنوع مضامین کی شگوفہ کاری سے اودھ پنچ کو گلدستۂ ظرافت کا ایک بیش بہا نمونہ اردو زبان میں پیش کیا۔ منشی صاحب اس اخبار کے نامہ نگاروں میں باغ و بہار آدمی تھے اور انہوں نے تقریباً چالیس برس تک مدیر اعلٰے کی حیثیت سے اردو ادب کی نمایاں خدمت انجام دی۔ ان کے دو ادبی شاہکار حاجی بغلول اور احمق کلائی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ پنچ دیگر اخباروں کی طرح تجارتی اخبار نہیں تھا۔ اس نے مغربی اصولوں کی بنا پر اردو صحافت میں اپنا علیحدہ رنگ جمایا تھا۔ اس نے اپنی اشاعتوں میں کانگریس کے نام کو آسمان تک پہنچایا، اور اس کے لئے جہاں تک اس کی آواز جاتی تھی۔ اچھے خاصے معرکے سر کئے۔ یہ سوشل اصلاح کے معاملے میں قدامت پسند تھا اور اس نے مغربی تمدن اور طرز معاشرت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ منشی سجاد حسین کے تمام رفقاء کار کانگریس

کے زبردست حامی تھے اور اودھ پنچ دل و جان اور پورے تن توش کے ساتھ دم نزع تک سرسید احمد خان کی اصلاحی تحریک کی مخالفت کرتا رہا۔

اودھ پنچ کے نامہ نگاروں میں منشی سجاد حسین کے علاوہ سرشار۔ ہجر۔ برق۔ ستم ظریف۔ احمد علی شوق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ نواب سید محمد آزاد اور اکبر الہ آبادی انمول موتی تھے۔ اودھ پنچ کے حملوں سے کوئی نہیں بچ سکا۔ دوست اور دشمن اس کے تیر مذمت کے شکار ہو گئے ہیں۔

اس اخبار نے سرشار۔ حالی۔ داغ اور شرر کے کارناموں کی دھجیاں اُڑائیں۔ ان پر پھبتیاں کسیں اور بعض دفعہ یہ ظرافت بھکڑ پن اور ابتذال تک پہنچ گئی۔ پنچ نے ان برگزیدہ ادبی ہستیوں پر ظرافت میں بجھے ہوئے زہر آلود تیر تن تن کے برسائے۔ عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی۔ اور دُور دور مشہور ہو جاتی تھی۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخی، طرز طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر، جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے۔ اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا منہ غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں، اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اودھ پنچ کے اہل قلم ایک نئے اسلوب کے بانی ہیں۔ جو جدید نثر نگاری کا پیش خیمہ ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں زہرناکی اور طنزیہ نشتریت ہوتی ہے۔ کچھ خوشگوار شوخیاں اُچٹتی ہوئی ضربیں حریفانہ چشمک اور خاصا سیاسی شعور ملتا ہے۔ اودھ پنچ میں اکبر الہ آبادی کا ایک رنگ خاص ہے۔ وہ مشرقیت کے دلدادہ اور

مولویت سے بےزار ہیں۔ انہیں اُردو میں انگریزی طنز نگار پوپ کی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں کی شاعری میں WIT کا عنصر غالب آگیا ہے۔ دونوں کے یہاں چست فقرے اور تیر بہدف جملوں کی بہتات ہے۔ اکبر نے طنز و ظرافت کے پردے میں مغربی تعلیم اور طرز معاشرت پر کڑی تنقید کی ہے۔ وہ شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند لیڈی پر ترجیح دیتے ہیں۔